آگ کے پاس بیٹھی عورت

اقبال مجید

افسانوں میں جو ہوتا ہے وہ ان میں بھی ہے

پھر ان میں جو ہے

وہ دوسروں میں بھی ہونا چاہیے

مگر ہمیشہ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟

☆

AAG KE PAS BAITHI AWRAT
SHORT STORIES
BY IQBAL MAJEED
APRIL 2010

نام کتاب : آگ کے پاس بیٹھی عورت
نام مصنف : اقبال مجید
پتہ : B/132 ہاؤسنگ بورڈ کالونی، کوہِ فضا، بھوپال 462001
موبائل:09893764746
کمپوزر : محمد شاکر ندوی
کمپوزنگ : لاریب کمپیوٹر سینٹر، اسکائی ٹاور، ٹیلی فون اکسچینج کے سامنے، سلطانیہ روڈ بھوپال
مطبع : فائن آفسیٹ پریس اردو بازار، دہلی۔٦
سنِ اشاعت : اپریل ۲۰۱۰ء
قیمت : -/200 روپے

ملنے کے پتے :

☆ ادارہ نیا سفر، 68 مرزا غالب روڈ، الٰہ آباد۔۳
☆ مکتبہ شب خون، رانی منڈی، الٰہ آباد
☆ سہ ماہی ذہنِ جدید C-2 اے بی کامپلکس 179/8 ذاکر نگر، نئی دہلی
☆ B/132 ہاؤسنگ بورڈ کالونی، کوہِ فضا، بھوپال 462001

صفحہ نُما

یادِ بزرگاں و دوستاں

دہلی

۱۱؍جون ۱۹۸۶ء

مکرمی اقبال مجید صاحب السلام علیکم

میں لکھنؤ گیا تھا انجمن کی گولڈن جبلی میں بلا بلاوے کے۔ بلاوا قمر رئیس صاحب نے اتنی دیر کو بھیجا کہ میں لکھنؤ جا چکا تھا۔ انجمن کی اکثریت جو دنیا بھر کے مظلوموں کے غم میں گھلی جاتی ہے وہ اردو کے لئے ذرا بھی ہمدردی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اردو والوں نے بائی کاٹ کر رکھا تھا۔ احتجاج جاری رہنا ضروری ہے۔ سردار جعفری نے طویل عرصے تک اردو کے لئے لیش پال سے لڑائی لڑی تھی۔

آپ کا دہلی آنا ہو تو فون کر کے پوچھ لیجئے گا۔ میں ہوں تو ملاقات ضرور کیجئے۔ میں تو اپنے پرانے ساتھیوں کو بھولتا نہیں ہوں۔

والسلام

حیات اللہ انصاری

قصۂ رنگِ شکستہ

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ پاشا کو Osteoporosis کی بیماری تھی۔ یعنی اس کی ہڈیاں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور بقیہ عمر شاید بستر پر ہی گزرنے کی امید تھی۔ ذرا بھی بے احتیاطی سے اگر وہ گر پڑتا یا چوٹ ہی لگ جاتی تو اس کی متاثرہ ہڈی یا تو ٹوٹ جاتی یا چیخ جاتی۔ پاشا میرا دوست بھی تھا اور پڑوسی بھی۔ لیکن لمبے عرصے سے شہروں شہروں تبادلوں کے سبب مجھ سے دور رہا تھا۔ مگر ریٹائر ہو کر جب وہ اپنے آبائی گھر آ کر بستر پر پڑ رہا تو میری تنہائیوں کا کچھ حصہ اس کے ساتھ ہر شام ہی گزرنے لگا۔ ہوتا یہ کہ میں روز شام کو جیب میں دو سگریٹیں ڈال کر اور گلی پار کر کے پاشا کے گھر پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر میں اندر سے دو پاپڑ اور چائے آ جاتی۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور چائے کے ساتھ سگریٹ پیتے۔ ہم دونوں ہی دن بھر میں تین سگرٹیں پیتے تھے۔ اس لیے شام کی چائے پر ہماری آخری سگریٹ کا مزہ بھی کچھ اور ہوتا۔

جس پرانے نہال پاشا کو میں طالب علمی کے اس زمانے سے جانتا تھا جب وہ ذہانت سے لبریز باتیں کیا کرتا تھا اور جس کی موجودگی سے محفل قہقہہ زار بن جایا کرتی تھی اور جو دوستوں اور دشمنوں کی غیبت کرنے میں مشاق تھا اور چاٹ بازاری جس کی کمزوری تھی اور جو اپنے لباس کی طرف سے خاصا لاپرواہ ہوا کرتا تھا، وہ نہال پاشا تو اپنے پرانے اوصاف کے ساتھ چالیس پینتالیس سال کے وزنی ملبے میں کہیں دب دبا کر کھو چکا تھا اور اس کی جگہ ہڈیاں کھوکھلی کر لینے والا نہال پاشا ایک نئی شخصیت اور نئے اوصاف کے ساتھ میرے سامنے بستر پر پڑا تھا، البتہ اس کے کردار کی پرانی بامروتی اور اخلاص اب بھی ویسا ہی تھا اور تخیل میں پرواز کی حیرت انگیز قوت بھی پہلے جیسی ہی موجود تھی۔

انہیں ملاقاتوں میں پاشا سے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران اس کے جملے بازیوں کی پرانی عادت کی

یاد بھی کبھی کبھی تازہ ہو جایا کرتی۔ ایک دن کسی بات پر لیٹے لیٹے اس نے جملہ کسا۔ ''جس طرح میری ہڈیاں کھوکھلی ہو چکی ہیں اسی طرح ہماری ڈماکریسی کی بھی ہڈیاں کھوکھلی ہو چکی ہیں''۔ ان باتوں سے لگتا تھا کہ اسے اپنی افسوس ناک بیماری کا شدید احساس تھا۔ لیکن ایک دن اس نے ایک عجیب سی بات بتائی۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ بات وہ اپنے ذہن کے پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کے ساتھ کئی بار بہت واضح طور پر دیکھ چکا ہے کہ مرنے پر کس شہر کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا اور بیس پچیس سال بعد ہندوستان چاند پر آدمی بھیج چکا ہوگا تو اس کی قبر کن کن دہشت ناک مرحلوں سے گزر کر پورے قبرستان کے ساتھ ایک پولٹری فارم میں مدغم ہو چکی ہوگی اور پھر اسی زمین پر مویشیوں کا ایک سرکاری اسپتال بنایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کی عجیب وغریب باتیں سُن کر میں اسے پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر یاد آیا کہ پہلے بھی وہ کبھی کبھی ایسی ہی بے سر پیر کی باتیں کر کے بھول جایا کرتا تھا۔

ہم دونوں ہی اب گھریلو ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ہماری روز کی ملاقات کا وقت تو کسی لکھا پڑھی کے بغیر طے ہو ہی چکا تھا اس لیے دن بھر جیسے تیسے گزار کر شام کی چائے پر پاشا کروٹ بدل بدل کر میرا انتظار کرتا۔ ایک دن اسکے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ دروازے کے پردے وغیرہ بھی پہلے جیسے نہ تھے، فضا میں بھینی بھینی خوشبو سی مہک رہی تھی۔ میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روک نہ سکا اور لمبی سانسیں لے کر خوشبو کو پہچاننا چاہا تو وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔

''موگرہ ہے موگرہ۔ فرشنر چھڑکا ہے۔ اب کمرہ کیسا لگ رہا ہے؟''

''اچھا لگ رہا ہے۔ کچھ جاگ سا گیا ہے اور حرکت میں آ گیا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بات ہوئی۔ حرکت میں آ گیا ہے۔ اب میں تھوڑے دنوں بعد یہی کروں گا۔ کمرے کا سامان اِدھر سے اُدھر کرواتا رہوں گا تا کہ کمرے کا حرکت میں رہنے کا احساس قائم رہے''۔ پھر پاشا نے یہ بھید بھی کھولا کہ بہت دنوں سے کمرے کو ایک ہی حالت میں دن رات دیکھتے دیکھتے اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی طرح پورا کمرہ اور کمرے کا سامان بھی صاحب فراش ہو گیا ہے اور دن بہ دن بے حرکت اور جامد ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے خیال

آیا کہ وہ اگر خود کو نہیں تو اپنے کمرے کو تو ہڈیوں کے کھوکھلے پن کی بیماری سے بچا سکتا ہے، وہ اپنے میں نہیں تو کمرے میں ایک خوش آئند رفتار پیدا کر سکتا ہے۔ اس دن پاشا کی طبیعت میں پہلے کی طرح پائی جانے والی دبی دبی بے کیفی مجھے محسوس نہ ہوئی۔ آواز میں تازگی بھی تھی اور جسم کے اعضا زیادہ چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ جب چائے آ گئی اور ہماری سگریٹیں سلگ گئیں تو وہ بے باکی سے میری آنکھوں میں یوں دیکھنے لگا جیسے برسوں پہلے شرارت بھرا کوئی سوال کرنے سے پہلے دیکھا کرتا تھا۔ پھر شریر مسکراہٹ کے ساتھ وہ سوال اس کے ہونٹوں پر تھا۔

''یار زندگی تو کاٹ ہی لائے، اب پار لگنے والے ہو، یہ بتاؤ کبھی کوئی عشق بھی کیا؟''

''عشق۔'' میں چونک پڑا۔

''ہاں عشق۔'' پاشا میری آنکھوں میں سیدھا دیکھتا رہا تو میں نے پوچھا۔

''تم کو آج یہ کیا سوجھی؟''

پاشا کے لیے اس موضوع کو چھیڑنے کا جواز یہ تھا کہ آئے دن روزناموں کی خبروں پر تبصرہ کرتے کرتے، سیاست کو کوستے کوستے، کرپشن کو روتے روتے، ہم اپنی بہت سی شامیں بدمزہ کر چکے ہیں۔ عشق تو ایک ایڈونچر ہے چہک کر بولا۔ ''یار یادوں کی پرانی گلیوں کی بھی ذرا کچھ سیر ہو جائے۔ چائے تو پیتے ہی رہتے ہیں، کچھ روح افزا بھی ہو جائے۔'' اس کی بات سن کر میں چپ رہا۔ شاید یادوں کی گلیوں کی طرف ایک پل کو نظر چلی گئی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر پاشا نے پھر پوچھا۔

''اماں یاروں سے بھی کیا چوری، بتاؤ نا کبھی کوئی عشق ہوا؟'' پاشا کے اصرار پر میں مسکرا دیا پھر ایک لمبی سانس بھری اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں کچلتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

''عشق سے کون ہے بشر خالی''۔

یہ سن کر پاشا اچھل پڑا اور داد دیتے ہوئے دوسرا مصرع پڑھا ''واہ-- کر دیے اس نے گھر کے گھر خالی۔''

اس دن پاشا نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہ طے کیا کہ اگلے دن سے ہم دونوں اپنے اپنے عشق کی داستان بے تکلف ہو کر سنائیں گے اور کسی دوسرے موضوع کو کمرے میں

گھسنے بھی نہ دیں گے۔

گھر واپس آ کر میں پاشا کے بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔ وہ کھلے دل کا مست مولا انسان تھا۔ یاروں کو چٹکیوں میں اڑانے والا۔ مگر گہرا ہمدرد بھی یہاں تک کہ ضرورت مند دوست کو جاڑوں میں ٹھٹھرتے دیکھ کر بدن سے نئی سرج کی شیروانی اُتار کر دینے والا من موجی۔ دوستوں کے ساتھ بناری چاٹ والے ٹھیلے پر کھڑے ہو کر ساتھیوں کو اتنی چاٹ کھلانے والا کہ ادھار چڑھ جائے۔ وہ جوانی میں دوستوں کے لیے سر سے پیر تک روح افزا کی بوتل تھا اور یہ بھی کہ چھلاوے کی طرح کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ یونیورسٹی میں طلبا کے احتجاجی جلسے جلوسوں میں سب سے آگے آگے اور پولیس کے ٹیئر گیس شیل (Shell) دھواں چھوڑتی حالت میں ناک پر رومال رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اسے اُٹھا کر پولیس کی جانب واپس پھینکنے والا جیالا۔ ایسی گہما گہمی والی پھرتیلی اور پارہ صفت جوانی گزارنے والا یوں اپاہجوں جیسی زندگی لمبے دنوں سے بستر پر کیسے گزار رہا ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھ پر اداسی سی طاری ہوگئی۔ سوچا میری سرگزشت میں جو رومانی واقعات رہے ہیں انہیں نکالوں اور جہاں تک ممکن ہو اور یادداشت ساتھ دے انہیں ایمانداری کے ساتھ پاشا سے بیان کردوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ واقعات کسی حد تک اس کا جی تو بہلا ہی سکیں گے۔ اس کی کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کیسی افسوسناک بات تھی کہ اس کا زمین پر گر پڑنا تو کجا محض ذرا سی چوٹ سے بھی اس کی چوٹ کھائی ہڈی میں فریکچر ہو جایا کرتا تھا۔ دوسری بار غسل خانے میں گر پڑنے نے اس کو لمبے عرصے کے لیے بستر پر ڈال دیا تھا۔

دوسرے دن شام کی چائے کے لیے میں پاشا کے کمرے میں پہنچا تو وہ بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنے بیان کی ابتداء پہلے ہی راستے میں سوچ لی تھی۔ کسی خاص تمہید کی ضرورت بھی نہ تھی پھر بھی سب سے پہلے میں نے پاشا پر اس عشق کی کیفیت کو واضح کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ وہ ''دیوانہ وار عشق'' میری زندگی میں بالکل غیر متوقع کسی اَن دیکھے راستے سے بس تھوڑے ہی عرصے کی مسافت طے کر کے غیر پُر شور مگر غیر مشکوک آہٹوں کے ساتھ کچھ ایسی سرعت سے میرے ہوش و حواس پر چھا گیا کہ پھر مجھے کچھ بھی سوچنے

کی تاب نہ رہی۔ میں نے پاشا کو اپنی محبوبہ کی ضروری تفصیلات سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ کوئی کنواری لڑکی نہ تھی، وہ معمولی شکل وصورت والی سانولے سلونے رنگ کی ایک ستائیس سالہ یا اسی کے آس پاس کی ایک تندرست عورت تھی۔ جس کے دو کم سن بچے تھے۔ غالباً بڑے بچے کی عمر اس وقت چھ سال کی رہی ہوگی۔ یہ ضرور تھا کہ دو بچوں کی ماں ہو کر بھی اس کا جسم متناسب، سڈول اور غیر معمولی جنسی کشش رکھتا تھا۔ میں نے پاشا کو جب یہ بتایا کہ وہ عشق نہ تو رومانی تھا اور نہ افلاطونی بلکہ انتہائی لذت آگیں، جنس زدہ اور مادّی تھا اور جس نے تھوڑے ہی دنوں میں ہماری شریانوں کے بہتے خون میں کچھ ایسی جان لیوا آگ دھکائی کہ جس کا بجھانا وصل کی بارشوں کے مسلسل چھینٹوں کے علاوہ اور کسی طرح ممکن نہ تھا تو یہ سن کر پاشا کی باچھیں کھل گئیں اور آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ اچھل کر بولا۔

''واہ مزا آگیا۔۔۔سناؤ یار۔''

میں نے پاشا کو گوش گزار کر دیا کہ اس خاتون کا اصلی نام تو مخفی رہے گا البتہ تخاطب کے لیے اس کو 'تمنا' کے فرضی نام سے پکارا جائے گا۔ تاکہ اس کے مذہب کا بھی پتہ نہ چل سکے۔ پھر غیر ضروری تفصیلات میں جانے کے بجائے میں نے پاشا کو بتایا کہ تمنا نے کم سنی میں محبت کی شادی کی تھی۔ شوہر متوسط طبقہ کا پڑھا لکھا کام چلاؤ آمدنی کا نوجوان تھا۔ جو درونِ خانہ اپنی مے کشی کے شغل میں اکثر بیوی کو بھی اس کی مرضی کے خلاف شامل کر لیا کرتا تھا۔ پھر وہ تو ابکائیاں لیتی رہتی اور شوہر بے سُدھ ہو کر سو جایا کرتا۔ اُس جوڑے سے میری ملاقات کیونکر ہوئی اور میں اس کے گھر مع بیوی بچوں کے کیونکر آنے جانے لگا اور ہماری بے تکلفی کیسے بڑھی ان باتوں میں جانے کی نہ تو ضرورت تھی اور نہ پاشا کو ہی ان سے دلچسپی تھی۔ وہ تمنا کے بارے میں تو زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کو بتایا کہ تمنا پڑھی لکھی، گھر گرہست اور مضبوط ارادوں کی ایک خوش اخلاق اور ملنسار عورت تھی اور جو اپنے بچوں اور شوہر سے محبت کرتی تھی اور جس کے اخلاق نے جلد ہی میری بیوی کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔

جیسے جیسے ہماری قربتیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے تمنا کے ہاؤ بھاؤ میں، اُٹھنے بیٹھنے میں، نظر بھر کر دیکھنے اور خاطر مدارات میں ایک عجیب سی دلنواز تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے پہلے

سے زیادہ ایک رچاؤ، لگاؤ اور اپنائیت کے ساتھ ایک شرمائی اور جھینپی سی اور ایک چھپی چھپی سی آرزومندی کے ساتھ چہرے پر نئے نویلے رنگوں اور تمتماہٹوں کی جھلاہٹوں کو لیکر ایسی نظروں سے دیکھتی جو مجھے ایک بے خودی میں شرابور کر دیتی۔ اس کے سموچے بدن کے سراپے میں اور ایک ایک اعضا کے غنائی لوچ میں ایک ایسی مترنم جنبش کی دل آویز موسیقی کا مجھے ادراک ہوتا جس کی بے آواز گنگناہٹیں کانوں سے گزر کر احساس تک ہی نہیں پہنچتیں بلکہ جسم میں متحرک پورے لہو میں شرارے بن کر بہنے لگتی ہیں اور سانسوں کو بے قابو کر دیتی ہیں پھر پیر کہیں رکھو تو پڑتا کہیں تھا، بات کچھ کہو تو نکلتی کچھ تھی''۔

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاشا پر جیسے وجد سا طاری ہو گیا۔ وہ مسہری کے سرہانے تکیہ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے زانوؤں پر گاؤ تکیہ رکھ کر وفور جذبات میں یہ بھول کر کہ اس کی ہڈیاں کمزور ہیں ایک ہاتھ سے تکیے کو پیٹتے ہوئے چلایا۔

''ہائے ظالم تو نے میرے دل کے خاموش تاروں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ چھاتی میں آر ڈی ایکس (RDX) کا دھماکا کر دیا۔''

میں نے کسی ردعمل کے بغیر بات جاری رکھی۔

''ہم لوگ گھر پر ہی روزانہ ملتے تھے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہماری مشغولیات ہی کچھ ایسی تھیں کہ ہمیں روزانہ ہی ملنا پڑتا تھا۔ تمنا کو میرے آنے کے اوقات معلوم تھے۔ اس وقت اس کی سج دھج ہی بدل جایا کرتی تھی۔ اس کے گھنیرے بالوں میں ایسی بلا کی کشش تھی کہ جب وہ نہا کر اور سکھا کر انہیں یونہی کھلا چھوڑ دیتی تو انہیں دونوں ہاتھوں میں بھر لینے کو جی چاہتا۔ کبھی وہ میرے اتنے قریب سے گزرتی اور ایسے زاویے سے گزرتی کہ اس کا کندھا اس کے ان کھلے بالوں کی چند لٹوں کے ساتھ مجھے چھوتا ہوا سرک جاتا۔ مجھے احساس ہوتا کہ ان لٹوں کے لمس اور رخساروں کے کاسمیٹک کی خوشبو میں بلا کے اشارے روپوش ہیں۔ ایسی کیفیت میں اس کا شوہر اس کو گھورتا اور سخت لہجے میں ٹوکتا۔

''یہ تم کیسی خوشبو کی کریم استعمال کرنے لگی ہو۔'' جواب میں وہ ڈھیٹ بن کر کہتی:

''اچھی ہے نا--؟''

وہ جب بھی تمنا کو میرے آس پاس یا مجھ سے باتیں کرتا دیکھتا تو ہمیشہ کنکھیوں سے اس پر نظر رکھتا۔ تمنا جب فراخ دلی سے اپنی مسکراہٹوں کی پھواریں مجھ پر اکثر بلا وجہ برساتی تو شوہر سے نہ رہا جاتا، اندرونی احساسات چہرے پر نمایاں ہو جاتے ماتھے پر بل پڑ جاتے، آنکھیں نکال کر بیوی کو ٹوکتا۔

''آخر بات بے بات اب تمہیں اتنی ہنسی کیوں آنے لگی ہے۔'' ایک بار جب شوہر نے اس طرح کچھ زیادہ تُرش لہجے میں تمنا کو ٹوکا تو وہ بھی تیوریاں چڑھا کر بپھر اُٹھی۔

''تو کیا ہوا، ہنسنے کا بھی تم سے لائسنس لینا پڑے گا کیا؟''

جب میں نے اپنی رومانی داستان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دیوار گھڑی کو دیکھا تو لگا کہ ہماری بیٹھک خاصی لمبی ہو گئی تھی لیکن پاشا بچوں کی طرح منھ کھولے پورے انہماک سے ہمہ تن گوش تھا، میں نے اس قصے کو وہیں روک دیا اور باقی اگلے روز بیان کرنے کا وعدہ کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پاشا کو جھٹکا سا لگا۔ اس کا منھ اُتر گیا، دھیرے سے بولا۔

''یار گھر پر بھی کیا کرو گے، ابھی بیٹھو۔'' میں نے بتایا کہ میری نواسی کے امتحان ہو رہے ہیں، کتابوں کے ساتھ اسے لے کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ تو وہ چپ ہو گیا۔ دوسرے دن سویرے ہی سویرے پاشا کا فون آیا کہ اسے دن بھر بے چینی سے میرا انتظار رہے گا۔ شام روز مرہ کے مطابق جب میں اس کے کمرے پر پہنچا تو اس نے پلنگ سے اتر کر میرا استقبال کیا اور گرم جوشی سے گلے لگا کر بستر کے پاس رکھی کرسی پر بٹھایا اور بے صبری کے ساتھ بولا۔

''ہاں یار شوہر نے بیوی سے پوچھا کہ بات بات پر اسے ہنسی کیوں آنے لگی ہے اور بیوی نے جواب دیا تھا کہ کیا ہنسنے کا بھی لائسنس لینا پڑتا ہے۔'' پھر وہ سنبھل کر احتیاط سے بستر پر ایسے بیٹھا جیسے شیشے کا بنا ہو۔ میں واقعات کا سرا جوڑنے کے لیے اپنے خیالات کو مجتمع کرنے لگا تو اس وقفے کو اس نے ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اپنی دلی کیفیت کا بچوں کی طرح بے لاگ اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارے اس واقعے نے تو میرا بلڈ پریشر بڑھا دیا۔ رات دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، مشکلوں سے دن کاٹا ہے، خدا جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اب دیر نہ کرو، جلدی شروع کرو۔''

بے قراری میں لپٹی پاشا کی ابتلا کی وہ کیفیت مجھے اچھی لگی۔ پھر میں نے آگے کے واقعات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے پاشا کو بتایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے تمنا خاصی دیدہ دلیر ہوگئی تھی۔ وہ کسی نئے حوصلے سے لبریز تھی۔ یہ تو صاف ہوگیا تھا کہ تمنا کو ایک ایک پل میرا انتظار رہا کرتا تھا۔ مجھے قریب پاتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک نشہ سا چڑھ جاتا۔ تمنا کی یہ کیفیت آس پاس رہنے والے اس کے شوہر سے کتنی چھپی رہ سکتی تھی۔ میرے دل میں ایک خوف بار بار سر اُٹھاتا تھا اور مجھے پریشان کر دیتا تھا۔ ایک دن چھوٹے سے کاغذ پر میں نے لکھا ''کیا مجھے اپنے دوست کو دھوکا دینا چاہیے؟'' سوچا موقع پا کر تمنا کو وہ کاغذ پکڑا دوں گا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی اندر ہی اندر اپنی ہڈیوں تک میں اس خاموش آگ کی لپٹوں میں گھر گیا تھا جو تمنا کے جسم میں میرے لیے بھڑک رہی تھیں۔ کیسے بے چین کرنے والے تھے وہ دن جب ایک ایک کر کے کوئی نہ کوئی واقعہ تمنا اور اس کے شوہر کے درمیان تلخیوں اور نفرتوں کا خاموش بیان کرنے لگا تھا۔

ایک طرف تو میاں اور بیوی کے درمیان گہرے شکوک اور بے اعتمادی کا وہ دم گھٹا دینے والا، سلگتا ہوا گاڑھا دھواں جس کی لکڑیاں ابھی کچھ گیلی تھیں، شعلہ بن کر بھڑک اُٹھنے کو بے قرار تھا تو دوسری جانب میرا یہ حال تھا کہ تمنا کو تنہائی میں دیکھ کر اس کے بدن کی گرماہٹوں کو اپنے بے قرار ہونٹوں کے حوالے سے محسوس کر کے اور اس کی لذت میں تا دیر بے خود ہو کر جی لینے کی تڑپ نے میری سدھ بدھ کھو رکھی تھی۔ بس انہی دنوں ایک بار تمنا اکیلی میرے گھر آئی۔ میری بیوی بچوں کو لے کر کسی عزیز کی شادی میں شہر سے باہر گئی ہوئی تھی۔ اس دن پہلی بار میرے ہونٹوں نے اسے چوما۔ مجھے دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کہ اس نے بڑی گرم جوشی سے میری پیش قدمی کو لبیک کہا۔ اس دن تمنا نے مجھے بتایا کہ اب اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ بٹھا کر زبردستی شراب نہیں پلاتا۔ اسی دن تمنا نے اس راز سے بھی پردہ اُٹھایا کہ پچھلے ڈیڑھ سال سے پڑوس کی ایک خوبصورت کم سن اور گوری چٹی لڑکی سے اس کے شوہر کی تاک جھانک اور پرچے بازی چل رہی تھی اور اب چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہو رہی ہیں اور ایسی خبریں بھی مل رہی ہیں کہ شوہر نے تمنا کو ڈائیورس دینے کا پورا انتظام بھی کر لیا ہے اور اب وہ نشے کی حالت میں دوسرے تیسرے دن تمنا

کو یہ کہہ کر مارتا پیٹتا ہے کہ کسی کی بیوی ہوتے ہوئے بھی دسرے مردوں پر للچائی نظروں سے دیکھنے کی لت کے سبب وہ تمنّا سے عاجز آچکا ہے۔ اسی ملاقات پر تمنّا نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ اس نے چہرے پر مضبوط ارادے کی رمق پیدا کر کے مجھ سے کہا کہ اُس نے اُس وقت سے بھی پہلے جب میرا اس سے تعارف بھی نہ ہوا تھا خود کو شوہر کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہر انجام کے لیے تیار کر لیا ہے کیونکہ وہ عورت ہی کیا جو اپنے شوہر کے قدموں کی چاپ سے اُٹھنے والی خوشبو کو اس فرق کے ساتھ پہچان نہ لے کہ وہ بیلا ہے یا گلاب۔ پھر وہ قدرے کمزور آواز میں بولی تھی، ''میں خوبصورت نہیں ہوں۔ لیکن مجھ میں مرد کو متوجہ کرنے کی کشش ضرور ہے۔ فرسٹ کلاس کامرس گریجویٹ ہوں۔ ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ میں سیکڑوں سے اچھی مہارت رکھتی ہوں۔ اپنی پسند کی زندگی جی کر بچوں کو پال لوں گی۔ میری بوڑھی ماں کے پاس اور کچھ نہیں تو سر چھپانے کا ایک خاندانی گھر تو ہے ہی۔ میرا شوہر ایک عورت سے مطمئن نہیں تو میں کیوں ایک مرد پر صبر کروں--- ایسا کبھی مت سوچنا کہ میں تم سے یہ کہوں گی کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو۔ یہ بھی نہیں کہوں گی کہ اپنا گھر برباد کر کے مجھے اپنے ساتھ رکھو۔ لیکن پرانے زمانے کے زمینداروں کی طرح مجھے اپنی رکھیل سمجھ کر ملتے رہا کرنا۔ یہ تمہارے لیے آسان بھی ہوگا کیونکہ میں تم سے اپنے یا اپنے بچوں کے لیے کوئی خرچہ پانی بھی نہیں مانگوں گی۔ ہم دوست بن کر ایک دوسرے سے مطالبے کریں گے۔ میاں بیوی بن کر نہیں۔ ہمارے لیے یہ احساس بہت ہوگا کہ کوئی ہمیں حق جتائے بغیر چاہتا ہے۔ بس اتنا یاد رکھو کہ میں آئندہ بیوی کبھی نہ بنوں گی۔''

پھر میں نے پاشا کو یہ بتایا کہ تمنّا نے اپنے شوہر سے چھٹکارے کے بعد سر بلندی کے ساتھ اپنے کم سن بچوں کو پالنے کی تنہا اور آزاد زندگی گزاری۔ اس کی راتوں اور صبحوں کا حساب لینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کہتی تھی اکیلی عورت کو سماج میں زیادہ مشکل لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ انہیں مشکلوں کے دوران اس نے میری زندگی میں اپنے وصال کے یادگار رنگ بھرے جو مجھے کبھی بھی کہیں سے کسی قیمت پر میسر نہ ہوئے اور نہ میں نے ان کی پھر خواہش ہی کی۔''

میری باتیں سن کر پاشا کے دل و دماغ کی کچھ عجیب کیفیت ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے تمتما گیا تھا وہ بار بار لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ لیکن منھ سے کوئی لفظ نہ نکلا تو میں

نے اسے ٹوکا۔

''اب تمہاری باری ہے، کچھ اپنی سناؤ۔'' پاشا جیسے چونک پڑا، پھر بولا۔

''نہیں آج نہیں۔ تم نے جو کچھ جس طرح بیان کیا ہے اس کے سحر سے نکل جاؤں تو کچھ سوچوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بات دوسرے دن پر ٹال دی۔ لیکن دوسرے دن دوپہر میں پاشا کا فون آیا۔ کچھ دیر وہ میرے بیان کیے واقعات پر جذباتی انداز میں تبصرہ کرتا رہا پھر مجھے ہدایت کی کہ میں شام کو چائے پر نہ آؤں کیونکہ اس کے ڈاکٹر نے اسے معائنے کے لیے بلایا ہے۔ میں نہیں گیا۔ لیکن اس کی اگلی شام جب میں وقت مقررہ پر پہنچا تو پتا لگا کہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا اور پاشا گھر پر ہی تھا۔ جب میں نے شکایت کی کہ اس نے فون کر کے مجھے بلا کیوں نہ لیا تو اس نے جھینپ کر بتایا کہ اپنے رومان کی کہانی بیان کرنے کی ہمت اس میں نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ گول ہو گیا۔ اس دن بھی وہ اس ذکر کو چھیڑنے سے کترا رہا تھا۔ یہ دیکھ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ وعدہ کر کے پیچھے ہٹ جانا چاہتا ہے تو میں بھی آگے کے واقعات نہیں بیان کروں گا۔ اس دھمکی پر پاشا مجھ سے ایک دن کی مہلت مانگ کر راضی ہو گیا اور دوسرے دن اپنے عشق کی سرگزشت کا آغاز یوں کیا۔

''دیکھو میں تمہاری طرح اچھا قصہ گو تو ہوں نہیں، پھر میرے بیان میں کوئی ربط بھی نہ ملے گا، لفظوں کی استادی وغیرہ بھی نہ ہوگی۔ بس کھڑا گدا فرخ آبادی ہوگا۔ شاید کچھ چلتی پھرتی تصویریں ہوں گی۔ تم اس طرح سے سوچو کہ میری محبوب بھی شادی شدہ تھی۔ ہم نے پہلی بار دوسرے شہر کے ہوٹل کے کمرے میں رات بسر کرنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ ہم اپنے ارمان نکال سکیں۔ طے ہوا کہ ہم دونوں اپنے اپنے ٹھکانوں سے چل کر صبح چھ بجے بس اسٹینڈ سے پہلی بس پکڑیں گے۔ اب یوں سمجھو کہ میری محبوب صبح بس اسٹیشن آنے کے لیے رات اپنے گھر میں کسی مصلحت کے سبب نہیں گزارتی۔ وہ شب وہ ایک ہاسٹل میں اپنی سہیلی کے ساتھ گزارتی ہے۔ پھر صبح پانچ بجے ہاسٹل میں سب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں میری محبوبہ اپنی سہیلی کو بتائے بغیر کمرے سے نکل پڑتی ہے۔ ہاسٹل کے صدر پھاٹک پر اسے چوکیدار کا تالا لگا ملتا ہے۔ وہ سات فٹ اونچے لوہے کے پھاٹک پر چڑھتی ہے اور بلموں جیسی نوک دار سلاخوں کو پھاندنے

کی کوشش میں ہوتی ہے کہ اس کی ساڑی ایک سلاخ میں پھنس جاتی ہے کہ سلاخ کی نوک پنڈلی میں دو انچ لمبا زخم کر دیتی ہے۔ وہ اس زخم سے بہتے خون کے ساتھ بس میں میرے ہمراہ سفر کرتی ہے۔ راستے میں ایک آراستہ ڈھابے سے فرسٹ ایڈ کا سامان مہیا کرا کے میں زخم کی مرہم پٹی کرتا ہوں اور منزل پر پہنچ کر اے ٹی ایس کا انجکشن لگواتا ہوں۔ جس ہوٹل میں ہم ٹھہرتے ہیں وہ کوئی اچھا ہوٹل نہیں۔ اگر تم پہلی بار کسی نامحرم عورت کو لیکر کسی شہر میں گئے ہو گے اور ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے ٹھہرے ہو گے تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ تمہارے دل میں کیسے کیسے وسوسے رہے ہوں گے اور تمہاری دلی کیفیت کیا رہی ہوگی۔ میں محبوبہ کے ساتھ بس سے اترتا ہوں تو یہ دھڑکا شروع ہو جاتا ہے کہ ہمارا کوئی شناسا ہمیں نہ دیکھ لے۔ مجھے جلد از جلد ہجوم کی نگاہوں سے بچ کر کسی عمارت میں خود کو قید کر لینے کی خواہش تیز ہو جاتی ہے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو کر ہم دونوں سکون کی سانس لیتے ہیں۔ تنہائی اور تحفظ ملتے ہی محبوبہ کے ساتھ بستر پر بوس و کنار میں کھو جانا چاہتا ہوں۔ یہ یاد رکھنا کہ ایسی تنہائی میں ہمارا پہلا ملاپ تھا۔ لیکن جو اس سے بھی زیادہ سچی بات ہے وہ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ بس اسٹینڈ سے باہر نکلتے ہی خدا جانے کیوں میں بار بار سڑک پر اپنی پیٹھ کے پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھ لیتا، سبب تو نہیں جانتا لیکن بار بار ایسا لگتا تھا کہ کوئی شاید ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ ہم سے کچھ قدم دور ہمارے پیچھے چل رہا ہے۔ بستر پر پہنچ کر کافی راحت محسوس ہوتی ہے۔ محبوبہ کے رخساروں کو چوم کر آتش شوق بھی بھڑکتی ہے لیکن اسی وقت وہ میری آغوش سے یکایک نکل کر الگ بیٹھ جاتی ہے اور کمرے کے دروازے کو کسی شبہ میں غور سے دیکھنے بھی لگتی ہے۔

''دروازہ بند ہے۔'' اتنا کہہ کر میں اسے اپنی جانب کھینچتا ہوں۔

''نہیں'' وہ مجھے روکتی ہے۔'' کوئی ہے۔'' میں بستر سے اُٹھ کر دروازے پر جاتا ہوں۔ اسے کھول کر باہر جھانکتا ہوں۔ ایک بیرا چائے کی ٹرے لیے راہداری میں فاصلے پر جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میں دروازے کو بند کر کے دروازے کے پٹ کو اوپر سے نیچے نظروں سے ٹٹول کر اس کا معائنہ کرتا ہوں۔ پٹ میں ایک جگہ لکڑی میں ہلکی سی جھری دکھائی دیتی ہے۔ اندازہ کرتا ہوں کہ دروازے پر پڑے پردے سے دروازے کو پوری طرح ڈھک لینے میں

خاصا تکلف ہو رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر ہوٹل کے منیجر کے پاس جاتا ہوں۔ منیجر کے چہرے کے داہنی طرف ایک گہرے مگر پرانے زخم کا پُراسرار نشان مجھے نظر آتا ہے۔ میں اسے اپنا کمرہ بدل کر کوئی دوسرا کمرہ دینے کی درخواست کرتا ہوں وہ میری درخواست یہ کہہ کر ٹھکرا دیتا ہے کہ سردست کوئی کمرہ خالی نہیں۔ میں کمرے میں واپس آتا ہوں۔ دروازہ بند کر کے پردے کے دونوں سروں کو آپس میں سیفٹی پن سے جوڑ کر دروازے کی جھری کو ڈھکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آخر کو سوچنے لگتا ہوں کہ وصال کی جن لذتوں کے تصور کے ساتھ میں گھر سے چلا تھا وہ تصور دروازے کے پیچھے کسی کے ہونے اور لکڑی کی جھری میں آنکھ لگائے ہونے کے کبھی گمان اور یقین کے شبہ کے منحوس کانٹے کی مسلسل کھٹک کے ہاتھوں غارت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ہوٹل کے کمرے میں ایک شرمناک شغل کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا خوف سر پر ہتھوڑے سے چلانے لگا تھا۔ میں اس غیر معمولی خوف سے چھٹکارہ پانے کے لیے شب خوابی کا سبز بلب بھی بجھا دیتا ہوں۔ پھر بھی کمرے میں اندھیرا نہیں ہوتا۔ ہوٹل کی دیوار سے لگے سڑک کے لیمپ پوسٹ کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر اندر آ کر اس کا اندھیرا چھین لیتی ہے۔ وہ روشنی باہر دروازے کی جھری پر آنکھ لگائے انسان کو اندر سب کچھ دیکھ لینے کے لئے کافی نظر آتی ہے۔ میری محبوبہ ایک بے نام ذہنی تھکن میں چور بستر پر لیٹی رہتی ہے اور میں کمرے کے فرش پر ٹہلتا ہوں۔ کچھ دیر یکایک سڑک کی بجلی چلی جاتی ہے اور کمرے میں گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ میں اس اندھیرے میں بستر پر آ جاتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ دروازے کی جھری سے اندر جھانکنے والے کو اب کمرے میں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ میں پیروں کے پاس پڑے کمبل سے خود کو اور محبوب کو چھپا لیتا ہوں۔ محبوبہ کی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کرتا ہوں۔ اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوں۔ آنکھوں کو بوسہ دیتا ہوں۔ پھر توقع کرتا ہوں کہ اس کی جانب سے کسی ترغیب کا اشارہ آئے گا۔ میں اس کے شوقِ بیتاب سے لبریز کسی لمس کا انتظار کرتا ہوں۔ کسی دعوت دینے والی تحریک کا انتظار کرتا ہوں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ میرے کان میں کہتی ہے۔

"بہت اندھیرا ہے۔ میں آپ کو دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔"

''محسوس تو کر رہی ہو''۔ میں پیار سے جواب دیتا ہوں۔ وہ کچھ نہیں بولتی۔ پھر میں اُس سہمے سے اندھیرے اور سناٹے میں اس لمحے کا انتظار کرتا ہوں جو مرد کو بے سُدھ کر کے پیش قدمی کے لیے بے قرار کر دیا کرتا ہے۔ لیکن دس منٹ گزر جاتے ہیں وہ لمحہ نہیں آتا۔ آدھا گھنٹہ گزر جاتا ہے وہ لمحہ آنے کے بجائے کہیں دُبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں خود کو کوسنا چاہتا ہوں مگر الفاظ نہیں ملتے ہیں۔ محبوبہ کو پھر بانہوں میں بھر لیتا ہوں لیکن وہ گھڑی جس کے نہ آنے پر مجھے پسینے چھوٹنے لگتے ہیں وہ تو جیسے پسپا ہو کر نڈھال سی کمرے کے دروازے کے پیچھے کھڑی دروازے کی جھری میں آنکھ لگائے، اندھیرے کمرے کو قہر آلود نظروں سے گھورے چلی جاتی ہے۔ اسی وقت میری محبوبہ خود کو میری بانہوں سے آزاد کرتی ہے۔ دیوار پر لگے بجلی کے بٹن کو دبا کر کمرے کو روشن کرتی ہے۔ آج مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کتنی بار بستر سے اُٹھ کر روشنی بجھائی اور اس نے کتنی بار روشنی جلائی۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ روشنی اور اندھیرے کی اس تکرار کے درمیان ہی پاس کی کسی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی تھی۔ ہم دونوں کو اب ہر حال میں گھر کے لیے واپس ہو جانا تھا۔

اسی وقت ملازم چائے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ میں دم بہ خود ایک سکتے کے عالم میں پاشا کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ سینے کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں۔ اتنی تیز کہ مجھے شک ہوا کہ اس کی آوازیں پاشا کے کانوں میں بھی جا رہی ہوں گی۔ میں ایک ایسے استعجاب میں مبتلا تھا کہ جس کا تجربہ مجھے زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ پاشا گفتگو ختم کر کے مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا اور میں بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں خود بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے آنکھیں ملائے اور میرے اندرونی جذبات کو پڑھ لے۔ دراصل میں حیرت کی تصویر اس لیے نہیں تھا کہ پاشا کا وہ بیان انسانی قیاس میں نہ آنے والا کوئی عجیب و غریب واقعہ تھا بلکہ میری حیرت کا سبب تو کچھ اور ہی تھا۔ میری نظر میں پاشا میرا بے غرض اور معصوم صفت دوست تھا۔ جیسے جیسے وہ اس واقعے کو بیان کرتا جا رہا تھا میں نہیں کہہ سکتا میرے اندر کیسی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دو بار تو میں نے ارادہ کیا کہ پاشا کو روک دوں لیکن میں نے کیسے صبر کیا میں ہی جانتا ہوں لیکن چائے پینے کے دوران میرے صبر کا پیمانہ چھوٹ گیا۔ میں نے اس سے آنکھیں

ملائے بغیر جاننا چاہا۔

''تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری محبوبہ کی پنڈلی زخمی ہوگئی تھی، ہاسٹل کا پھاٹک پھلانگتے ہوئے۔''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا وہ داہنے پیر کی پنڈلی تھی یا بائیں پیر کی، کچھ یاد ہے تم کو۔''

''نہیں اب یہ تو یاد نہیں۔'' اس کے بعد پاشا دوسری باتیں کرنے لگا۔ لیکن پاشا سے پوچھنے کے لیے ایک سوال بار بار میرے ہونٹوں پر آکر لوٹ رہا تھا۔ وہ سوال پوچھنے پر پاشا کا کیا ردِ عمل ہوگا میں اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ یہ سوچے کہ میں اس کے بیان پر شک کر رہا ہوں۔ دراصل جس پاشا کو میں جانتا تھا وہ ایک صاف شفاف آئینہ تھا، جو دل پر وہی زبان پر۔ لیکن وہ بات ہی کچھ ایسی ہی تھی کہ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ آخر دبی سی آواز میں میرے منھ سے نکل ہی گیا ''بعض نشان خوب یاد رہ جاتے ہیں، اب دیکھو نا تمہیں منیجر کے چہرے پر زخم کا پرانا نشان کیسا یاد رہ گیا۔ وہ نشان اس کے چہرے کے کس جانب بتایا تھا تم نے۔''

''غالباً داہنی طرف۔۔'' پاشا بولا ''بڑا پُر اسرار نشان تھا وہ۔''

اس کے جواب نے میری الجھن اور بڑھا دی۔ پھر جتنی دیر میں اس کے پاس بیٹھا رہا میری نگاہوں میں ہوٹل کا وہ کمرہ ہی ناچتا رہا۔ کبھی اندھیرا ہو جاتا اور کبھی روشنی۔ پھر آنکھوں کے سامنے وہ دروازہ آکر کھڑا ہو گیا جس پر پردہ پڑا تھا۔ میں اس دروازے کی بناوٹ کو بار بار اپنے تصور کے پردے پر اُبھرتے ڈوبتے اس طرح محسوس کر رہا تھا جیسے آسمان پر چمکتی بجلی میں چیزیں ایک پل کو دکھائی دیتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر میرے تصور میں دروازے کی جھری ابھری، بہت جی چاہا کہ پاشا سے اس جھری کی کیفیت ایک بار پوچھوں لیکن اس خواہش کو میں نے دبا دیا۔ جب میں اس کمرے سے اُٹھا تو قدم وزنی ہو رہے تھے اور کندھے فکرمندی کے بوجھ سے لٹکے ہوئے تھے۔

اس رات کئی بار میری آنکھ کھل گئی۔ بے خوابی کی حالت میں پاشا کے بیان کیے ان واقعات کو ذہن میں دہراتا رہا، مجھے وہ بس یاد آئی جس پر میں صبح صبح تمنا کے ساتھ بیٹھا تھا، پٹرول

پمپ سے لگا ہوا وہ صاف ستھرا ڈھابا یاد آیا جہاں میں نے تمنا کو ناشتہ کرایا تھا اور اس کی پنڈلی کے زخم پر اپنے ہاتھ سے بینڈ ایڈ لگایا تھا۔ پھر وہ ہوٹل، وہ کمرہ، وہ رات، وہ روشنی کے جلنے اور کبھی بجھنے کا عمل میری آنکھوں کے سامنے دوڑ گیا۔ میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ خشک حلق کو سرہانے رکھے پانی کے گلاس سے تر کیا مگر دل بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا۔ آخر میرے اس سفر کی روداد اور ہوٹل کے کمرے میں شب بسری کا ماجرا پاشا تک کیسے پہنچ گیا۔ میرا یہ پورا واقعہ پاشا کو کس نے بتایا جبکہ میرے اور تمنا کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا رازدار نہ تھا۔ یہاں تک کہ ہوٹل کے منیجر کے چہرے پر پرانے زخم کا نشان۔ تو کیا پاشا بھی اپنی محبوبہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور کیا اس کو بھی وہی کمرہ ملا تھا جس کے دروازے میں ایک جھری تھی اور جس کی کھڑکی کی دیوار سے ملحق سڑک پر ایک لیمپ پوسٹ تھا۔ میں جس قدر سوچتا گیا حیرتوں میں ڈوبتا گیا۔ لگاتار سوچتا رہا کہ یہ سب کیسے ممکن تھا، کیا پاشا تمنا کو جانتا تھا۔ کیا تمنا کے میرے علاوہ پاشا کی زندگی میں بھی ایسا ہی کوئی دخل تھا؟ یا کیا پاشا کو تمنا نے یہ واقعہ سنایا تھا۔ وہ بھی اس قدر ذاتی اور نجی واردات کی ایسی تفصیلات کے ساتھ۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں لیکن کمرے کے اندھیرے میں جب میں تمنا کو اپنی آغوش میں لیے تھا تو اس نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی کہ وہ مجھے اندھیرے میں دیکھ نہیں پا رہی۔ اس لیے اس کو لگتا ہے کہ وہ کسی اجنبی مرد کی بانہوں میں لیٹی ہے۔

دوسرے روز میں اس بے قراری میں رہا کہ شام کو جا کر دیکھوں کہ پاشا کی داستان میں آگے کیا نکلتا ہے۔ آخر میں وقت سے تھوڑا پہلے ہی پاشا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کو ٹٹولتا رہا مگر کوئی سراغ نہ پا سکا۔ بات اس نے شروع کی جو اس کی نہیں بلکہ میری ذات سے متعلق تھی۔ فرطِ جذبات سے بولا۔

''تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے میری کھوکھلی ہڈیوں میں کیسی چنگاریاں بھر دی ہیں۔ تمہاری داستان سن کر میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنا چاہتا ہوں۔ تم نے میرے تخیل اور فکر تک کے کھوکھلے پن کو اُس گودے سے بھر دیا ہے جس سے زندگی کی امنگ اور توانائی پہچانی جاتی ہے۔'' پھر پاشا نے اپنا بایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا اس پر تازہ پلاسٹر بندھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ پچھلی رات وہ بستر سے غسل خانے جانے کے لیے کھڑا ہوا تو ڈگمگا گیا۔ کھڑے قد سے

بستر پر ہی لڑھک گیا۔ ہاتھ پلنگ کی پٹی پر ٹکا اس کے تیز جھٹکے سے کلائی کی ہڈی میں بال پڑ گیا۔ اس نے بڑے خلوص سے یہ کہتے ہوئے چائے بنائی کہ ایک دن اس کی ہڈیوں میں چائے سے بھری کیتلی کا بوجھ سنبھالنے کی طاقت نہ رہ جائے گی۔ پھر چائے پیتے ہوئے وہ عجیب انداز سے مسکراتا رہا۔ یہ مسکراہٹ شاید اُس کے اُس خیال کے لیے رہی ہوگی جس سے اس کا ذہن اس وقت گزر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ ایک بے حجابی کے ساتھ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا۔

''انسان بھی کیا عجیب شے ہے۔ کہاں کہاں سے خود کو زندہ رکھنے کی طاقت ڈھونڈ نکالتا ہے۔ تمہاری محبت کی داستان سننے کے دورن میں بستر پر لیٹے لیٹے کتنی دور اور کتنی تیز دوڑتا رہا اور میرا دم بھی نہیں پھولا۔ یہ بات تم نہیں جانتے--- کتنا بڑا احسان کیا ہے تم نے مجھ پر کاش تم جان سکتے۔'' پھر وہ پہلو بدل کر بولا۔

''خیر تم اپنا آگے کا قصہ تو سناؤ۔''

میں پاشا کو کچھ سنانے کی غرض سے تو آیا نہ تھا جس گتھی اور الجھن کو سلجھانے کی غرض سے آیا تھا اس کی سبیل پیدا ہوتے کم سے کم اس وقت مجھے دکھائی نہ دے رہی تھی اس لیے میں کوئی بہانہ کر کے چلا آیا۔

پاشا کے پاس سے آنے کے بعد میں خاندانی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا اور تین چار روز تک پاشا کے یہاں نہ جا سکا مگر پاشا کی اس پُر اسرار کہانی کو بھی بھول نہ سکا۔ میری الجھن بڑھ رہی تھی۔ ایک بار تو مجھے ایسا لگا جیسے پاشا شاید کسی فوق البشر قوت کا مالک ہے۔ اس درمیان پاشا کا فون آیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

''تین دن سے غائب ہو۔ اگلے واقعات نہیں سناؤ گے تو شاید میں خودکشی کر لوں گا۔''

میرے منھ سے نکل گیا۔

لیکن تمہاری بیان کی ہوئی داستان مجھے خودکشی پر مجبور کر رہی ہے۔''

''کیوں---؟'' اس نے بچوں کی طرح حیرت سے پوچھا۔ میں اس 'کیوں' کا کیا جواب دیتا؟ کیا اس سے پوچھتا کہ میری آپ بیتی اسے کیسے معلوم ہوئی۔ معلوم بھی ہوگئی تو اس

نے مجھے کیوں سنائی، کیا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میری اور تمنا کی محبت کی کہانی کا سارا احوال اسے پوری تفصیل کے ساتھ معلوم ہے اور جب میں اسے آگے کی کہانی سناؤں گا تو وہ اس کہانی سے آگے کی کہانی کو اپنی کہانی کہہ کر مجھے سنا دے گا اور میری نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ میں اس کی کیوں کا جواب ٹال گیا لیکن وہ کہاں ماننے والا تھا۔ دوسرے دن اس کا پھر فون آیا، اس کی آواز میں مجھے نقاہت سی محسوس ہوئی۔

''کیسے ہو---؟'' میں نے پوچھا۔

''طبیعت گری گری سی ہے۔ روز شام کو تمہارا انتظار کرتا ہوں، تم آتے نہیں، ناراض ہو گیا۔''

کچھ جھمیلوں میں پھنسا تھا، آؤں گا۔ تمہاری آواز میں کمزوری سی کیوں ہے۔'' میں نے دریافت کیا، جواب میں پاشا فوراً کچھ نہ بولا۔ میں نے پھر سوال کیا۔ مگر پھر جواب نہ ملا۔ میں نے دو ایک بار اونچی آواز میں ہیلو ہیلو کی صدا لگائی تو وہ مدّ ہم آواز میں بولا ''یار آدمی بلبلہ ہے پانی کا، آج آہی جانا۔'' اس کے جواب سے مجھے کچھ تشویش ہوئی اس سے پہلے کہ میں اپنی تشویش کو مٹا پاتا، پاشا نے فون رکھ دیا۔ میں گھبرا گیا۔ شام کو سب کام چھوڑ کر اس سے ملنے گیا۔ دل میں یہ خیال بھی تھا کہ جیسے بھی ہو مجھے پاشا کی بیان کی ہوئی حقیقت معلوم کرنا ہوگی۔ وہ بستر پر دروازے کی طرف منہ کئے لیٹا تھا۔ نظریں دروازے پر ہی گڑی تھیں۔ شاید وہ میرے انتظار میں رہا ہوگا۔ چہرے پر تھکن اور آواز میں نقاہت، تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لئے میری مدد لی، پھر بتایا کہ کسی نئی دوا سے اس پر دو بار کل سے غشی طاری ہو چکی ہے اور بار بار پسینہ آتا ہے۔ پھر اس نے میز پر رکھے کاغذوں میں سے ایک کاغذ اُٹھایا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تصویر میں نے اپنی یادداشت کے سہارے آج اسکیچ کی ہے۔'' میں نے کاغذ اس سے لے لیا، وہ پنسل سے بنایا ہوا چہرے کا خاکہ تھا، غور کرنے پر اس چہرے کی آنکھیں اور پیشانی کہیں دیکھی ہوئی سی لگیں۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کس کا اسکیچ ہے؟'' جواب میں وہ اداسی سے بولا۔

''میری محبوبہ کا۔'' یہ سن کر میں چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ دھیرے دھیرے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ذہن میں کئی سال پیچھے لوٹ گیا۔ ان آنکھوں اور پیشانی میں اور تمنا کی

آنکھوں اور پیشانی میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ ٹھوڑی اور دہانہ البتہ کچھ مختلف سا تھا۔ پھر یاد آیا کہ ماتھے پر گری ہوئی بالوں کی ایک لٹ تو بار بار میرے خیال کو تمنا کی طرف لے جا رہی تھی۔

''کیسی لگی---؟'' اس کے سوال پر میں چونک پڑا۔

''اچھی ہے۔'' میں تصویر پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔ جب نظر ہٹائی تو پاشا اپنے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ پاشا نے ہاتھ بڑھا کر تصویر مانگی مگر میں نے نہ دی اور ہمت کر کے پاشا سے پوچھ ہی لیا۔

''سچ بتانا، تم نے اپنی محبوبہ کے ساتھ ہوٹل کا جو واقعہ بیان کیا تھا وہ سچ تھا۔''

''کیوں---؟'' وہ بولا۔ ''کیا تمہیں جھوٹ لگتا ہے؟ کیا کچھ اس واقعے میں ہے جو ممکن نہ ہو۔''

''نہیں ایسا تو کچھ نہیں ہے۔ لیکن......'' اس نے میری بات کاٹی۔

''میں انجام کے لیے تھوڑا پریشان ضرور ہوا تھا۔''

''انجام--- کیسا انجام'' میں نے پوچھا۔

''جھری میں سے کسی کے جھانکنے کے شبہ سے اُن دونوں کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ میرے تصوّر کو اس کا فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

''تصور کو--- میں سمجھا نہیں۔'' یہ سن کر وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''پھر میں نے تم کو اس مرد کی جگہ پر رکھ کر سوچا۔''

''مجھ کو! کیا مطلب؟ اس کی پہیلیاں مجھے حیران کر رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے کہنے لگا۔

''تم اور میں جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس تہذیب اور اخلاقیات میں پلے بڑھے ہیں اور ہمارے حصے میں بیوی کے علاوہ کچھ وقت کے لئے اگر کوئی ایک آدھ عورت آئی بھی ہے اور اس سے ہم بستری کا کوئی بھولا بھٹکا موقعہ چرا چھپا کر مل بھی گیا تو اُس موقعہ پر اگر ہمارے اعصاب پر یہ شک بیٹھ جائے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے تو ہمارے اعصاب پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ مثلاً اگر تم اس مرد کی جگہ ہوتے تو کیا اس خوف کے زیر اثر تمہارے اندر وہ مردانگی جاگتی جس کا عام حالت میں جاگنا ممکن ہوتا ہے۔ میں سمجھا ہوں کہ ہرگز نہیں جاگتی۔ بس یہی سوچ کر میں

نے اس وصل کا اختتام بتی جلنے اور بجھنے کے عمل پر کیا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو---''میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔''کیا یہ واقعہ تمہارے ساتھ ہوٹل میں پیش نہیں آیا۔''

''ہرگز نہیں۔ میں نے وہ سچ بتانے کے لیے ہی تو تم کو بلایا ہے۔''

''سچ؟''

''ہاں، میرا سچ یہ ہے کہ میری ہڈیاں شاید ہمیشہ سے کھوکھلی ہیں۔ اس لیے ٹھوس حقیقتوں کی میری زندگی میں اتنی ہی جگہ رہ گئی ہے جتنی میری اور میرے بستر کی۔ میں حقیقتوں کو نہیں صرف ان کے تصور کو ہی اپنے بستر پر لے کر سوتا جاگتا ہوں اور اب مجھے انہیں کھوکھلی ہڈیوں کے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اس کہانی کو میں نے اس آگ کی مدد لے کر رچا تھا جو میری رگوں میں تمہاری کہانی نے کچھ دیر کے لیے بھر دی تھی۔''پھر اس نے وہ تصویر پلک جھپکتے میں میرے ہاتھ سے چھین کر پرزے پرزے کر دی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر کہنے لگا،''خدا کی قسم وہ کہانی ہی نہیں یہ تصویر بھی فرضی ہے۔ میری زندگی میں ایسی خاتون یا کہانی کا دور دور تک کوئی گزر نہیں۔ یقین کرو، میں اپنی اولادوں کی قسم کھا کر تم سے سچ کہہ رہا ہوں''۔

میں پاشا کا جواب سن کر کیسا محسوس کر رہا تھا اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اتنا یاد ہے کہ سہما ہوا اس کی صحت کی دعا کرتا وہاں سے چلا آیا تھا۔ چند دنوں بعد میں اپنی بیٹی کے پاس بیرونِ ملک چلا گیا۔ واپسی ڈیڑھ ماہ بعد ہوئی۔ آتے ہی اسی شام میں پاشا سے یہ پوچھنے نکل پڑا کہ جو کچھ پاشا نے تصور کی مدد سے بیان کیا تھا وہ ویسا کا ویسا ہی میرے ساتھ حقیقت میں کیسے ہو گیا۔ پھر چلتے وقت ہمت کر کے یہ بھی پوچھ لوں گا کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد اُس گتھی کو سلجھانے میں کیا وہ میری مدد کر سکتا ہے کہ دروازے کی جھری کے پیچھے سے آنکھ لگا کر دیکھنے والا اس کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟ پاشا کے گھر پہنچا تو زنان خانے سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں اور مردانے میں پڑوسی اور عزیز پاشا کے آخری غسل کے انتظام میں لگے تھے۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

دہلی

۳/ مئی ۱۹۹۸ء

محبی اقبال مجید، تسلیم

کتاب پڑھ ڈالی اتنی توجہ اور محبت سے جو تمہارا حق ہے۔ مگر کیا کروں۔ میں عدّو و چچا سے لیکر پوشاک تک ہی سے اقبال مجید کا رسیا ہوں اس سے آگے پیچھے میرا اقبال مجید کہیں کھو گیا ہے اور مجھے ڈھونڈنے سے نہیں ملتا البتہ کہیں کہیں کچھ پرچھائیاں سی ملتی ہیں اور بس۔ وہی حال اس کتاب کا بھی ہوا۔ باوجود خوش پوشاکی اور دیدہ زیبی کے وہ دردمندی وہ بے محابا طرزِ تحریر کیا ہوا۔ میرا اقبال مجھے واپس کردو اور باقی سب کچھ اعزازات، انعامات اور سرفرازیاں تم لے جاؤ۔ بقول فیضؔ

آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول

مجھ کو لوٹا دو مری عمر گزشتہ کی کتاب

اقبال مجید میرا خیال ہے کہ ہم فسطائی دور میں زندہ ہیں اس لئے اب حق گوئی اور راست گوئی خطرناک بھی ہے اور ضروری بھی۔ اس پر غور کرنا۔

تمہارا

محمد حسن

ایک سگریٹ لائٹر کی کہانی

ایک بار نہیں، کئی بار ایسا ہی ہوا تھا۔

جس کی وجہ سے ایسا ہوا تھا وہ وجہ تو بہت معمولی تھی، میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا، خود چائے کی دوکان کا مالک جس کا میں ملازم تھا وہ بھی جانتا تھا کہ ایسا ہو جانا بڑی عام سی بات ہے، لیکن بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، دامودر کا تو نقصان ہی ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ مجھے اپنے پاس بلاتا، اپنے سامنے مجھے ایک دم سیدھا کھڑا کرتا، میں گردن جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگتا تو بُری طرح سے چڑھ جاتا۔ تم کہتا: نظریں اوپر اُٹھا، مجھ سے اپنی آنکھوں میں دیکھنے کو کہتا پھر دو پل اپنی جلتی ہوئی خونخوار آنکھوں سے مجھے دیکھتا پھر کہتا:۔

''سالے یہ ماچس ایک روپے کی ملتی ہے، دن بھر میں تو دو تین ماچسیں گاہکوں کو سگریٹ جلانے کے لئے دے کر واپس لینا بھول جاتا ہے۔ وہ اسے پتلون کی جیب میں ڈال کر چلتے بنتے ہیں۔ سالے اتنے جوتے ماروں گا کہ چاند پر ایک بال نہیں رہے گا''۔ دامودر نے مجھے جوتے تب تک نہیں مارے تھے لیکن دھمکیاں تو وہ اس سے بھی سخت دے چکا تھا۔۔۔

دامودر کی چھوٹی سی چائے کی دوکان تھی، اس دوکان پر گلاس دھونے اور گاہکوں کو چائے پہنچانے کے کام پر مجھے پانچ روپے روزانہ پر رکھ لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے میری عمر اس وقت چودہ پندرہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ دامودر کی دوکان میں اندر بیٹھ کر چائے پینے کی کوئی جگہ نہ تھی، اصلی اور گاڑھے دودھ کی چائے دامودر خاصی سوندھی بناتا تھا۔ گاہک مجھ سے ماچس مانگتے اس کام کے لئے ماچس مجھے دامودر سے ہی ملتی تھی، جب تک میں گاہک کو سگریٹ جلانے کے لیے ماچس پکڑاتا، کوئی اور گاہک اپنا خالی گلاس دینے کے لئے آواز دیتا، میں اس طرف لپکتا، گلاس ہاتھ میں ابھی آ بھی نہیں پاتا کہ بھٹی پر کھڑے چائے بنانے والے کی پکار سنائی دیتی جہاں

گلاسوں میں بھری دوسرے گاہکوں کی چائے میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ میں ادھر لپکتا جھوٹا گلاس الگ رکھ کر تاروں سے بنے جھالے میں چائے سے بھرے گلاس اُٹھاتا اور دوسرے گاہکوں کو چائے دینے لگتا، پھر الٹے پاؤں واپس ہو کر جھوٹے گلاسوں کو جلدی جلدی دھونے کے کام میں لگ جاتا اور تب تک تازی ماچس جو تھوڑی دیر پہلے کھولی گئی تھی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یہ جا اور وہ جا۔ جب کوئی دوسرا گاہک اپنی سگریٹ یا بیڑی جلانے کے لئے ماچس مانگتا اور میں اپنی جیبیں ٹٹولتا تو مجھے وہ ماچس یاد آتی۔

جب کئی بار دامودر کی دی ہوئی ماچسیں میرے ہاتھ سے کھونے لگیں تو ایک بار دامودر نے میری ایک دن کی مزدوری میں سے دو روپے کاٹ لئے اور رات کو صرف تین روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اس جرمانے سے میرے دل کو جو تکلیف ہوئی اس نے آگے کے لئے مجھے تھوڑا ہوشیار یا یوں کہو چالاک بنا دیا۔

دامودر کی ٹی اسٹال سے لگی ایک پان والے کی دوکان تھی۔ جب میری ماچس کسی گاہک کے ساتھ بھولے سے یا جان بوجھ کر چلی جاتی تو میں چپ چاپ پان والے کی دوکان سے ایک ماچس لے لیتا اور دامودر کے حساب میں لکھوا دیتا۔ پڑوس کا معاملہ تھا اور پھر وہ بھی ایک ماچس پان والا بے چون وچرا کے دے دیتا لیکن یہ ترکیب زیادہ دن نہیں چلی اور ایک دن میری یہ حرکت پکڑی گئی۔ اس وقت دامودر کی غضبناکی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے مارے طیش کے کھولتی ہوئی چائے میں پڑی پیتیل کی کھرچنی جس سے وہ لگاتار کھولتی ہوئی چائے چلاتا رہتا تھا کہ پیندے میں چائے نہ لگ جائے اُٹھائی اور جلتی ہوئی کھرچنی میرے ہاتھ پر زور سے ماری۔ اس سے میری داہنی کلائی اتنی گہری جل گئی کہ میں کئی روز تک اس کی جلن میں تڑپا اور پھر ہمیشہ کے لئے وہاں ایک داغ بن گیا۔

کچھ عرصے بعد حالات نے مجھے دامودر کے ٹی اسٹال کی نوکری سے نکال باہر کیا، اس وقت یعنی اس کچی عمر میں جہاں مجھے دوسری بہت سی باتیں معلوم نہ تھیں وہیں اس حقیقت سے بھی ناواقف تھا کہ زندگی ہمیں طرح طرح کے داغوں کی خاموش سوغاتیں دیتی ہے اور دے کر بھول جاتی ہے، تب یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان سوغاتوں کی ایک زبان ہوتی ہے۔ اس

زبان کو ٹھیک سے پڑھ کر اس کا مطلب سمجھ لینا آسان نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ تو حرفوں کی طرح داغوں کی علامتوں کو کبھی پڑھ نہیں پاتے۔ میں جب بھی اپنی کلائی دیکھتا تھا اس بدنما داغ کو دیکھ کر بس کسمسا کر رہ جاتا تھا۔

کچھ عرصے بعد میرا مقدر مجھے ایک ایسی کینٹین میں ملازمت کے لئے لے آیا جو ایک فلم اسٹوڈیو کے اندر تھا اور جس کو یا تو اسٹوڈیو کا عملہ استعمال کرتا تھا یا شوٹنگ کے دوران فلم کے کلاکار اور ٹکنیشین وغیرہ۔ اس کینٹین میں خود میں بھی ایک معمولی ویٹر تھا اور چائے کافی، کولڈ ڈرنک وغیرہ خوبرو لڑکوں اور خوبصورت لڑکیوں کی میزوں پر پہنچایا کرتا تھا، ظاہر ہے کہ یہاں آنے والے گاہک دامودر کے ٹی اسٹال پر آنے والے گاہکوں کے مقابلے میں آسمان سے اتری کوئی مخلوق لگتے تھے، جس زمانے میں اسٹوڈیو میں کوئی بڑی کاسٹ کی فلم شوٹنگ ہوتی تو انڈسٹری کی نامی گرامی ہیروئنوں کی میزوں کے آس پاس منڈلانے کا سنہرا موقع بھی مجھے مل جایا کرتا تھا۔ اس کینٹین میں مجھے وردی پوشی تو اختیار کرنی پڑتی تھی ہی لیکن اس کے ساتھ تھوڑا صاف ستھرا رہنا پڑتا، جوتوں پر پالش ہونا، شیو کیا ہوا چہرہ اور چھوٹے کٹے ہوئے بال جو ٹوپی سے ڈھکے ہوتے، وہاں آنے والے گاہک کم لفظوں میں اور اشاروں میں مجھ سے اور میرے ساتھیوں سے باتیں کرتے، مثلاً پینے کا پانی، کوک، چائے اور سگریٹ وغیرہ کے مطالبے کے اشارے مخصوص تھے۔ جن کو شروع شروع میں مجھے سمجھنے میں گھپلا بھی ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کینٹین کو کام کاج کے بیچ چلائے جانے والا لنچ بھی تیار کرنا ہوتا تو کام خاصا بڑھ جاتا۔ کینٹین کی ان معمولی کرسیوں پر کروڑ پتی کلاکاروں کو باتیں کرتے ہوئے جب میں دیکھتا تو اپنی قسمت پر یہ رشک بھی کرتا کہ جو لوگ ان کلاکاروں کی ایک جھلک دیکھنے کی تمنا لئے ملک میں گھومتے ہیں وہی اداکار مجھ سے کس قدر قریب بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان نوجوانوں میں کوئی پرانے زمانے کا شہرت یافتہ اداکار بھی بیٹھا دکھائی دیتا۔

ایک بار کلاکاروں کی بھیڑ بھاڑ میں ایسا ہی ایک عمر رسیدہ سینئر اداکار کسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ کینٹین کی کونے کی میز پر ذرا دیر کو آ کر بیٹھا۔ کشادہ پیشانی بڑی بڑی آنکھیں، کھڑی ناک، گورا رنگ اور عمر کے زوال کے ساتھ اندر سے جھانکتی ایک اداسی، تھوڑی

دیر میں اس کی میز کے چاروں طرف کچھ دوسرے نئے کلاکاروں کو اسے گھیرے ہوئے دیکھا، میں میز پر سے خالی برتن اُٹھانے گیا تو وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ کسی کے کسی سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ ''آپ لوگوں کو ایک دن پتہ چلے گا کہ شہرت کو ہم بہت مضبوط پنجرے میں قید کر کے اپنے کسی چہیتے پرندے کی طرح رکھتے ہیں، شہرت نام کے اس پرندے کی دن رات سیوا کرتے ہیں، اسے دانہ پانی ڈالتے رہتے ہیں کہ کہیں وہ مر نہ جائے۔ آپ لوگوں پر ایک دن یہ راز بھی کھلے گا کہ شہرت کے اس پرندے کو آپ کتنا ہی کیوں نہ کھلا دیجئے اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور یہ پرندہ بھوکا ہی رہتا ہے اور چپکے چپکے ٹھونگیں مار مار کر آپ کو کھا جاتا ہے اور نہ جانے کس راستے ایک دن پنجرے سے نکل کر اُڑ جاتا ہے''۔ اس بھیڑ میں ایک شوخ مسکراہٹ والی لمبی اور گوری سی لڑکی نے جس کی ایک پکچر ہٹ ہو چکی تھی جب آگے بڑھ کر بڑی عقیدت کے ساتھ اس کا آٹوگراف مانگا تو وہ بولا۔ ''آج آٹوگراف کی اجرت میں تمہیں مجھے اسٹوڈیو سے میرے گھر تک ٹیکسی میں جانے کا کرایہ دینا ہوگا۔''

انہی خوبصورت دنوں کی بات ہے کہ کینٹین ایک روز ایسے سُپر اداکار کی آمد سے جگمگا اُٹھی جس کے دنیا بھر میں ڈنکے پٹے ہوئے تھے۔ میں بڑے اشتیاق سے آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا کیونکہ وہ شاید میری موجودگی میں پہلی بار وہاں آیا تھا۔

وہ اکیلا بھلا کیسے ہو سکتا تھا، اس کی ٹیبل کی ساری کرسیاں تو بھر ہی گئی تھیں، آس پاس کی بھی خالی کرسیاں کھینچ لی گئی تھیں۔ میری حیثیت کینٹین میں اناڑی جیسی تھی جسے بات بات پر ٹوکا جاتا تھا اور روز ہی کوئی نہ کوئی نئی بات سکھائی جاتی تھی۔ سچ پوچھئے تو مجھے ہنسنے اور مسکرانے کی تمیز نہیں تھی، اس ماحول میں آنے کے بعد میں نے جانا کہ شریف اور رذیل آدمی میں جہاں کئی دوسرے فرق ہوتے ہیں وہاں ان کی مسکراہٹ اور ہنسی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور وہ غصے کو ہی نہیں اپنی خوشی کو بھی اس طرح ضبط کرنا جانتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں ان کا چہرہ نہیں بگڑنے پاتا۔

باتیں کرنے کے دوران اس سُپر اسٹار نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا، ادھر اُدھر ہاتھ ڈال کر غالباً ماچس تلاش کی جو اس کی جیبوں میں نہ تھی پھر میری طرف دیکھ کر اشارے

سے ماچس مانگی، میں نے بڑھ کر ماچس اس کو پکڑا دی اور کچن میں چلا گیا۔ کچن میں کھڑے کینٹین کے ٹھیکدار نے میری یہ حرکت دیکھ لی کہ میں نے کیسے اجڈ طریقے سے اتنے بڑے اسٹار کو ماچس پکڑا دی تھی۔ ٹھیکیدار نے مجھے ہزاروں باتیں سُنا کر میری ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ پھر بولا: ''ابے گنوار تو نے خود ماچس جلائی ہوتی اور تیلی جلا کر اس کی سگریٹ اپنے ہاتھوں سے سلگائی ہوتی پھر وہ مجھے دیر تک بتا تا رہا کہ کیسے ماچس جلاتے ہیں، تیلی کی لو کو کیسے ہوا سے بچاتے ہیں اور کیسے دوسرے کی سگریٹ سلگاتے ہیں۔ اس مشق میں ٹھیکیدار نے کئی بار اپنی سگریٹ مجھ سے سلگوائی اور جب میں واپس کینٹین میں آیا تو سُپر اسٹار کی میز خالی ہو چکی تھی اور سُپر اسٹار کو دی ہوئی ماچس وہاں نہ تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے شدید کوفت ہوئی کہ ماچسیں گنوانے کا سلسلہ وہاں بھی آخر کو شروع ہو گیا۔ میں اپنی کلائی پر جلنے کے داغ کو دیکھتا رہا۔ شاید ۔۔۔اتفاق ہی تھا کہ دوسرے دن لنچ کے دوران وہی سُپر اسٹار کچھ نئے لوگوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف لپکا اور وہ ابھی ٹھیک سے اپنی جگہ پر بیٹھ بھی نہ پایا تھا کہ میں فوراً اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''سر'' میں نے اسے کہا۔ ''میں نے کل آپ کو سگریٹ جلانے کے لئے ماچس دی تھی''۔ جواب میں پہلے تو وہ مجھے ایک پل دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اس کی جیبوں میں ماچس نہ تھی وہ پھر مسکرایا اور دھیرے سے بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''سدھیر''۔ میں نے جواب دیا تو پلٹتے ہی اس نے سوال کیا۔

''کیا تم ایک کام کر سکتے ہو سدھیر؟''

''کیا کام؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تم اس ماچس کو بھول سکتے ہو۔۔۔'' اس کا سوال سُن کر میں دو پل سوچتا رہا کہ کیا جواب دوں اُسے، اسی وقت میرے دل نے مجھ سے کہا کہ اس سُپر اسٹار کو اپنی کلائی کا وہ نشان دکھاؤں جو ماچسیں کھونے پر مجھے کبھی ملا تھا۔

''میں تو بھول جاؤں''۔ میں نے اسے جواب دیا پھر اپنی کلائی کا داغ اسے دکھاتے

ہوئے بولا۔ ''مگر یہ داغ مجھے نہیں بھولنے دیتا جو ٹی اسٹال کے مالک کی ماچسیں کھونے کی سزا کے طور پر مجھے ملا تھا۔'' یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس سُپر اسٹار نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا پھر اپنی طرف کھینچا اور غور سے اس گہرے بدنما داغ کو دو پل دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ چھوڑ کر اس نے سیدھا میری آنکھ میں دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا اور مُسکراتا رہا بغیر کچھ بولے، اس کو ایسا کرتے دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی جگہ مزہ لیتے ہوئے ہنسنے اور مُسکرانے لگے۔ یکبارگی وہ سُپر اسٹار جیسے اپنے اندر کہیں سمٹنے سا لگا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے مُسکراہٹ غائب ہوئی پھر چہرے کی چمک اور پھر لہجے میں وہ کھنک بھی نہیں رہ گئی جو پہلے تھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سگریٹ لائٹر نکال کر میرے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر بولا:۔

''اس ماچس کی جگہ یہ لائٹر رکھ لو۔۔۔۔'' میں نے لائٹر لینے سے جھینپتے ہوئے انکار کیا تو اس نے کہا: ''سگریٹ لائٹر سونے کا تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کئی اور معنوں میں بھی کہیں زیادہ بیش قیمت ہے''۔ پھر اس نے بتایا کہ ''وہ کبھی فلم اسٹوڈیو میں کام کرنے والا ایک معمولی لائٹ بوائے تھا اور ایک بار فلم کے ایک بڑے اہم اور جذباتی سین کی ہیروئن کو لے کر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس سین کے کئی ٹیک ہو چکے تھے لیکن بات نہیں بن رہی تھی، آخر کو ایک بار پھر سین لیا گیا، سین ختم ہونے میں کچھ ہی سیکنڈ باقی تھے کہ ایک لائٹ اپنے ہتھے پر شکنجے کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کے سبب نیچے سرکنے کو ہی تھی کہ اس نے لائٹ کو اپنی تین انگلیوں اور انگوٹھے کی پوروں پر روک لیا اور اس وقت تک روکے رہا جب تک ہیرو کا وہ سین ختم نہیں ہو گیا مگر اس وقت اس کی انگلیوں اور انگوٹھے کی پوریں گرم لوہے کو تھامے اچھی طرح جل چکی تھیں۔ پھر سُپر اسٹار نے اپنی انگلیوں کی وہ پوریں دکھائیں جن پر ابھی تک جلنے کی نشان باقی تھے اور بتایا کہ جب ہیرو کو شارٹ مکمل ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ لائٹ بوائے نے سین کی کامیابی کے لئے چپ چاپ انگلیوں کی جلن کو برداشت کر لیا اور سین کے دوران لائٹ کا زاویہ بگڑنے نہیں دیا تا کہ ہیرو کی محنت بیکار نہ جائے تو اسی موقع پر اس ہیرو نے وہ لائٹر سُپر اسٹار کو دیا تھا جس کی حیثیت اس وقت ایک معمولی لائٹ بوائے سے زیادہ نہ تھی۔

جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے دیئے ہوئے لائٹر کو قبول نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کی

غیر معمولی پیشکش سے کسی قدر خوف زدہ بھی ہو گیا تو اس نے مجھے ڈھارس دی۔

''تم اس لائٹر کو میرا دیا ہوا ایک قرض سمجھ سکتے ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی تمہیں ایسا ملے جس نے مجھ سے اور تم سے بھی بڑا کوئی داغ اُٹھایا ہو تو یہ لائٹر اس کو دے دینا''۔ یہ کہہ کر وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر مسکرایا اور پھر مجھے بھونچکا چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ چلا گیا۔

اس بات کو اب تو ڈھیر سارے دن گزر چکے ہیں، میں فلم اسٹوڈیو کی کینٹین کو کئی برس ہوئے چھوڑ چکا ہوں۔ اب میری اپنی ایک چھوٹی سی چائے کی دوکان ہے۔ وہ لائٹر بہت عرصہ تک میرے پاس رہا، میں کبھی کبھی اپنے دوستوں پر رعب ڈالنے کے لئے اس لائٹر سے اپنی سگریٹ سلگا لیا کرتا تھا۔ یاد نہیں پڑتا کہ کب میں نے وہ لائٹر آٹھ برس کی ایک لڑکی کو دے دیا تھا جس کو کسی فساد میں آگ میں پھینک دیا گیا تھا اور اس کے پیر کچھ اس طرح جھلس گئے تھے کہ وہ ان سے معذور ہو چکی تھی۔ وہ غیور بچی بھی اس لائٹر کو نہیں لے رہی تھی لیکن جب میں نے اس سے یہ کہا کہ لائٹر تمہیں اپنے پاس رکھنے کو نہیں دے رہا بلکہ کسی دوسرے کو دینے کے لئے دے رہا کیونکہ جب تک زندگی ہے، داغ بھی ہیں، نت نئے اور گہرے داغ، تو اس نے میرا تحفہ قبول کر لیا۔ اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ پتا نہیں اب وہ لائٹر کہاں اور کن ہاتھوں میں ہوگا۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ کوئی اسے جوئے میں داؤ پر لگا کر ہار گیا ہو اس کا سونا اتار لیا گیا ہو اور وہ کسی کباڑیے کی دوکان پر پڑا ہو مگر یہ تو طے ہے کہ۔۔۔۔۔ زندگی ہے تو داغ تو رہیں گے، نت نئے اور گہرے گہرے داغ۔ مگر اب بھی جب کہیں کباڑ اپڑا دیکھتا ہوں تو اس لائٹر کو آنکھیں تلاش کرنے لگتی ہیں۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

دہلی

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۶ء

پیارے اقبال مجید، السلام علیکم

تمہارا ناولٹ آج ملا، شکریہ۔ میں نے اسے فوراً پڑھ ڈالا........

اب سب سے اہم بات سنو، ان دنوں میرے اوپر بعض مقامی حلقوں کی طرف سے یلغار ہے، حسب معمول یلغار کا آسان بہانہ یہ ہے کہ شب خون میں فحاشی اور بے دینی پر مبنی چیزیں چھپتی ہیں۔ آج کل کے مسلمان بھائیوں کے مزاج سے تم خوب واقف ہو۔ خود اسی ناولٹ میں تم نے TV سیٹ پھینکنے یا مسترد کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ تمہارے ناول میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں نکلتی جسے کوئی ذی ہوش فحش کہے۔ لیکن آج کے حالات اور موجودہ یلغار کے باعث احتیاط بہتر ہے۔

تم اگر چاہو تو سارا مسودہ Edit کیا ہوا تم کو بھیج دوں تم ایک نظر ڈال لو اور پاس کر دو۔ میں نے ایک آدھ جگہ زبان تبدیل کی ہے اور املا (!!) درست کیا ہے باقی سب Editing محض پیراگراف اور Punctuation کی ہے۔

بیوی سلام لکھواتی ہیں۔

تمہارا

شمس الرحمٰن فاروقی

زلزلے

اماوس کی اندھیری اور ہیبت ناک رات کا یہ سانحہ ہے۔

یہ سانحہ میری زندگی سے براہ راست جڑا ہوا ہے۔ کاش میں اسکا راوی نہ ہوتا۔ یا پھر کوئی غیبی طاقت میرے بیان میں اتنی قوت، دے کہ میں اسے بیان کرسکوں۔ دراصل میں ایمانداری سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سانحہ میری زندگی کا ہے یا اُس بانکی ترچھی عورت کی زندگی کا۔ ہم ایک حشر بداماں زندگی کے ساتھ اپنی اپنی دوڑ، اپنے اپنے ٹریک سوٹ پہنے اپنے اپنے ٹریک میں دوڑ رہے تھے۔ آ کرتی میری پہنچ میں تھی، بلکہ کبھی کبھی مجھے یہ بھی شبہ ہوا کہ وہ میرا پیچھا کرتی تھی۔ دکان، بس اسٹینڈ، چائے خانہ، جہاں بھی میں ہوتا وہ اچانک آ جایا کرتی۔ ایک دن اتفاقاً ایک چائے خانے میں جہاں میں اکیلا بیٹھا تھا کھٹ کھٹ کرتی، اپنی بھری بھری اور خوش شکل چھاتیاں اچھالتی آ گئی۔ میگزینیں اور کتابیں میز پر پٹکیں اور دھم سے بیٹھ گئی۔ نہ ہلو نہ ہائے۔ ابھی ڈیڑھ سال پہلے اس کا گھربار، بال بچے، مال واسباب سب کچھ ایک زلزلے میں تباہ ہو چکا تھا۔ اِس بار اسکے اُبھرے سینے نے کسی سبب مجھے مخاطب کرلیا اور میری نظر کچھ زیادہ ہی پل اُدھر ٹھہری رہی تو وہ مسکرائی اور مجھے اطلاع دی۔

''آجکل کی عورتوں کی جسمانی خوبصورتی میں نمایاں چھاتیاں، فیشن میں ہیں۔ ورزش گھروں میں خاص ورزشوں سے اُنھیں اُبھارا جاتا ہے۔'' میں اندر سے جھینپ گیا ہوں یہ میں نے آ کرتی پر ظاہر نہ ہونے دیا، لیکن اس نے دیکھ لیا۔ بہت کچھ جو عام آنکھیں ذرا توقف کے بعد دیکھ پاتی تھیں آ کرتی اسے پلک جھپکتے میں دیکھ لیتی تھی۔ اسکے چہرے پر آنکھوں کی کشش عجیب وغریب تھی، ایسا لگتا جیسے آر پار دیکھ رہی ہوں۔

''تم میرا کیوں پیچھا کرتی ہو؟''

''پیچھا....؟'' وہ حیرت سے بولی

''ہاں....''

''پیچھا میں نہیں آپ کر رہے ہیں میرا، لیکن مجھے پولس کی مدد نہیں مانگنا ہے، البتہ اگر میں آپ کے اندر ایک سکڑی سکڑائی، چھٹے کارتوس جیسی، بارود سے خالی روح کی تیل مالش کرسکوں تو اسے میں نیک کام سمجھونگی۔'' میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی ذات کو اس پر عیاں کرنے میں جسقدر تکلف اور لئے دیئے پن سے کام لے رہا تھا آکرتی اسی قدر تندہی سے مزاحمتوں کے اُن پشتاروں کو روندتی چلی جاتی تھی۔ شائد اس کھیل میں اس نے کوئی امید دیکھی ہوگی۔ کیونکہ جہاں وہ دیکھ لیتی تھی میری نظر دیر میں وہاں پہنچتی تھی۔ لگتا تھا اسکے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور ایک موٹی کتاب اسکے سامنے ہے جسکا ایک ایک لفظ وہ پڑھ لینا چاہتی ہو۔ آکرتی کو لیکر میری کئی الجھنیں تھیں اور حیرت تھی کہ وہ ان الجھنوں کو مجھ سے زیادہ جانتی تھی، جب اسکے لئے بلیک ٹی میں نے منگائی تو اسکی چسکی لیکر وہ بولی۔

'زمین میں زلزلہ کیوں آتا ہے؟ زمین کا اپنا ایک قوت کا ڈھانچہ ہوتا ہے جسے ہم Power Structure کہتے ہیں، اس ڈھانچے کے نظام کا جب توازن بگڑ جاتا ہے تو زمین اندر سے پھٹ جاتی ہے اور پھوٹ پڑتی ہے۔ ہم اور آپ بھی اپنے اندر ایک قوت کے ڈھانچے کو ساتھ لیکر جیتے ہیں، یہ توازن ہمارے اندر بھی بگڑ سکتا ہے اس لئے ہماری ذات میں بھی زلزلے آتے ہیں۔'' اسکی تقریر سن کر میں مسکرایا اور پوچھا

''تو۔ تو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔'' جواب میں وہ سنجیدہ رہی اور بولی

''میری ذات کو اپنے Power Structure کو توازن میں رکھنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے''۔

مجھے یاد آیا کہ پہلی ملاقات میں آکرتی نے قوت کے ڈھانچے کی بات ایک اور انداز سے کہی تھی۔

وہ گرمیوں کی دوپہر تھی، ویران سڑکوں پر بکتر بند گاڑیاں فلیگ مارچ کر رہی تھیں، گھروں کے مرد پولس کے تشدد سے اسپتالوں میں پڑے تھے، عورتیں آلو پیاز کو ترس رہی تھیں، عمارتوں کی کھڑکیوں، دروازوں سے جھانکنے والوں پر بھی گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا تھا اور

پولس کے رنگروٹ سپاہی جنھوں نے ٹریننگ کے بعد بھی رائفل نہیں چلائی تھی اسے استعمال کرنے ،ٹریگر دبانے اور گولیوں کی رومانٹک آواز سننے کی طاقت ورخواہش اور چاہ انکے سینہ سے زلزلے کی برقی لہروں کی مانند باہر آنے کے لئے مچل رہی تھیں تو اس سراسیمگی کے ماحول میں میری ملاقات آ کرتی سے اس کافی شاپ میں ہوگئی تھی جہاں کچی عمر کے نوجوان جوڑے کافی کی پیالی پر رومانس کرتے کرتے جب جنسی ہیجان اور بے قابو جذبات نام نہاد اخلاقی رکاوٹوں کو منہدم کرنے لگتے تو وہ کافی شاپ کچھ دیر کے لئے انھیں ایک خفیہ نہاں خانہ بھی مہیا کردیتی۔ اسی کافی شاپ میں میں نے آ کرتی کوشان سے سر اُٹھائے تیز اور پُر اعتماد قدموں سے اندر آتے دیکھا۔ کونے کی میز پر جہاں میں اکیلا تھا پہنچ کر وہ ٹھٹکی پھر میرے سامنے کی کرسی پر ہاتھ رکھ کر مجھے مقناطیسی نگاہوں سے دیکھتی بولی

’’مجھے یقین ہے کہ یہ کرسی خالی ہے۔‘‘ پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بیٹھ گئی۔

’’آپ کا یقین غلط نہیں تھا۔‘‘ میں سٹپٹا کر بولا ،اسکی ابھری چھاتیوں کے درمیان گلے میں لٹکا کرفیو پاس جھول رہا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جرنلسٹ ہے۔ وہ اطمینان سے مخاطب ہوئی ’’یہ جو کچھ ہورہا ہے حکومت کے Power Structure کا مسئلہ ہے۔ توازن بگڑنے کا خوف ہے۔ وہ اُس آلے یا رکٹر پر برابر نظر بھی رکھے ہے جو زلزلوں کی کیفیت بتاتا ہے۔‘‘

آ کرتی کی اس بات میں پاور اسٹرکچر کے لفظ کا استعمال میرے لئے نیا پن نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر خاصہ مضطرب رہ کر جو بات اس نے کہی اس نے مجھے متوجہ کرلیا۔ پہلے تو وہ بے خیالی میں چمچے سے طشتری بجاتی رہی ، کچھ اتنی بلند آواز سے کہ آس پاس کے لوگ متوجہ ہو گئے پھر چمچہ رکھ کر اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر یوں نکالی جیسے اسکے دبیز غلاف میں کچھ چھپا رہی ہو پھر یوں بولی

’’سوشل پاور اسٹرکچر کے بگڑنے میں جو زلزلے آتے ہیں انکا ملبہ جن راستوں پر گرتا ہے اسکے ملبے پر سے لوگ پھاندتے ہوئے یا اوپر سے چلتے ہوئے نکل جاتے ہیں ٹرافک بھی نہیں رکتا۔‘‘ اسی وقت کافی شاپ کی پینٹری کے دروازے سے نکل کر ایک گدی گدی سی، اوپر نیچے دونوں طرف سے موٹی، چوڑے منہ اور موٹی بھدی گردن والی سانولے رنگ کی ایک عورت کاؤنٹر

پر آئی جو کشادہ ماتھے پر خوب موٹی سی بندی لگائے تھی۔ اسے دیکھ کر آ کرتی آہستہ سے بولی

''یہ اس شاپ کی کروڑ پتی اونر ہے۔ اس نے حکومت سے بابا امیڈکر کی یادگاریں بنانے کے بعض فرموں کے فرضی ناموں سے موٹے موٹے ٹھیکے ہتھیائے ہیں، کہا جاتا ہے اسکے پاس دلت ہونے کا جعلی سرٹیفکٹ ہے۔ اس کا مقامی پاور اسٹر کچر میں بہت دخل ہے یہ کئی علاقوں میں کبھی بھی زلزلے لاسکتی ہے جنکے ملبوں کا پتا تفتیشی صحافت (Investigative Journalism) بڑی دیر میں لگا پاتی ہے۔ اس عورت کو اسکی عرفیت سے پکارا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں وہ کیا ہے؟'' میں مسکرایا

''یہ انگریزی کے ہندسے آٹھ (8) کی طرح موٹی ہے۔ تو یہی میڈم ایٹ "Eight" ہے۔''

''اچھا، تو آپ اسے جانتے ہیں؟''

''ہاں تعارف کبھی نہیں ہوا۔ لے دے، بہت سنی ہے۔''

''لے دے سے کیا ہوتا ہے'' وہ غصے سے بولی ''اسکے لائے زلزلوں کا ملبہ ہٹانے کا کام ہم جیسے جرنلسٹوں کا ہے، پھاوڑا اور تگاری لیکر دوڑ پڑتے ہیں، ملبے کے نیچے سے نکلی لاشوں کا شمار کر کے راجستھان کی کرائے پر رونے والی رُدالیوں کی طرح سینہ پیٹ پیٹ کر روتے ہیں۔''

آ کرتی نے بتایا کہ شاپ پر بغیر وردی کی سوشل پولس کے کارندے موقعہ بے موقعہ چکر لگایا کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں کہ اسکی خبر میڈم ایٹ 'Eight' کو نہ ہو۔

کاونٹر پر کھڑے میڈم ایٹ نے خاص لگاوٹ والی مسکراہٹ سے آ کرتی کو وش کیا تھا آ کرتی نے بتایا کہ میڈم اس پر مہربان ہے۔ ایک وصف یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ آئے پروجیکٹوں کی بخیہ اخباروں میں چالاکی سے خود ادھڑ واتی ہے۔ جس سے لوگوں میں شکوک پیدا ہوں پھر انکے منہ بند کر دینے والے جواب فرضی خطوں کے ذریعے دیتی ہے آ کرتی نے مجھ سے کہا تھا

''وجود کی حفاظت کے لئے بھی ایک پاور اسٹر کچر کو مرتب کیا جاتا ہے، اسکی مضبوطی کے لئے بعض حالات میں خبروں میں رہنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ یہ عورت ان دنوں مجھے پال پوس رہی ہے۔ اسکی قوت کے ڈھانچے کو مجھ جیسی میونسپلٹی کے

صفائی کا مگار بھی چاہئے ہیں۔''

آکرتی میں ایک آگ تھی جو مجھ میں نہ تھی اگر تھی تو میں نے اسے پہچانا نہ تھا آکرتی میں ایک سفاک برہمی تھی جو مجھ میں نہ تھی اگر تھی تو کبھی باہر نہ آئی تھی، اسکی آنکھوں کی حیرت خیز مقناطیسیت کو دیکھ کر اسے کام دینے والے الجھن میں پڑ جاتے تھے، شوہر تو اُسے پہلے ہی چھوڑ چکا تھا وہ کئی بار مختلف پیرائے اور لفظوں میں یہ بات کہہ چکی تھی کہ کوئی نہیں جانتا کہ زندگی کا کونسا پل کن معنوں میں فیصلہ کن ثابت ہوگا اور انسان کی آرزوئیں، خواب، توقعات اور حوصلے سب ایک ان دیکھے اور انجانے زلزلے کے نیچے دب جائیں گے، پھر کون پہلے آگے آئے گا، ملبوں کو ہٹانے اور راہوں کو روشن کرنے کے جتن کرے گا، ٹوٹے ہوئے پل جوڑے گا چٹخی زمین کی دراریں بھرے گا، بس ایسی ہی کیفیت میں یکا یک آکرتی کے لئے ریلیف کیمپ کے مانند، کمبل، برتن، ڈبل روٹی اور مٹی کا تیل فراہم کرنے والی ایک خطرناک حد تک رحم دل، گھٹی ہوئی اور فتنہ پرور چھولداری بنکر میڈم ایٹ آگے آگئی۔ اُس شام پتا نہیں کہ آکرتی کے ریلیف کیمپ میں اُس پر کیا گزری تھی کہ وہ مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

''آپ اکیلے رہتے ہیں۔'' پھر خود ہی کہنے لگی۔ ''پتہ نہیں کیسے رہ لیتے ہیں اکیلے آدمی کی بیماریوں نے آپ کو اگر گھیر لیا تو پھر دو کیلے نہ رہ پائیں گے، صحافت تو چوہے کی طرح بل میں رہنے والے لنپسکوں کے بس کی چیز نہیں ہے، آخر چکر کیا ہے۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا ''یہ تم پوچھ کیوں رہی ہو، تم اپنا چکر بتاؤ'' تو وہ جھٹ سے بلا تکلف بولی

''کیا میں آپ کے ساتھ ایک کمرہ شیئر کرسکتی ہوں۔'' میری زندگی سیپ میں چھپے گھونگھے جیسی ہو چکی تھی، میں یہ بھی اب بھولنے لگا تھا کہ میری زندگی میں بھی ایک زلزلہ آچکا ہے، جس کا ملبہ ابھی تک اُٹھ نہیں سکا ہے، اس میں دبی لاشیں بھی میں بھولنے لگا تھا میں نے آکرتی سے صاف کہہ دیا۔

''جہاں میں رہتا ہوں وہاں ملبہ بھی ہے اور اسکے نیچے دبی لاشیں بھی۔ کیا تم جانتی ہو بعض زلزلے دلوں کے قصر بھی ڈھا دیا کرتے ہیں اور ان کی لاشوں کی تکفین میں وقت لگتا ہے، شائد تم لاشوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرو گی۔''

میرا جواب سن کر وہ سوچتی رہی کچھ بولی نہیں، اپنی مقناطیسی نظروں سے میرا انگ انگ ٹٹولتی رہی۔ وہ سب کچھ مجھ سے پہلے جان لیتی تھی۔ ممکن تھا کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ میری بیوی نے زہر کھالیا تھا اور وہ یہ بھی جانتی ہو کہ میں اب سرکس کے تعبید ار گھوڑے کی طرح رنگ ماسٹر کے ہنٹر پر ہمیشہ نظر رکھتا ہوں اور میں اس ہنٹر کے طفیل دو اور دو چار کی طرح ایک سیدھی لکیر پر چلا جا رہا ہوں۔ میں لکیر کو چھوڑنے سے ڈرتا ہوں۔ کوئی اچھا کام کرنے پر جب مجھے جلیبی کھانے کو ملتی ہے تو پھر میں دوسری طرح کا کوئی کام کرنے کے لائق نہیں رہ جاتا، اس لئے تندرست اور ہٹا کٹا ہوں، فاقے برداشت کر لیتا ہوں۔ تین تین دن کمرے میں بند، دن رات روشنی اور تازہ ہوا کے بغیر چاق و چوبند رہتا ہوں۔ کسی بھی دلدوز واقعے پر کوئی آہ اور کوئی سسکی میرے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ مجھے لگا کہ آکرتی یہ ساری باتیں جان گئی تھی اس لئے شائد ساتھ رہنے کی تجویز رکھ کر وہ مجھے دہشت زدہ کر دینے کا کھیل تفریحاً کھیل رہی تھی۔ ایک دن کافی پیتے ہوئے وہ اپنی پیالی کے اوپر سے بار بار مجھے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی شائد وہ کچھ کہنے کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی آخر کو وہ بولی

''یہ کافی جو ہم پی رہے ہیں اپنی اسی شکل میں زمین سے نہیں اُگتی، اس میں یہ پُرکشش رنگ، لذت اور خوشبو نکالنے کے لئے صرف پودوں کے بیج سے ہی کام نہیں چلتا، زندگی گھولنا پڑتی ہے، Perculate کرنا پڑتا ہے۔ قبرستان سے باہر نکلئے۔''

میں نے اس طرح اسکی بات ایک کان سے سنکر دوسرے کان سے نکال دی کہ وہ بھی جان جائے کہ میں ایسا پورے ارادے کے ساتھ کر رہا ہوں۔ وہ چپ چاپ پیچ و تاب کھاتی رہی اندرونی جذبات نے اُسکا منہ لال کر دیا تھا آخر وہ خاصے غیض و غضب کی حالت میں اُٹھکر چلی گئی۔

عورتیں کب اور کیوں برافروختہ ہو جایا کرتی ہیں اسکا مجھے زیادہ تجربہ نہ تھا۔ پہلے بھی وہ ایک آدھ بار میری غیر سنجیدگی پر لال پیلی ہو چکی تھی مجھے یہ شبہ تھا کہ وہ میرے مزاج اور اسکے نزدیک ناپسندیدہ رویّوں کو ضبط و تحمل کے ساتھ برداشت کر لے جانے کی قوت کھوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس نے کہا ''تم مجھ میں دلچسپی نہیں رکھتے، لیکن میں اس بات کو اس لئے نظر انداز کرتی ہوں کہ تم کسی چیز میں بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ لیکن تم میرے لئے قابلِ رحم بھی ہو اس

لئے کہ تم اپنے آپ میں بھی دلچسپی نہیں لیتے''، کچھ ایسی ہی شکایت میری نئی نویلی بیوی کو بھی تھی، لیکن اس نے یہ کبھی نہ کہا کہ وہ مجھے قابلِ رحم سمجھتی ہے۔ اس دن ایک عجیب وغریب رنگت کا پھول آ کرتی میرے لئے لائی۔ وہ پھول اس نے بڑی اگاوٹ سے پیش کیا

''یہ پھول اُس چھوٹی سی چڑیا کی رنگت کا ہے، جو زلزلے کی آہٹ پہچان لیتی ہے۔''

یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ پھول اس نے کیوں مجھے تحفے میں دیا تھا۔

ایک دن اس نے فون پر مجھ سے عجیب عجیب سی باتیں کیں، حالانکہ وہ باتیں بہت عجیب بھی نہ تھیں، مگر ان میں میری تضحیک کے پہلو بھی تھے۔ پھر وہ فون پر میری ذات کے موضوع کو لیکر مشتعل ہوگئی۔ پھر اپنا غصہ روکا اور مجھے سمجھاتی رہی۔ ''ذات کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی دکان کے شوکیس میں رکھی مل جائے اور آپ اُسے خرید لائیں آپ کی خود آگہی کے ہاتھوں ہی ذات کی آہستہ آہستہ پرورش ہوتی ہے، پھر جھنجھلا کر بولی۔ ''میں بھی پاگل ہوں۔ کسے فون پر سمجھا رہی ہوں۔'' اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆

اماوس کی اندھیری اور ہیبت ناک رات کا یہ سانحہ ہے۔

کاش میں اسکا راوی نہ ہوتا۔ یا پھر کسی غیبی طاقت سے مجھے اتنی قوت مل جاتی کہ میں اسے بیان کرسکتا۔ اُس اماوس کی رات میں میری خوابگاہ کی کھڑکی جو خاصی نیچی تھی کھلی رہ گئی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے اسے دانستہ کھولا تھا یا وہ بھول سے کھلی رہ گئی تھی۔ میں کھڑکیاں بند رکھتا ہوں۔ ایک خیال بار بار یہ آتا ہے کہ میں نے ہی وہ کھڑکی کھولی تھی، کچھ ایسا بھی خیال ہے کہ سوتے وقت میری نظر بھی اس پر پڑی تھی لیکن میں نے اسے بند نہیں کیا۔ ایسا کبھی ہوتا نہ تھا پھر کیوں ہوا مجھے خود بھی اسکی حیرت ہے۔

آگے کا سنسنی خیز واقعہ یہ ہے کہ آ کرتی کسی شاطر اور دلاور چور کی طرح اُس کھلی کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں گھسی جو میرا دھندلا سا خیال ہے کہ میں نے ہی کھولی تھی۔ آہٹ پر میری آنکھ کھل گئی یا پھر میں آنکھ کھولنے کے انتظار میں ہی آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ ٹارچ جلائی تو دیکھا آ کرتی اطمینان سے فریج کا دروازہ کھولے ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگائے کھڑی

تھی۔ میں پہلے کچھ خفیف سا خوفزدہ ہوا پھر میں نے سوچا کہ صورت حال کا تقاضہ ہے کہ میں کچھ خوفزدہ ہو جاؤں۔ پھر ہمت کر کے بولا

''ایسا کیوں کیا تم نے؟''

''ایسا ہی کرنا چاہے تھا۔ شائد آپ بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔'' اس نے طنز کیا۔ میں نے تلخی سے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''عام راستہ استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں ملبہ پڑا ہے۔ دو پل وہ چپ رہی پھر سانس چھوڑ کر بولی۔ ''میں میڈم کی چاکری سے تھک گئی ہوں۔''

ہم نے ایک دوسرے سے اس بات کا ذکر تو نہیں کیا تھا لیکن ہمیں زندگی اور قدرت کے تجربات نے یہ سکھایا تھا کہ فتوحات سے زیادہ شکستوں کی تعظیم کرنی چاہئے۔ وہ دیوان سے اٹھ کر میرے سرہانے بیٹھ گئی، سگریٹ جلائی پھر گردن جھکا کر اپنی زندگی کے لائے زلزلوں کی یادوں کے میوزیم کی سیر کی پھر میرے برابر ہی بستر پر بلا تکلف دراز ہو گئی۔ کانوں کے پاس سرگوشی کی۔

میڈم بڑی ڈاکو نکلی، ملبے سے نکلے مہلکین کے گلے کی چین (Chain) اور جیبوں سے نقدی بھی نکال لیتی ہے۔ کافی شاپ رنڈی خانہ ہے۔ وہ جنس کے بازار کی ہی دلال نہیں دلتوں کے ریلیف کیمپوں اور سرکاری خزانے کے درمیان کی ایک ایجنٹ بھی ہے۔ اور اس نے مجھے بھی سرکاری ریسٹ ہاؤسوں کی خوابگاہوں میں حکام کے انٹرویو لینے بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے اپنی ٹیم کے ساتھ خفیہ کیمروں کی مدد سے اسکا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کل اخباروں کے لائے زلزلے کے ملبے میں کتنے دبتے ہیں، یہ سن کر میں نے اسکی طرف سے پیٹھ کر لی، ترشی کے لہجے میں اسے گوش گزار کیا کہ وہ کسی ملیو ڈرامے کا انتظار نہ کرے۔ معاشرہ ایسے ڈراموں سے الگ چیز ہے۔ معاشرے میں کوئی ضروری نہیں کہ جابر اور ظالم کا انجام ہمیشہ دردناک ہو، ایسا خوب ہوتا ہے کہ وہ ہر الزام سے بری ہو جاتا ہے۔ بدی کی قوتیں ہی اصل معنوں میں طاقت ور اور کچھ کر گزر جانے والی قوتیں ہوا کرتی ہیں۔'' تو وہ پھٹ سے بولی

''اسی طرح جیسے میں تمہاری مرضی اور اجازت کے بغیر اندھیری رات میں تمہاری خواب گاہ میں پھاند کر آ گئی ہوں۔''

کیسا تباہ کُن اندھیرا تھا، جو غارت گر بھی تھا اور خلاّق بھی۔ اور کیسا پُر عزم بولتا ہوا سناٹا تھا جب زلزلوں کی تباہ کار اور ہیجان انگیز غیبی قوت کے ساتھ اپنے مکمل وجود کی ان دیکھی حیرت ناکیوں کو وہ اپنے بستر کے مرد پر ایک بپھرے ہوئے جنون کے ساتھ منکشف کرنے والی ایک غضبناک درندہ مادہ بنکر ہزار آنکھوں والی کالی رات میں مجھے چیرتی پھاڑتی اور میری تکہ بوٹی کرتی رہی اور ہچکیوں سے روتے ہوئے میری ذات کو ہمیشہ محتاط شریف زادہ اور گھنا بنائے رکھنے والا، کھوکھلی نیکیوں کا امانت دار، عیبوں کو بلی کے گُو کی طرح چھپائے رکھنے والا ڈرپوک نامرد بتا کر اور مجھے حرامزادہ، بدقسمت اور بدعقل کہکر فراٹے سے ننگی ننگی گالیاں دیتی رہی پھر رندھے گلے سے بولی

''تمہارے ساتھ سینے پر بیٹھی جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ اگر بدی ہے تو یاد رکھو بدی کی قوتیں ہی کچھ کر گزرنے کے اہل ہوتی ہیں۔''

اس وقت اس جانے بوجھے چہرے پر ایسے غیر مانوس نقوش اُبھر آئے تھے جو بدنما ہوتے ہوئے بھی خوبصورت تھے، آنکھوں سے نفرت کی ایسی آتشبازی چھوٹ رہی تھی کہ دل کہتا تھا وہ تھمے نہیں، مجھے حیرت تھی کہ جیسے آواز بھی اس کی آواز نہ تھی اسکی گرفت کا لمس جسے میں چلتے پھرتے کئی بار اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں پر محسوس کر چکا تھا اس میں اب ایسی پُرکشش اجنبیت تھی جو میرے اندر حیرتوں کا وہ جادو جگا رہی تھی جسکے اثر سے باہر نکلنا چاہتے ہوئے بھی خود کو کھلا دھوکہ دیکر کسی تدبر سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا یا پھر نکل جانے کے زیاں کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہی مجھ میں نہ رہ گیا تھا۔ میرا رواں رواں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ایسے پُراسرار اور بھید بھرے لاوے کی طرح مشتعل لمحے پوری پوری زندگی کے لاحاصل انتظار کے بعد بھی پاس سے چُھو کر بھی نہیں گزرتے جبکہ اس وقت وہ میرے جسم اور روح کو شرابور کئے دے رہے تھے۔ لیکن یکا یک آکرتی کی پیش قدمی ٹھہر گئی۔ چہرے پر نئے شکوک کی پرچھائیاں سی ابھریں اس نے کنکھیوں سے جن میں میرے لئے ناپسندیدگی کی رمق تھی مجھے دیکھا اور بولی۔

''مجھے تم پر ترس اس لئے آتا ہے کہ تم اپنے بارے میں بھی سوچنے سے بھاگتے ہو، میں نے تمہیں اپنی چھاتیوں کی نظر ٹھہرا دینے والی گولائیوں اور اُبھاروں سے لُبھانا چاہا تو مجھے اندازہ

ہوا کہ تم نے لذتوں کے سنسنی خیز احساسات کو اور نفس کے مطالبوں کو دہشت زدہ کر دیا ہے بالکل ایک ڈرے ہوئے بچے کے مانند جو اپنے پسندیدہ کھلونوں سے یکا یک ڈر کر سہم جائے۔ مگر جب زندگی میں ہوس نہ رہ جائے، رندی اور سرمستی مُنہ چھپا کر بیٹھ رہے تو پھر وہ زندگی اُس ایش ٹرے کے مانند سُونی اور اجاڑ ہو جاتی ہے جو استعمال کے بعد ڈالے گئے سگرٹوں کے ٹکڑوں سے یکسر خالی ہو۔''

پھر آ کرتی بستر سے اُٹھ گئی۔ میری طرف پیٹھ کر کے مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئی، میں اسکے اس انداز پر چونکا۔ سوچا وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟ مگر میری طرف دیکھے بغیر وہ یوں بڑبڑائی جیسے خود سے باتیں کر رہی ہو۔ میں پورے طور پر اسکی طرف متوجہ تھا۔ آخر وہ کیا کرنے والی تھی؟۔ اُسی وقت اسکی آواز آئی۔

''ایسی ایش ٹرے بس برتنوں کی الماری میں رکھی رہتی ہے اسکے مالک بس ضرورت پر اسے جھاڑ پونچھ کر نکالتے ہیں اسکے بعد پھر صاف کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یا پھر وہ ڈیکوریشن پیس بنی رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ بے ترتیبی، بے ضابطگی اور نراجی کیفیت میں جو ایک رومانس اور دلآویزی چھپی ہوا کرتی ہے وہ بھی قدرت کا ایک عطیہ ہے۔ اسکو برتنا اور اس سے نباہ کرنا مشکل تو ہوتا ہی ہے پھر اسکے رومانس کو اپنی زندگی میں بھوگتے ہوئے خود کے لئے اور دوسروں کے لئے بھی ایک کامگار اور ایش ٹرے جیسی بھری بھری زندگی جینا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ کیونکہ وہ زندگی اس ایش ٹرے کی طرح بھری بھری رنگارنگ اور پُر رونق زندگی ہوتی ہے جو مختلف مُوڈ میں اپنے اندر ڈالی گئی سگرٹوں کے بے شمار ٹکڑوں سے لبریز ہوتی ہے، کچھ چٹکی سے مسلے ہوئے، کچھ یونہی پھینکے ہوئے کچھ ایسی بھی جو ایش ٹرے میں پڑے پڑے دھیمے دھیمے سلگتی رہتی ہیں اور اُن کا گُل سگریٹ کے بقیہ حصے سے منقطع ہو کر جدا نہیں ہو پاتا۔ کچھ راتوں میں لگاتار پی گئیں، کچھ چائے کے بعد آرام سے پورے لطف کے ساتھ پی گئیں۔''

پھر آ کرتی اپنی جگہ سے اُٹھی، کھلی کھڑکی کی طرف بڑھی اور اسکی منڈیر پر باہر کی طرف دونوں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک خوف جو کہیں اندر دبکا بیٹھا تھا ہوشیار ہو گیا، پھر سانپ کی مانند پھنکارا، جسکے اثر سے میں کانپ گیا۔ کہیں آ کرتی مجھے بستر پر

تڑپتا چھوڑ کر کھڑکی سے باہر پھاند تو نہ جائے گی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی ایسا ہوا تو میرا اکیلا کمرہ مجھے قبر کی طرح بھینچ لے گا۔ میری سانسیں تیز ہو گئیں۔ یکا یک میں چیخ اُٹھا۔

''آ کرتی اس کھڑکی میں گرل (Grille) نہیں لگی ہے۔ میں اسے دن میں بھی کم ہی کھولتا ہوں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ دو ایک راتوں سے میں کیوں اس کھڑکی کو پاٹو پاٹ کُھلا چھوڑ کر لیٹتا ہوں اور دل میں اسکے کھلے رہ جانے کا خوف بھی نہیں پیدا ہوتا۔''

یہ سن کر آ کرتی نے گردن موڑ کر کنکھیوں سے مجھے دیکھا، پھر پلٹ کر اپنا پورا رُخ میری مسہری کی جانب کر لیا جہاں میں بستر پر سہما سا لیٹا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں پیر کمرے کے اندر لٹکا لئے اور مسکرا کر بولی۔

''ہو سکتا ہے کہ تم یہ نہ جانتے ہو کہ تم یہ غیر محفوظ کھڑکی کیوں کُھلی چھوڑ دیتے ہو لیکن میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے کے فرش پر پھاندی، پھر دوسری جست میں وہ اپنے پورے بدن سے میرے اوپر تھی اور میرا پورا وجود اُس مسرّت کے بوجھ کے نیچے پُرسکون ہو چکا تھا جو میری گرفت سے نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

آ کرتی کے بوسوں کی بارش نے مجھ پر یلغار سی کر دی تھی اور میری گردن کی جلد پر اپنے دانتوں کے نشانوں سے خون اچھال دیا تھا اسکے جنون، طاقت، اور بے دریغی نے مٹھیوں میں بھینچ کر میرے بدن کے کپڑوں کو تار تار کرتے ہوئے کہا تھا

''میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا چھپاتے ہو تم کپاس کے ان دھاگوں کے پیچھے۔ یہ دیکھو، میری آنکھوں سے دیکھو۔ یہ تمہاری گناہوں سے آلودہ بدخصلت اور بدبودار چمڑی ہے۔ بہت ناز ہے تم کو اس پر تم نے بڑی محنت سے اسے جابر بنایا ہے لیکن جبر قتل سے بھی بڑا گناہ ہے'' پھر اس لڑکی نے میرے ننگے سینے پر دل کی جگہ کان رکھ کر کہا۔

''یہ دیکھو۔ کباڑ خانے سے خریدی زنگ آلودہ ہر طرف سے پچکی بدشکل ناکارہ اور بدانجام شرافت کی یہ دھمک سنو۔ منافق، ریاکار اور ڈرپوک دھمک بنجر صحرا میں گونجنے والی بھوکی پیاسی شکست خوردہ اور ناشیدہ آواز۔ پھر یکایک مجھے لگا کہ وہ اپنے کو سنبھالنے کے لئے کسمسا

رہی ہے لیکن انسان ہر وقت اور ہر حال میں خود کو کب سنبھال پاتا ہے اور پھر وہ مجھے شدتِ جذبات کی اُس منزل پر پہنچا چکی تھی کہ جو وہ کر رہی تھی اسکے علاوہ کچھ اور کرتی تو میں شائد اپنے ہاتھوں سے جنکی نسوں میں اب سفاکیت دوڑنے لگی تھی اسکا نرم و نازک گلا دبا دیتا لیکن پھر یہ ہوا کہ میرے ماضی کے زلزلوں اور انکی راتوں میں بیدار رکھنے والی یادوں کی اندوہناکی کو ایک ناقابلِ بیان آتش فشانی لاوا اپنے آتشیں سیّال کے مدّ و جزر میں اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے گیا اور میں اس ہیبت انگیز مگر روم روم میں میٹھی میٹھی سی تھکن بھر دینے والے طوفان کے گزر جانے کے بعد اپنی شکستوں سے چور سوچتا رہ گیا کہ آکرتی میں وہ کونسی مخفی قوت تھی جو مجھ میں نہ تھی آکرتی میری جگہ اور میں آکرتی کی جگہ کیوں نہ ہوا مگر وہ اپنے گھنے بال پسینہ سے تر میرے سینے پر بکھرائے اپنی مانوس آواز میں جو پچھلی آواز سے حیرت انگیز طور پر کوئی مماثلث نہیں رکھتی تھی کہہ رہی تھی۔

''کیا تم اپنے نام کا روضہ بنوانا چاہتے ہو کہ اس پر عرس ہو، چادریں چڑھائی جائیں۔ اتنے بھولے کیوں ہو تم؟ تم قوّال ہو ولی نہیں ہو، سب کو سب کچھ نہیں ملتا قوّال کو اپنی پشت پر کچھ تالی بجانے والے چاہیئے۔ پہلے قوال کے سُر ٹھیک کرلوں پھر تالی بھی بجاؤنگی۔ بوند بھر زندگی پانے والے انسان کی کائنات میں جو کچھ غیر محسوس ہے اسے محسوس بنا دینے والی اس رات کا تمکو شکر گزار ہونا چاہیئے۔''

مجھے لگا کہ میری زندگی میں آئے زلزلوں کا ملبہ ہٹنا شروع ہو گیا اسکی لاشوں کی شناخت وہ شائد بہت پہلے ہی کر چکی تھی وہ انھیں کتوں کی طرح دانتوں سے کھینچ کھینچ کر ان کی اجتماعی چتا کو آگ دیتی رہی۔ اور وہ کالی رات جسکی دم بہ خود ساعتیں دانتوں میں انگلی دبائے یہ سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ اس اماوس کی رات کی کوکھ نے میرے لئے زندگی کی نئی بشارتوں، نئے سکھ اور نئے زلزلوں کی سوغاتوں کے جنم دینے والے امکانات پالنا شروع کر دیئے۔ تب مجھے یاد آیا کہ آکرتی نے مجھے اس چڑیا کی رنگت کا پھول کیوں دیا تھا جو زلزلے کی آہٹ پہچان لیتی ہے۔ لیکن میں تو آکرتی کے لائے زلزلے کے بعد ہی اسے پہچان پایا تھا۔ اُس دن زندگی میں پہلی بار مجھے یہ انمول تجربہ ہوا کہ ایک عورت بادِ صبا کو مہکتا ہوا جانفزا جھونکا بھی ہے اور شجر، حجر، دریا،

پہاڑ، پُل اور محلات کو مسمار کردینے والا آتش فشانی لاوا بھی اور پھر اُس بنجر سے دوبارہ از سر نو گلابوں کی فصل لہلہانے والی بادِ بہاراں بھی۔ لیکن وہ بادِ بہاراں ابھی ٹھیک سے تھم بھی نہ پائی تھی کہ آکرتی نے خود کو میری باہوں میں سے چھڑالیا۔ چادر بدن پر ڈالی اور کھڑکی پر جاکر کھڑی ہوگئی۔ چوروں کی طرح آہستہ سے اسکے پٹ کھولے باہر کے شدید اندھیرے میں کچھ ٹٹولتی رہی پھر پلٹی، مجھے دو پل دیکھا اور بولی ''میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ راستے میں اس کھڑکی تک کسی نے لگاتار میرا پیچھا کیا تھا۔ خوف سے میرے پیر لڑکھڑانے لگے تھے'' پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''کیا کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا اگر یہ کھڑکی بند ہوتی؟ میں جو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا یہ سن کر چونک پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھوں وہ کھڑکی بند کرکے پھر میرے پہلو میں دراز ہوگئی۔ اس وقفے میں ایک پُراسرار خاموشی پھیل چکی تھی۔ یکا یک ایک مدھم سی سسکی سنائی دی میں نے سر اُٹھا کر اپنے پہلو میں دیکھا۔ آکرتی تکیئے میں منہ دیئے رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا

''اتنا تو تم بھی مانتے ہوگے کہ زندگی میں ایک کھڑکی ضرور کُھلی رکھنا چاہئے۔'' پھر اس نے مجھے اپنی باہوں میں لے لیا۔

پھر اُس رات کی صبح ہوئی تھوڑی تشویشناک صبح۔ آکرتی نے رسٹ ہاؤس کی ایک خواب گاہ میں کسی حاکم کی گود میں اپنی نیم برہنہ کھنچی گئی تصویر اخباروں کو دے دی تھی وہ بھی کیمرے میں بند اس روداد کے ساتھ جس میں میڈم ایٹ نے آکرتی کو رسٹ ہاؤس میں خود کو سپرد کردینے کے لئے پابند کیا تھا۔ میں نے خاموشی سے سب کچھ پڑھ لیا، میرے پاس آکرتی کو یہ بتانے کے لئے درست الفاظ نہ تھے کہ اب کوئی کسی کا مستقل حریف نہیں رہ گیا ہے مگر وہ معاشرے کی پریشانیوں سے خود کو جوڑے رکھنا چاہتی تھی۔

ان اخباری دھماکوں سے میڈم کی لابی حرکت میں آگئی تھی، ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی جگاڑ شروع ہوگئی۔ پاور اسٹرکچر اپنی صحت کے لئے اپنی غذا Manupulate کرنے لگا۔ اب میڈیا میں آکرتی دلت دشمن تھی، اونچی ذات والوں کی بدخصلت ایجنٹ تھی، ہمارے لئے

جہاں اور مشکلیں تھیں ان میں سے یہ بھی ایک مشکل تھی کہ ہم اپنے عہد اور اپنی دنیا کو وہ جیسی بھی بُری بھلی تھی چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ میڈم نے دن دہاڑے بھرے مجمع میں یہ اعلان کیا کہ باباصاحب کی ہی بددعا تھی جس سے آکرتی کا سب کچھ زلزلے کی چپیٹ میں ختم ہوگیا۔

جہاں بھی جو کچھ ہماری پسند کے خلاف ہو رہا تھا ہمارے پاس اسے ٹھیک کرنے کا کوئی وسیلہ نہ تھا البتہ میڈم کے اس حملے کے جواب میں آکرتی کی جانب سے 1934 کے قیامت خیز زلزلے سے بہار کی تباہ کاری کا جو چشم دید احوال اپنی خودنوشت ''میری کہانی'' میں جواہر لال نہرو نے لکھا تھا اسکا یہ اقتباس شائع ہوگیا۔

''میں زلزلے کے علاقے میں دورہ کر رہا تھا، مجھے گاندھی جی کا یہ بیان پڑھ کر سخت صدمہ ہوا کہ زلزلہ چھوت چھات کی سزا ہے۔ انھوں نے ایسی بات کہی کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے ...... یہ کہنا کہ انسانی رسوم یا کوتاہیوں کے کوئی اثرات سطح ارضی کی حرکت پر پڑیں گے، سخت حیرتناک ہے۔''

ہم دونوں اب ساتھ ہی رہ رہے ہیں، آکرتی سے میری وابستگی اسکی پہل کا بخشا ہوا ایک تحفہ تھا۔ ہمارے رشتے کنکریٹ کے بنے نہیں ہیں مگر گھر کنکریٹ کا ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے زلزلے کے بغیر بھی موت پاتال میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ ہم دونوں اپنے لان میں روز ہی صبح کچھ لوگوں کی پھینکی ہوئی غلاظت سے بھری مٹی کی ہانڈیاں جو پھوٹ کر محنت اور توجہ سے اگائی گئی نرم اور ہری گھانس پر بکھر جاتی ہیں گھانس کو غلاظت کی تیزابیت سے جلنے سے بچانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہیں پھر مٹی کے تیل اور ڈبل روٹی کی اپنی اپنی جستجو کے ساتھ زندگی کے چھوٹے بڑے زلزلوں کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ ساری دنیا ہی ہمیشہ سے زلزلوں کی چپیٹ میں ہے۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

دہلی

۶/ دسمبر ۲۰۰۱ء

ڈیر اقبال مجید السلام علیکم

------بات یہ ہے کہ اب شعر و ادب پر لکھنے کی تحریک اور ترغیب نہیں ہو رہی۔ عجیب سی بیزاری پیدا ہو گئی ہے۔ ہاں کچھ دوسرے مسائل اور دوسرے موضوعات پر لکھنے کی خواہش زور پکڑ رہی ہے جیسے قدیم ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی اساطیر (ان سے میں تاشقند میں خاصہ مانوس ہو گیا اور کئی لکچر بھی دیئے۔) میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب، فلسفہ، ادب اور علم الاصنام کو نظر انداز کر کے اچھا نہیں کیا۔ وسطی ایشیا ہو، انڈونیشیا ہو یا ایران اور دوسرے ممالک وہاں کے مسلمان ماقبل اسلام کی اپنی تہذیبی روایت پر فخر کرتے ہیں۔ بہر حال یہ لمبی بحث ہے----------

تمہارا

قمر رئیس

چراغِ آرزو

چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر کٹتا تو خربوزہ ہی ہے۔ منی بیگم کی گنجان اور گندگی سے ابلتی گلی کے ہر گھر میں خربوزے رہتے تھے جن پر چھری گرتی یا جو چھری پر گرتے، کٹتے اور مرتے وہی تھے۔ منی بیگم کا میاں ذات کا سید اور پیشے سے ایسا درزی تھا جو سڑک کے کنارے مشین رکھ کر کپڑے سیتا کہ دکان نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا کہ اسکی نیم دیوانگی کے اُس زمانے میں جب وہ کمر تک برہنہ ہو کر شاہ مینا صاحب کے فقیروں کی لائن میں بیٹھ کر لنگر کھانے لگا تھا اسکی وفا شعار اور اللہ میاں کی گائے جیسی صابر اور شاکر بیوی نے ہر طرح کی خدمت انجام دی۔ منی بیگم کی ایک منہ بولی خالہ بھی تھیں۔ مالدار، صاحب حیثیت، نجیب الطرفین اور خدا ترس۔ منی بیگم کی مرحوم والدہ نے انھیں اپنی بہن بنایا تھا اور منہ بولی بہن نے بھی دل ہی دل میں اس لئے بہن بن جانا قبول کر لیا تھا کہ منی بیگم کی والدہ غریب اور بے سہارا تھیں مگر نوحے اچھے پڑھتی تھیں اور مالدار منہ بولی بہن کو ان کے ساتھ خدا ترسی کا سنہرا موقعہ حاصل ہو سکتا تھا کیونکہ خدا ترس عورت نے اپنے زمیدار خاندان میں بزرگوں کو ایسی کفالت کرتے اور عزیزوں سے بڑھ کر پیش آتے دیکھا تھا۔ منی بیگم کی منہ بولی خالہ یعنی انکی مرحوم ماں کی منہ بولی بہن، نامی گرامی کوٹھی میں رہنے والے نامی گرامی حکیم شجاعت حسین کی بیوی تھیں۔ منی بیگم زیادہ تنگی میں اپنے میاں کا گھر چھوڑ، میاں کا بار کم کرنے کے خیال سے اکثر عالی شان کوٹھی میں اپنی منہ بولی خالہ کے پاس پڑی رہتی کیونکہ منّی بیگم کی ضعیف والدہ کافی پہلے اپنی چھوٹی بیٹی کو جو خوبصورتوں میں شمار ہوتی تھی کی شادی کھاتے پیتے گھر میں کر کے اپنے بیٹے کے پاس پاکستان سدھار چکی تھیں۔

اب ٹوٹے پھوٹے میاں کے ساتھ ایک ٹوٹا پھوٹا ٹھیکرا تھا یا پھر انکی منہ بولی خالہ کی شاندار کوٹھی جہاں سے منی بیگم کو مٹھی بند کر کے زکوٰۃ مل جاتی جسکی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

لیکن اُس دن منی بیگم کے ہوش اُڑ گئے جب انھیں یہ بھنک لگی کہ حکیم شجاعت حسین کوٹھی بیچ رہے ہیں۔اس کوٹھی کے مکینوں سے ان کے دل کو بڑی تقویت تھی۔ پھر یہ بھی سنا کہ حکیم صاحب اپنی اولادوں کے پاس لندن منتقل ہو جانے کے منصوبے بنا رہے ہیں، انھیں لگا کہ انکا خربوزے جیسا وجوداب چھری پر گرنے والا ہے۔اس دن تن بہ تقدیر کوٹھی سے نکل کر جب وہ اپنی گلی کی بوسیدہ اور زبوں حال دیواروں کے درمیان سے گزریں جہاں کچھ خربوزے کنکوے کا مانجھا سُوت کر پیٹ پالتے تھے تو انھوں نے سوچا جو خدا کو منظور ہے وہ ہو کر رہے گا۔منی بیگم نے حکیم صاحب کی کوٹھی میں روزہ نماز، غوطہ طہارت اور دین کی باتیں ہی نہیں سیکھی تھیں بلکہ وہاں کی عورتوں کی غیرت اور شرم کے ساتھ نیک نفسی اور خطا کاری پر چشم پوشی بھی سیکھی تھی، وہ سلیقہ اور نفاست کا معیار بھی اخذ کیا تھا جو اس بڑے گھر میں رائج تھا، وہ تہذیب اور اخلاق جو خاندانی طور پر ان کے خون میں تھا اسکی تربیت بھی اس کوٹھی نے کی تھی۔وہ شعر و شاعری کی محفلیں، مسالمے، عزاداری، دستر خوان، نذر و نیاز، دعوتیں، مہمان نوازیاں، وضع داریاں اس کوٹھی کے آنگن میں کھلنے والے گلابوں جیسے تھے جنکی خوشبو منی بیگم کی مشامِ جاں میں بھی مہکنے لگی تھی۔

ایک دن وہی ہوا جس کا منی بیگم کو ڈر تھا، کوٹھی کے مکین سب بیچ باچ کر چلے گئے پھر اسکے بعد منی بیگم کی زندگی میں خربوزے والی گلی تھی اور ان کا سودائی میاں اور سر چھپانے کو مرحوم ساس کا چھوڑا ہوا ٹوٹا پھوٹا ٹھیکرا جسکے ایک حصے میں چمگادڑ رہتے اور دوسرے حصے کے بالا خانے کے برآمدے میں جنات۔انکا زیادہ وقت اسی برآمدے میں گزرتا۔ نیچے کوٹھری نما باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر جب اوپر برآمدے میں آتیں تو دیکھتیں کہ نماز کی چوکی جو سلیقے سے انھوں نے بچھائی تھی زمین پر پہلو کے بل کھڑی ہوئی ہے اور اس پر بچھی دری فرش پر پڑی ہے یہ دیکھ کر وہ مسکراتیں پھر نرمی سے کہتیں

''بھائی صاحب! یہ مذاق تو اچھا نہیں ہے۔''

پھر وہ برآمدے سے ملحق چھوٹے سے آنگن میں قلعی دار نقشیں لوٹے سے وضو کرنے بیٹھ جاتیں وضو سے فارغ ہو کر جب کھڑی چوکی کو دوبارہ بچھانے کے لئے پلٹتیں تو دیکھتیں چوکی قرینے سے پھر بچھی ہوئی ہے اور دری وغیرہ اپنی جگہ پر ہے۔ وہ زیر لب مسکراتیں اور نماز

پڑھنے کھڑی ہو جاتیں۔

وہ اکثر شوہر کے لئے دوا لانے خیراتی اسپتال پیدل جاتیں۔ برقعے کے اندر پسینے سے بھیگی واپس آتیں دوا دیکر اوپر لپکتیں جہاں ان کا پاندان تھا۔ چاندنی بچھے تخت پر گاؤ کے سہارے بیٹھ کر پاندان کھولتیں، انھیں لگتا جیسے کوئی پہلو میں کھڑا ہاتھ کا پنکھا جھل رہا ہے، پہلو کی دیوار میں ایک روشندان تھا جس سے ہوا کے جھونکے ہی نہیں آتے تھے بلکہ گھر کی دیوار کی بغل سے لگے قدیم امام باڑے سے محرم کے عشرے میں ممبر پر مجالس پڑھنے والے ذاکروں کی آوازیں بھی سنائی دیتیں کیونکہ ایک لاؤڈ اسپیکر کا منہ محلے کے خربوزے اُس روشندان کی جانب رکھواتے تھے تاکہ ان کے گھروں کی عورتیں منی بیگم کے برآمدے میں جمع ہو کر مجلس سُن سکیں۔ منی بیگم کو اپنے پسینے پر اتنے قریب سے ہوا کا جھونکا لگا تو انھوں نے سینے پر سے دوپٹہ ہٹا کر تخت پر ڈال دیا اور منہ میں پان دبا کر اور گاؤ پر سر ٹیک کر برآمدے کی چھت کی بوسیدہ دھنیوں کو تکنے لگیں۔ داہنے پہلو کی دیوار پر طاق تھا جس میں چراغ ٹھنڈا پڑا تھا اور آٹے پر کھڑی کی گئی پچھلی شام کی اگربتیاں اپنی راکھ کو سر پر لئے آدھی ادھوری کھڑی تھیں انھیں یاد آیا کہ پچھلی شام انھوں نے چراغ جلا کر باور کراتے ہوئے کہا تھا:

''دیکھیے ہم کبھی ناپاک نہیں رہتے، چوبیس گھنٹے غوطہ طہارت کا خیال رکھتے ہیں۔''

منی بیگم کی سفید پوشی کی مشکلات کی آہٹیں تو پہلے ہی آنا شروع ہو گئی تھیں کہ ایک صبح انکا سیدزادہ میاں جسکے گالوں میں گڑھے پڑ چکے تھے اور سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں منی بیگم کو جگائے بغیر اور اُن سے پانی مانگے بغیر کھلی آنکھوں سے مردہ پایا گیا۔

میاں کے مرنے کے بعد ایک شام وہ چراغ جلا رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا کہ دلّی سے کوئی آیا ہے۔ دلّی میں ان کی چھوٹی بہن رہتی تھی جس نے کسی کے ہاتھ منی بیگم کو کچھ رقم بھیجی تھی انھیں پہلی بار بہن کی جانب سے کچھ رقم ملی تھی، ہاتھوں میں لفافہ لئے وہ چکرائی سی انگنائی میں کچھ دیر کھڑی رہیں پھر تیزی سے زینہ پر چڑھیں اور طاق کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اور لفافہ دونوں ہاتھوں سے آگے بڑھاتے ہوئے کہہ اُٹھیں

''یہ دن نہیں دیکھنا چاہتی، چھوٹوں کا محتاج نہیں ہونا چاہتی۔'' وہ دیر تک روتی رہیں اور

طاق کا چراغ ان کی سسکیوں کا ارتعاش اپنی لو کے ارتعاش میں سمو کر جلتا رہا۔

منی بیگم کیسے عورتوں کے کپڑے سی کر تخت پر اجلی چاندنی بچھاتیں، چٹنی سے روغنی روٹی کھاتیں، طاق میں گھی کا چراغ اور خوشبو جلاتیں، لباس اور بستر کو اجلا رکھتیں پان ڈلی کا خرچ لفافے بنا کر نکالتیں اسکا حساب نہ کوئی مانگنے آتا نہ وہ کسی کو دیتیں۔

وہ جمعرات کی شام تھی، منی بیگم لکھوریوں کے ٹوٹے پھوٹے گھر میں یکہ وتنہا طاق میں چراغ جلا چکیں تو انھیں لگا کہ سفید انگرکھا پہنے، چکن کی نازک بیل کڑھی دوپلی ٹوپی لگائے ان کے منہ بولے خالو حکیم شجاعت حسین پہلو میں کھڑے پان مانگ رہے ہیں، منی بیگم کا بدن یکایک تعظیم سے اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا، جلدی سے ہاتھوں نے دوپٹے سے سر ڈھکا، ایسا معاملہ فہم، منصف مزاج، اقربا پرور اور نرم دل انسان فلک نے ان سے چھین لیا تھا۔ جیسے ہی وہ مطب سے اُٹھ کر گھر آتے تو فرماتے منی بیگم پان کھلائیے نا، منی بیگم گلوری بنا، طشتری میں رکھ کر پیش کر دیتیں، وہ جھک کر آداب کرتے جیسے سارا بدن آداب کر رہا ہو، اتنا بڑا آدمی جسکا شہر میں شہرہ تھا اور جسکا منی بیگم کی کفالت میں ہاتھ تھا ایسا مؤدبانہ آداب کرتا تو وہ فرطِ جذبات سے کھل اُٹھتیں، رُندھے گلے سے ڈھیروں دعائیں دیتیں حکیم صاحب نے بھی منی بیگم کے چہرے پر خوشی سے خون چھلکتے دیکھا تو روز کا ہی ورد بنا لیا، گھر میں قدم رکھتے ہی منی بیگم سے پان کی فرمائش کرتے، پان ملتے ہی آداب بجالاتے اور ایسی دولت سے ایک بھولی سیدانی کو مالا مال کر دیتے کہ غریب کو اسے رکھنے کی جا نہ ہوتی۔ وہ گھنٹوں ایسی سرمستی میں محو رہتیں جو دنیا کی کوئی دولت نہ دے سکتی تھی۔

منی بیگم کو چالباز اور کمین دنیا کی نہ تو خبر تھی نہ تجربہ، وہ تو پیدائشی بھولی تھیں، جوانی کے زمانے میں ایک بیوہ مگر آفت کی پرکالہ پڑوسن جس پر جوانی پھٹی پڑ رہی تھی ان کے میاں کو ہڑپنے کے چکر میں سلائی سیکھنے کی آڑ لیکر جب دیکھو آنکھ مٹکا کیا کرتی۔ آنگن میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے وہ منی بیگم کو زمین میں بچھ کر 'باجی آداب' کے ہار پھول سے نوازتی، اس آداب پر منی بیگم کی باچھیں کھل جاتیں مگر آنکھوں پر پردے پڑ جاتے، پھر غریب یہ بھی نہ دیکھ پاتیں کہ چپکے چپکے دن دہاڑے گھر کی کس دیوار میں سیند لگ رہی ہے۔ قریب تھا کہ درزی پھنس جاتا کہ

اسے مالیخولیا کا پہلا جھٹکا پڑا اور بیوہ اپنے راستے ہو لی، انھیں دنوں منی بیگم کو احساس ہوا تھا کہ اوپر کے برآمدے میں جناتوں کا سایہ ہے بار بار وہاں خس کی خوشبو آتی تھی، شوہر کی بیماری کے لئے وہ دعا تعویذ تو کر ہی رہی تھیں طاق میں چراغ اور اگر بتی بھی جلانا شروع کر دی۔ کسی عورت نے مشورہ دیا کہ طاق کو سلام کر لیا کرو تو تُنک کر بولیں

''اے مجھے کیا پتا کہ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں یا چھوٹے۔''

منی بیگم کی اولاد کوئی تھی نہیں،، بہن پردیس میں، ٹوٹا پھوٹا گھر اکیلی جان، رشتے کا ایک بھائی جو نانبائی کے یہاں شیر مال پکاتا تھا موقعہ دیکھ کر مع بیوی، بچوں کے گھر میں گھس آیا۔ منی بیگم نے سوچا چلو تنہائی دور ہوئی اس چلتے پرزے نے دھیرے دھیرے سارے گھر میں پیر پھیلانا شروع کر دیئے اور مکان میں کہیں کہیں مرمتیں بھی کرانے لگا۔ محلے کے ایک جہاندیدہ بزرگ نے یہ خبریں دہلی میں منی بیگم کی بہن کے پاس بھیجنا شروع کر دیں۔ منی بیگم کا بہنوئی وکیل تھا اسے فکر ہوئی کہ بھولی بھالی منی بیگم کہیں اپنے موروثی ٹھکانے سے بے دخل نہ کر دی جائیں، ان پر زور ڈالا گیا کہ انکی اکیلے رہنے کی عمر نہیں مکان بیچ باچ کر بہن کے پاس آ کر رہیں، منی بیگم اپنا ٹھکانا چھوڑنے کے خیال سے ہی ہولِ دل میں پڑ جاتیں۔

ایک دن اندر سے ٹوٹی ہوئی اور مضمحل منی بیگم غوطہ طہارت سے فارغ ہو کر مغرب کے جھٹپٹے اور برآمدے کے سناٹے میں طاق کا چراغ روشن کر رہی تھیں کہ ٹھیک ان کی آنکھوں کے سامنے طاق کی پیٹھ شق ہو گئی اور طاق کے اندر ایک مُوکھا کھل گیا، انھوں نے موکھے میں جھانکا تو لو دیتے چراغ کے اُس پار انھیں حکیم صاحب کا مردان خانہ نظر آیا، دیکھا مسند پر سرخ سرخ گالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والے جوش ملیح آبادی بیٹھے ہیں اور ان کی شیروانی دیوار کی کھونٹی پر ٹنگی ہے۔ وہ کرتے کی آستین چڑھائے شعر پڑھ رہے ہیں اور کرسی نشین حکیم صاحب پر ایک وجد کا عالم طاری ہے۔ یکبارگی جوش کی گرجتی آواز کانوں سے ٹکرائی ''ملاحظہ فرمائیں یہ آگ کہاں کہاں جلوہ فگن ہے''، پھر وہ آنکھیں بند کر کے اشعار پڑھنے لگے۔

خون کی گردش میں غلطاں نبض کی رو میں رواں

تازہ صبحوں میں عیاں، کجلائی راتوں میں نہاں

شمع کی ضو میں یقیں، گرداب کی رو میں گماں
آگ حرفِ اولین خطبۂ خلّاقِ جاں
ہاں نخستیں شمع جاں افروز دل کے طاق کی
سب سے پہلی مسکراہٹ لیلیٰ آفاق کی

ہائے وہ شعری محفلیں عورتوں کا دروازوں پر کان لگانا، مُدارات کا سامان بھی باورچی خانے سے بھاگ کر پہنچانا، وہ سب یاد آیا تو منی بیگم کی آنکھیں چھلک آئیں، ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر طاق میں جھانکا تو تب تک طاق کی دیوار برابر ہو چکی تھی۔ وہ طاق کے سامنے کھڑی رہ گئیں اسی وقت کانوں میں ایک پرکشش مردانی آواز کے مہذب لہجے نے سرگوشی کی۔

''آج ہمیں بھی پان کھلائیے''، سرگوشی سنی تو ہاتھ پیر پھول گئے، ادھر اُدھر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے ایک پان غوطہ کر کے اہتمام سے لگایا اور کپکپاتے ہاتھ سے جس پر سوکھی نسوں کا جال اُبھر آیا تھا گلوری طاق میں رکھ دی کسی نے تشکر کے ساتھ بڑے ادب سے کہا 'آداب' منی بیگم دھک سے رہ گئیں، دل اچھل کے جیسے باہر آ گیا، من من بھر کے پیر جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ پھر تو منی بیگم ہر جمعرات کو ایک پان طاق میں رکھنے لگیں اور ہر بار انھیں سنائی دیتا 'آداب' جو انکی روح میں ایک گونج کی طرح انھیں مسرت سے شرابور کرتا ہوا اترتا چلا جاتا اور وہ فرش پر بے سُدھ ہو کر غشی کے عالم میں دراز ہو جاتیں۔ انکی ایک دوست تھی کلثوم، زنانے جلوس میں عشرے کے دن کربلا میں سر پر قُمہ لگا کر خود کو خونم خون کر لیتی تھیں انھوں نے ایک دن ٹوکا۔

''اے تم طاق روشن کر کے منّت مراد بھی مانگتی ہو کہ نہیں۔؟ منی بیگم ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ انھوں نے زندگی میں کبھی منہ پھوڑ کر کسی سے کچھ نہ مانگا تھا، تنک کر بولیں

''لو۔ میں کیوں مانگوں؟ حاجت مند کی حاجت جسے سمجھنا ہو سمجھے۔ میں کیوں بتاؤں۔'' منی بیگم کے ساتھ بچپن سے ہی ایسا ہی تھا۔ اپنی ماں سے بھی دل کی بات کبھی نہ بتائی، توقع کی کہ ماں ان کی حاجت اپنے آپ سمجھ لیں گی، شوہر من چاہا کام نہ کرتا تو امید کرتیں کہ ابھی نہیں تو بعد میں کر لے گا۔ کہاں سے سیکھا تھا یہ انتظار انھیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ مگر ایک بات اب منی بیگم کو مارے ڈال رہی تھی، ساری زندگی جس مکان میں رہیں اسے بہن اور بہنوئی اب

بکوانے کے درپے تھے۔ منی بیگم نے بہت غور وخوص کر کے طاق سے مخاطب ہونے کا قصد کیا۔ جو کہنا تھا اسکو دو سوالوں کی شکل دی اور ایک جمعرات جب چراغ جلایا تو ہمت کر کے کانپتی آواز میں پوچھ لیا۔

''آداب تو کرتے ہیں، سامنے بھی آئے۔ آپ خواب ہیں کہ حقیقت؟''

پوچھنے کو پوچھ تو لیا مگر فوراً ہی بدن میں جھٹکا لگا، کانوں میں حکیم صاحب کا وہ جملہ سنائی دیا جو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

''جس طرح لکھوری کی یہ دیوار حقیقت ہے ویسے ہی دلوں میں اُٹھتے جذبات بھی حقیقت ہیں ایک دکھائی دینے والی حقیقت ہے دوسری مخفی رہنے والی حقیقت، لیکن دونوں میں روح مشترک ہے۔'' اس پر بیوی کا حسب معمول جواب

''اے ہم تو نرے جاہل ہیں، یہ سب باتیں کیا جانیں'' پھر حکیم صاحب کا مسکرا کر کہنا

''جو مخفی ہے اسکے لئے ہراساں نہ ہوں، یہ تعظیم کی جا ہے کہ ہم ہر بات نہیں جانتے۔''

حکیم صاحب کی یاد آئی باتوں نے دل کو تقویت دی تو منی بیگم نے جلتے چراغ کو نظر بھر کر دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائیں۔

''یہ مکان بکوانے کے مشورے ہو رہے ہیں، پھر یہ چراغ کیسے جلاؤنگی۔'' یکایک انھیں لگا کہ کوئی نورانی سایہ سا چراغ کے دھویں میں لہرایا اور مشفقانہ لہجے میں بولا۔

''کچھ باتیں ہمیشہ ہوتی رہیں گی۔ جہاں آپ کو بلایا جا رہا ہے وہاں بھی طاق مل جائیں گے۔''

منی بیگم میں اس پرچھائیں زدہ منظر کی تاب نہ رہی۔ غش کھانے کو تھیں مگر جسم میں ابھی جان تھی خود کو سنبھال لیا۔

جلد ہی منی بیگم کی بہن اور بہنوئی نے جیسے تیسے انکے پاس پڑے رہ کر مکان کا اونے پونے تیا پانچا کر دیا۔ عزاداری کے علم پٹکے درگاہ حضرت عباس بھجوا دیئے۔ کباڑی بلا کر گھر صاف کر دیا اور ایک ٹرنک کے ساتھ منی بیگم کو دہلی لے آئے۔ نئے گھر میں منی بیگم آئیں تو دانتوں کے نیچے انگلی دبا لی، نہ غوطہ نہ طہارت، نہ سجدہ گاہ نہ تسبیح، آئے دن کشادہ ڈرائنگ رام میں ایمپلی فائر پر شور مچاتے

فلمی گانوں پر ادھر اُدھر کی لڑکیاں ان کی بہن کی کچی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ بے شرمی کا لباس پہنے کولھے اور کمر مٹکاتیں، پھر Pizza کھاتیں اور کوک پیتیں۔ دو چار بار تو انھوں نے سانس روک کر اور آنکھیں پھاڑ کر ہونق چہرے کے ساتھ وہ سب دیکھا پھر اپنے چھوٹے سے کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ کھانا پکانے والی کا پھیکا سیٹھا اور اُبلا کھانا کچھ دن تو چُپ چاپ کھالیا، پھر جی نہ مانا تو باورچی خانے میں گھسنے لگیں اور پکانے والی کی ٹوکاٹوکی شروع کردی، وہ تنک مزاج عورت پہلے ہی سب کے نخروں سے عاجز تھی ایک دن گھر بیٹھ رہی۔ ایسا اور بھی دو ایک بار ہوا جب صاحب خانہ کو منی بیگم کے سبب نئی ملازمہ تلاش کرنا پڑی اور جب تک کوئی نہ ملا چھوٹی بہن کو خود چولھا چکی میں لگنا پڑا آخر کو تنگ آکر منی بیگم کو باورچی خانے میں داخلے کی ممانعت کردی گئی۔ بڑی بہن نے سوچا کہ گھر میں ہیں تو چھوٹی کا کچھ سہارا بنیں، رضائیاں اور بچوں کی توشکیں سینا شروع کردیں، دن دن بھر سوئی دھاگہ لئے آنکھیں پھوڑنے لگیں۔ جب آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں تو چھوٹی بہن نے یہ کہہکر سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا کہ ان دقیانوسی چیزوں کی جگہ گھر میں نہیں بازار کے نرم کمبل اور فوم کے گدے استعمال ہوتے ہیں۔ منی بیگم کچھ نہ بولیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔ انھیں گھر میں آئے کئی مہینے ہوگئے تھے مگر انھیں نہیں یاد تھا کہ کسی نے انکو آداب کیا ہو، لڑکیاں تو گھوڑیاں ہورہی تھیں، ایک دن پان لگا رہی تھیں سوچا ایک پان کی گلوری بہنوئی کو بھی دیں شائد جواب میں وہ آداب کرے مگر اس نے کہہ دیا کہ پان کھانے سے دانت خراب ہوجاتے ہیں۔ منی بیگم اپنا سا منہ لیکر رہ گئیں۔ انکی زندگی جیسے معطل ہوکر رہ گئی، گھر تو گھر، گھر کے مکین بھی ان کے لئے اجنبی ہوکر رہ گئے۔ کھانے کی میز پر بہن آواز دیکر بلاتی تو آکر بیٹھ جاتیں، اپنی پلیٹ میں سب سے آخر میں ڈر ڈر کر چیزیں نکالتیں، پھل آتے تو وہ ہاتھ بھی نہ لگاتیں، کہا جاتا تو عذر ہوتا کہ بچے کھائیں گے، ضد کی جاتی لے لیتیں، گھر میں چور بن کر رہتے ہوئے وقت گزرنے لگا اکیلے پن میں چھوڑا ہوا گھر یاد آتا، گھر کی گلی میں گلی ڈنڈا کھیلتے بچے یاد آتے جو انکا چھوٹا موٹا سودا سلف لا دیا کرتے تھے فلک نے ایسا رنگ بدلا کہ نہ چھت اپنی رہ گئی نہ آنگن، نہ چولھا اپنا رہا نہ جنس کی کوٹھری، بہن جو کپڑے بناتی وہ جی کو نہ بھاتے، کئی کئی دن جوڑا نہ بدلتیں، بُری بھلی جیسی بھی زندگی تھی اپنی تھی، چٹنی روٹی اور بے دودھ کی چائے ہی سہی انکی اپنی کمائی کی تھی، گھر کے کچے آنگن میں انھیں ہر

موسم اپنا موسم لگتا، ٹپکتی چھت کے نیچے پہلو بدل بدل کر رات کاٹنے میں مزہ آتا، بہن کے کمرے میں اے سی تھا اوران کے کمرے میں پنکھا مگر اسکی گرم ہوا سے زیادہ ٹھیکرے میں لو کے تھپیڑوں کا لطف انھیں یاد آتا تھا مگر وہ ایک لمبی چُپ کے ساتھ ہر موسم سہہ رہی تھیں۔ جیسے جیسے دن گزرتے ان کی چُپ کا اندھا کنواں گہرا ہوتا جاتا وہ اس کنویں میں آہستہ آہستہ کلیجہ مسوس کر کسی نالے اور فریاد کے بغیر شام کے تھکے سورج کے مانند غروب ہوتی گئیں۔ اب گراں گوشی بھی بڑھ گئی تھی اور آنکھ کا موتیا بند تیار ہو چکا تھا لیکن چُپ تھی کہ سب کو نگلتی جا رہی تھی، کچھ دن تو گھر کے لوگ کان پر منہ لگا کر اونچی آواز میں بات کرتے رہے پھر تھک کر بات کرنا ہی بند کر دی۔ تب وہ اکیلے میں بیٹھ کر خود سے باتیں کرنے لگیں۔ پیدائشی بھولا پن اب بھی انکے ساتھ تھا اس لئے سامنے کے غم تو دیکھ لیتیں مگر کوئی غم ایسا بھی تھا جو دل کے نہاخانوں میں دُبکا مسلسل ایک بے آواز گریہ کر رہا تھا اور کبھی کبھی اس خاموش گریے کی بھولی بھٹکی کوئی سسکی کانوں پر دستک دیتی تو وہ اُسے پہچان بھی نہ پاتیں۔ وہ سسکی پھر دل کے نہاں خانوں میں تھکی تھکی نامراد واپس لوٹ جاتی۔ کمر جھکنے لگی اس میں ٹیسیں اُٹھتی تھیں گھر سے ذرا دور ایک قدیم امام باڑے کے سامنے رگ و پٹھوں کے درد کا علاج بجلی کی سنکائی سے ہوتا تھا بہن نے اس کلینک میں بھیجنا شروع کر دیا واپسی میں انھوں نے امام باڑے کے اس کھنڈر کو دیکھا اسکے پہلو میں دیوار سے لگی ایک اجاڑ مسجد کا شکستہ مینار بھی نظر آیا، قدم بے ارادہ ادھر بڑھ گئے۔ آس پاس جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے تھے پھاندتی پھوندتی مسجد کے دروازے تک پہونچ گئیں۔ دروازے کی چوکھٹیں غائب تھیں، صحن میں کائی اور گھانس تھی، نیم منہدم مسجد کی دیوار پر ایک طاق نظر آیا، پپڑائے ہونٹ کھولے جہاں کھڑی تھیں وہیں سے طاق کو دیکھتی رہیں ایسا لگا کہ ٹوٹی محراب کے کھمبے سے پیٹھ لگائے حکیم صاحب کالا کرتا پہنے کھڑے ہیں، کلاوے میں نقرئی پنجتن پاک کا پنجہ گلے میں جھول رہا ہے پاس ہی سر سے چادر اوڑھے انکی بیوی کھڑی ہیں۔ جن سے وہ پوچھ رہے ہیں۔

''وہ کون ہے جو منی بیگم کی بجھی چوکی دالان میں کھڑی کر دیتا ہے۔ مجھے جواب نہیں چاہئے۔ کیا یہ دنیا اس دن خلاء میں تبدیل نہیں ہو جائے گی جب اسکی حیرتیں اس سے چھین لی جائیں گی۔''

منی بیگم اپنی آنکھیں ملنے لگیں مگر کچھ نہ دکھائی دیا۔ وہ اوبڑ کھابڑ زمین پر ٹٹول ٹٹول کر پیر رکھتے ہوئے واپس ہوگئیں۔ گھر آئیں تو کسی نے کچھ نہ پوچھا، ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ مہمان نہیں ہیں، اپنی ضرورتوں کا خود خیال رکھیں۔ انکی سب سے بڑی ضرورت ان کا پاندان تھا، گھر کا سودا لانے والا پان لانا بھول جاتا وہ پان چھوڑ کر کتھا ڈلی اور چونے کے ساتھ تمبا کو کھانے لگیں۔

ایک دن وہ ہانپتی ہوئی اسٹور کی صفائی کر رہی تھیں کہ انھیں جوتوں کے پرانے دفتی کے ڈبے میں مٹی کے کچھ کورے چراغ دکھائی دیئے، شائد بچوں نے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی دیوالی میں چراغاں کے لئے منگائے تھے، انھوں نے ایک چراغ کو دھو کر غوطہ کیا اس میں روئی کی بتی ڈالی اور تھوڑا گھی رکھا ایک ماچس شلوکے کی جیب میں ڈالی پھر کلینک کے لئے جاتے وقت چراغ کو دوپٹے کی اوٹ میں چھپا گھر سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ واپس لوٹ آئیں، چراغ اسٹور میں چھپا کر رکھ دیا۔ کلینک سے واپسی پر تمبولی کی دکان سے ایک بڑا سا پان خریدا اور گھر آ گئیں۔ اس رات منی بیگم کے دل کی عجیب کیفیت تھی رات آئی تو نیند غائب تھی دو کا عمل ہوگا کہ ایک بے چینی کے ساتھ کھڑکی پر آ کر کھڑی ہوگئیں باہر سناٹے کے سینے پر بچھی ایک سنسان سڑک تھی۔ دیوار سے لگے دیوان پر لیٹ گئیں، کھڑکی سے دور تک کھلا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں لگا کہ آسمان پر ایک جانب شاہ مینا صاحب کا مزار ہے جسکے باہر سڑک کے کنارے ایک قطار میں غریب اور محتاج بیٹھے ہیں انھیں میں ایک کوڑھی عورت کے پاس وہ بھی بیٹھی ہیں اور ان کا آدھے دھڑ سے ننگا اور سودائی شوہر ان کی پیٹھ کے پیچھے سے دونوں ہاتھ گردن میں ڈالے منت کر رہا ہے کہ وہ اسکے ساتھ چلیں اسی وقت آسمان پر موٹے موٹے بادل آگئے اور نسیم سحری نے منی بیگم کو دیوان پر ہی تھپک کر سلا دیا۔

دوسرے دن غوطہ کئے ہوئے پان کو منی بیگم نے اہتمام سے لگایا، گلوری کاغذ میں لپیٹی اسٹور سے چراغ اور ماچس نکالی اور دو اگر بتیاں بھی۔ کلینک جانے والی سڑک کے بجائے ناہموار راستہ پار کر کے مسجد کے کھنڈر تک پہنچیں، بوسیدہ دہلیز پر کھڑی ہو کر آنگن میں اُگی گھانس پر نظر کی دیوار کی طاق کو دیکھا، ایک پیر آگے بڑھایا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر رسی جیسی کوئی چیز گھانس سے نکل کر ایک طرف سرسراتی ہوئی نکل گئی۔ ایک بار ٹھٹکیں پھر جی کڑا کر کے آگے

بڑھیں، گھانسوں پر ٹھوکریں ماریں زمین پر پیر پٹپٹائے پھر نیچے دیکھتے ہوئے طاق تک پہنچ گئیں۔ شام کے جھٹپٹے میں پہلے اگربتیاں جلا کر طاق کی بھربھری دیوار میں کونچیں، چراغ جلا کر طاق میں رکھا، پان کی گلوری چراغ کے سامنے رکھی پھر سانس روک کر اپنے روم روم کی ساری کھڑکیاں دروازے کھول کر کانوں میں کسی آواز کے رس گھولنے کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ یہ بھی بھول چکی تھیں کہ دوسرے دن وہ پان کی گلوری طاق میں یونہی رکھی ہوئی ملے گی۔ دیر تک آنکھیں بند کئے دوپٹے سے سر ڈھکے ادب کے ساتھ طاق کے سامنے کھڑی رہیں مگر انکے احساس کے کانوں نے کوئی آواز نہ سُنی۔ ایسا لگا آفاق کی ساری مخلوق بے لفظ اور بے آواز ہوگئی ہو، بدن پسینہ پسینہ ہوگیا نڈھال قدموں سے گھر تک پہنچیں

دو روز بعد جمعرات آرہی تھی منی بیگم کے دل میں پنکھے لگے ہوئے تھے، عجیب سی بدحواسی طاری تھی، اسی حالت میں دوسرا چراغ غوطہ کیا پان لا کر فریج میں چھپایا، اُسی دن انھیں اپنی دوست کلثوم کی بات یاد آئی۔

''ارے تم طاق روشن کر کے منّت مراد بھی مانگتی ہو کہ نہیں۔؟

وہ دیر تک سوچتی رہیں! دل سے پوچھا کیا مانگوں؟ کھویا ہوا گھر مانگوں؟ غیرت کی زندگی مانگوں؟ سہاگ مانگوں، آباد کوکھ یا اپنی کمائی کی چٹنی روٹی، آخر کیا مانگوں؟ یا پھر موت ہی نہ مانگ لوں۔ سوچتے سوچتے کوئی ایک چیز جسے وہ اکثر یاد کرتی تھیں دل میں مانگنا طے کر لی۔ کیسے مانگیں گی؟ کیا کہیں گی یہ بھی دل میں ٹھان لیا۔ ایسے الفاظ چنے جو کبھی زبان پر نہ آتے تھے ایسا لہجہ سوچا جو خود انکے لئے بھی اجنبی تھا۔ جمعرات آئی تو بوکھلائی بوکھلائی تیار ہوئیں، سامان چھپا کر نکلیں تو لگا سر پر چادر نہیں لپک کر چادر گھسیٹی، ایسی رفتار سے چلیں جو جوانی میں بھی نہ چلی ہوں گی۔ پھاندتے پھوندتے مسجد کا صحن پار کیا، طاق پر نظر کی، پچھلا چراغ اوندھا پڑا تھا، پان کی گلوری چڑیوں کی چونچ کی چوٹوں سے ادھڑی فرش پر چوہے کے بل کے پاس پڑی تھی۔ ٹھنڈی سانس لیکر خوشبو جلائی، نیا چراغ روشن کیا پان کی گلوری طاق میں رکھی اور ساکت کھڑی رہیں، آنکھیں بند کر کے ہمہ تن گوش ہوئیں کوئی آواز کانوں میں نہ آئی، کائنات کے ذرّے ذرّے نے چُپ سادھ رکھی تھی، اسطرح بدن سمیٹ کر واپس ہوئیں کہ کپڑوں میں سرسراہٹ

بھی نہ ہونے دی، واپسی کے لئے یوں قدم اٹھائے کہ آہٹ بھی نہ ہوئی۔ آنگن تک پہنچ کر ایک بار رکیں گردن موڑ کر چراغ کو یوں دیکھا کہ کہیں بجھا تو نہیں، اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اسی کے ساتھ کوثر و تسنیم سے دُھلی کانوں میں ایک آواز بھی۔

''بے فکر رہئے، آرزوئیں اور تمنائیں جب تک ہیں یہ چراغ بجھنے والا نہیں۔''

آواز کچھ پہچانی سی لگی تو دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ حلق خشک ہونے لگا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آنے لگا۔ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھیں، دہلیز پر ہانپتی ہوئی رکیں لگا لمبا سفر طے کیا ہے، خیال آیا کہ جو دل میں طے کیا ہے وہ ابھی مانگا کہاں ہے، پھر سوچا دینے والا خود ہی دل کا حال جان گیا ہوگا، اپنے کو سنبھالا۔ ابھی دہلیز سے قدم باہر رکھ ہی رہی تھیں کہ رگِ جاں کے قریب کسی نے کہا

''آداب۔''

اس آداب کا لہجہ اُس آداب جیسا تھا جو رخصت کے وقت کیا جاتا ہے انھیں لگا جیسے ہر طرف شہنائیاں بج اُٹھیں، ویرانے میں مہتابیاں سی چھوٹنے لگیں پوری کائنات وصال کی لے میں بہہ چلی، زمین کا خس و خاشاک جھوم اُٹھا، خود کو لاکھ سنبھالا مگر غش کھا کر دہلیز پر گر پڑیں۔ پہلے کی بات اور تھی، اب تو ان کی کفنائی ہوئی سرد چپ کے صحرا کی بھوکی دیمکیں انکے جسم کو کب کا چاٹ چکی تھیں۔ اور وہ غم تو غم خوشی بھی برداشت کرنے کی قوت کھو چکا تھا۔ شائد انھیں انکے مانگے ہوئے سے بھی کچھ زیادہ ہی مل گیا ہو۔ کیا مانگا تھا یہ تو وہی جانتی تھیں۔

شام گہری ہونے لگی تھی طاق کے چراغ کی لو میں ذرا بھی ارتعاش نہ تھا وہ مہر بہ لب مبہوت اور ایک دم ساکت کھڑی تھی۔ مگر جل رہی تھی۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

کراچی

۶/ جنوری ۱۹۹۹ء

برادرم اقبال مجید تسلیمات

۔۔۔۔۔آرٹ عام زندگی سے زیادہ پرمایہ اور پیچیدہ ہوتا ہے چونکہ اس میں زندگی کی مرقع نگاری کے ساتھ مصنف کا زاویہ نظر بھی شامل ہوتا ہے اور یہ زاویہ نظر جو ایک واقعہ، ایک کردار اور ایک منظر کو زیادہ متمول یا زیادہ غریب بنا سکتا ہے۔ تم چیزوں کو دیکھتے ہی اس طرح سے ہو کہ خول سے زیادہ گودے میں گھس جاتے ہو اور جس کے بارے میں لکھتے ہو وہ خود اپنے اندرون کو دیکھ کر اکثر شرمندہ اور بہت کم شاداں ہو سکتا ہے۔ تم انسان کے اندر چھپی ہوئی کمینگیوں کے شکاری ہو اور کبھی کبھی خود بھی بھول جاتے ہو کہ اگر یہ کام مستقل بنیادوں پر کیا جانے لگے تو اس کام میں ایک نوع کی Morbidity آجاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑا فنکار وہی ہے جو بدصورتیوں، کمینگیوں اور ناہموار رویّوں میں بھی حسن تلاش کر سکے بلکہ اس سے مڈبھیڑ کروا سکے تاکہ وہ خفت نہ ہو جو ممنوعہ علاقوں میں گھومنے والے کو جواب دہی کے عذاب سے ہوتی ہے۔ جدید دور کی ترقی پسندی میں اب ابلاغ بھی ناقابلِ ابلاغ سچائیوں کی معرفت ہی میں مضمر ہے۔۔۔۔۔۔۔

تمہارا

محمد علی صدیقی

دیوار پر جڑی تختیاں

ایک وقت تھا جب وہ عمارت ایک خاموش اور پُرسکون علاقے میں اپنے باغیچے میں ایستادہ عجیب وغریب مجسّموں کے ساتھ بڑے احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔

جب میں نے جوانی میں نوکری شروع کی تو وہاں کا پُروقار اور عالمانہ ماحول دور دور تک مشہور تھا۔ پہلی منزل پر ایک بڑا کمرہ تھا جس کے دروازے کی اوپری دیوار پر ایک لال بلب بھی لگا تھا۔ دروازے کے پاس ہی ایک بڑی موچھوں والا رعب دار چپراسی بھی بیٹھا کرتا تھا۔ اس بڑے کمرے کے کرسی نشین کے بارے میں مجھے بہت دنوں تک یہ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب آتا ہے اور عمارت سے نکل کر کب جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور سنا تھا کہ جب باہر سے کوئی سگار پیتا ہوا یا منہ میں پائپ دبائے یا چوڑی دار سفید پیجامہ اور کالی اچکن پہنے چین دار جیبی گھڑی لگائے بڑی بڑی آنکھوں والا وہاں آتا یا پھر کوئی گوری چٹی بھاری بھرکم عورت آنکھوں پر خوبصورت گاگل لگائے کندھے پر شال ڈالے بڑے تمکنت اور وقار کے ساتھ اپنے حالی موالیوں کے ساتھ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھتی تو بڑے کمرے کا کرسی نشین اپنے کمرے سے نکل کر زینے کے پاس مؤدب کھڑا ہو جاتا اور اسکا استقبال کر کے بڑے کمرے میں لے جاتا پھر دیوار کی لال بتی جل جاتی۔ شائد یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس عمارت کے بڑے کمرے میں ہر چیز کی جلالت اور توقیر کا رتبہ طے شدہ معیاروں نے مقرر کر رکھا تھا اور انھیں بدلتی ضرورتوں کے باعث بار بار نئے سرے سے متعین کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے جلدی جلدی دروازے کی دیوار پر لال بتی بھی نہیں جلتی بجھتی تھی۔

اب تو ان باتوں کو ایک زمانہ گذر چکا ہے، ان برسوں میں ایسی ہی عمارتیں اسی مقصد کے لئے تھوڑے بہت مقامی فنِ تعمیر کے فرق کے ساتھ ملک کے کئی بڑے شہروں میں بن گئی

ہیں۔ان نئی عمارتوں میں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے سبب دورے پر جانے کا موقعہ بھی مجھے ملتا رہا ہے جہاں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اندر سے ان عمارتوں کے کمرے، فرش اور غسل خانے سب ایک ہی سے تھے۔زیادہ غور سے دیکھنے پر انکشاف ہوا کہ ہر عمارت میں پنکھے ایک ہی رفتار سے چلتے تھے، کھڑکیوں کے شیشے ایک ہی جگہ سے ٹوٹے تھے اور روشندانوں سے گرا برساتی پانی ایک ہی طرح سے دیوار پر گرتا تھا، وہاں قیام کے آخری دن تک وہ نا قابلِ یقین مماثلت بھی مجھ پر واضح ہوگئی کہ ان عمارتوں میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ انکی آنکھوں کے چشمے، ان کے پہناوے بات کرنے اور سگریٹ کا گُل جھاڑنے کا انداز اور کمرے میں آکر دلیل کے بغیر دعوے کرنے والے پیغمبروں کی لنترانیوں اور آمدورفت کے باعث بار بار کمرے کی لال بتی کا جلنا بجھنا اور آخر کار فیوز ہو جایا کرنا اور پھر تمام ردیوں کی ٹوکریوں میں پھینکا ہوا سامان نازیبا، وہاں کے بہ ظاہر مہربان مگر درحقیقت ہلاکت خیز منافق سب ایک سے تھے ویسے ہی جیسے میری عمارت کے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ان سب کا لہجہ، غیبت کا طریقہ، زبان کی موقعہ پرست لکنت بھی ایک سی تھی اور یہی نہیں کونے کھدروں میں چھپے ہونٹوں پر ایک سی مسکراہٹ جمائے رکھنے والے دھیمی آواز میں بولنے والے کرتے، شیروانی اور واسکٹ کو گلے تک بند رکھنے والے مہذب دلال بھی بالکل ایک سے تھے۔

ادھر چند برسوں سے خود اپنے یہاں دیکھ رہا ہوں کہ عمارت کے اندر آنے جانے والوں کا بھیڑ بھڑکا بہت بڑھ گیا ہے۔ جہاں Please do not Spit کی تختی لگی ہے اس کونے میں پان کی پیک کے بدنما اور گندے چکتے روز بہ روز بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں، کانفرنس روم کی گیلری میں ''دھیرے بولئے'' کی تختی کے باوجود کانفرنس روم سے نکل کر بار بار کسی کو لوگوں کو چپ کرانے کے لئے باہر آنا پڑتا ہے۔ میری یہ فکر روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی کہ بار بار الماریاں خریدنے کے باوجود سیکڑوں نئی آنے والی کتابیں جو دستی بھی آتیں اور ڈاک سے بھی فرش پر پڑی رہتی تھیں پھر لائبریری میں اتنی جگہ بھی نہ رہ گئی تھی کہ انکے پٹ کھولے جاسکیں۔ آخر کو اور انھیں نشانِ افتخار دیئے جانے کے فیصلے سے پہلے ہی ان میں دیمک لگ جایا کرتی۔ اس دوران کئی بار میری ترقی ہوئی اور اب تو مجھے بڑے کمرے کے پاس ہی ایک کمرہ

دیا گیا تھا کیونکہ بار بار مجھے بڑے کمرے میں بلایا جاتا تھا۔

اسی زمانہ میں جب بڑے کمرے کے برابر میں بیٹھنے لگا تھا ہماری عمارت میں پہلی منزل پر آنے کے لئے ایک خاتون نے اُسی کرّ وفر اور شان کے ساتھ زینہ چڑھا جیسا کہ برسوں پہلے میری نوکری کے آغاز میں آنے والے چڑھا کرتے تھے۔ میں اتفاق سے اس وقت زینے کی کگار پر کھڑا کسی سے باتیں کررہا تھا۔ ستائیس اٹھائیس سال کی عمر، رنگ گورا، بال گھونگھریالے، گالوں میں قدرتی گڑھے، ماتھا کشادہ، روشن اور خوش نصیبی کی اجلی چاندنی سے منوّر، وہ جیسے ہی اوپر آئیں ان کی نظر سامنے ہی لال بلب والے بڑے کمرے کی داہنی دیوار پر پڑی جہاں اب پیتل کے حروف میں لکھی عبارت، چمچماتی لکڑی کے خوبصورت فریم میں جڑی تھی اور پیتل کے حروف براسو سے رگڑ کر چمکائے جاتے تھے۔ عورت نے اسکے سامنے کھڑے ہوکر بڑی محویت سے عبارت کو پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا ''اقتدار مقتدر کو مغرور ہی نہیں خود غرض اور جابر بھی بنا دیتا ہے۔ اقتدار انکے مفادات سے غافل نہیں رہتا جن سے اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ مقتدر کی سرشت میں قوت کا استعمال شامل ہے اور قوت کے استعمال میں بے انصافی مضمر ہے۔'' عبارت پڑھنے کے بعد عورت کی آنکھیں مسکرائیں پھر وہ پلٹ کر میری طرف آئی اور مخاطب ہوئی۔

''میں سکریٹری صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''جی میں ہی سکریٹری ہوں۔ آیئے'' میں انھیں اپنے کمرے میں لے آیا۔ بیٹھنے کے لئے کہا وہ بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولیں ''میرا نام مریم زمانی ہے۔ پیتل کے حروف میں یہ عبارت غالباً نیا اضافہ ہے'' جواب میں، میں نے انھیں بتایا کہ اب یہ عبارت ہر شہر میں جہاں جہاں یہ عمارت ہے اسکے بڑے کمرے کی دیوار پر لگا دی گئی ہے۔

''ایسا کیوں ہے۔؟ انکے سوال پر مجھے وضاحت کرنا پڑی ''یہ اسلئے کہ لوگ مقتدر سے اسکے اقتدار کو لیکر کوئی بحث و مباحثہ نہ کریں اور ملاقات سے پہلے اسکی حیثیت اور منصب کو سمجھ لیں۔'' پھر مریم زمانی نے جنھیں پینٹنگ سے شوق تھا بتایا کہ انھیں ملاقات کا وقت دیا گیا ہے۔ میں نے انکے نام کا کارڈ اندر بھجوا دیا۔ کچھ دیر بعد انھیں بلا لیا گیا۔

کئی نئی تختیاں جنھیں دیواروں پر لگنا تھا پینٹر کے یہاں سے آئی پڑی تھیں۔ انمیں سے ایک کو تو صدر دروازے پر لگنا تھا جس میں ہدایت دی کی گئی تھی ''عمارت میں حکام کو تحفے تحائف نہ پیش کریں۔'' بیسوں احکامات کی تختیاں عمارت کی اندرونی دیواروں پر جڑی جاتی تھیں۔ انمیں کئی کا پنٹ بھی کچھ ایسا اکھڑ گیا تھا کہ عبارت کا مطلب ہی خبط ہو چکا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے عمارت میں عجیب نوعیت کے بے مطلب کام بہت بڑھ گئے تھے۔ جن سے اکتا کر میں بے وقت شاعری اور وہسکی پینے لگا تھا کہ میری نظر میں دونوں ہی کام بے ضرر تھے۔ بد دلی سے میں نے ایڈمنسٹریٹر کو وہ کام سونپ دیا تھوڑی دیر بعد مریم زمانی بڑے کمرے سے مسکراتی ہوئی باہر آئیں۔ اس کمرے کی خوبی بھی یہی تھی خواتین مسکراتی ہوئی باہر نکلتی تھیں۔ جب مریم زمانی میرے کمرے میں دوبارہ داخل ہوئیں تو مجھے کچھ تعجب ضرور ہوا کیونکہ وہاں سے نکلنے والے عام طور پر سیدھے نیچے اتر جایا کرتے تھے۔ میں نے پھر بٹھایا تو وہ بولیں۔

''بھئی وہ تو بہت خوش اخلاق ہیں، میرے لئے کافی اور سینڈوچ منگائی، خود لنچ میں ککڑی اور پنیر کے قتلے کھاتے رہے۔'' میں نے انھیں بتایا کہ ڈاکٹروں نے انھیں لنچ میں صرف یہی کھانے کی اجازت دی ہے۔ پھر مریم زمانی نے خاصی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا

''انکی پیٹھ کی دیوار پر سنہری حرفوں میں ایڈورسعید کا ایک قول لکھا ہے ''دانشوروں کو مکتبی اور ادارتی منتظمین کا غلام نہیں ہونا چاہئے۔''

''جی ہاں جی ہاں'' میں نے فوراً حامی بھری اور وضاحت کر دی ''جس شہر میں بھی یہ عمارت بنائی گئی ہے وہاں کے بڑے کمرے میں یہ قول بھی چسپاں کر دیا گیا ہے۔'' یہ سنکر خاتون کے چہرے پر الجھن عود کر آئی۔ اور انھوں نے پوچھ ہی لیا۔

''لیکن کیوں۔؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''سچ تو یہ ہے کہ دانشوروں میں یہ غلامی اب شرمناک چاپلوسی کی حد تک بڑھ گئی ہے''

میرا جواب سن کر مریم زمانی کو کیسا لگا اسکا تو مجھے اندازہ نہیں لیکن اندر ہی اندر وہ اُنکی جس بات سے مرعوب تھیں اسے انھوں نے مجھ پر عیاں کر دی، یعنی انکی صاف گوئی کی بڑی تعریف کی۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے بے تکلف ہو کر مریم کو بتایا کہ انھیں بہت سے لوگ

بُرا سمجھتے ہیں لیکن وہ اپنی فطرت کی وجہ سے بُرے نہیں ہیں بلکہ اپنی حیثیت اور مرتبے کی وجہ سے بُرے ہیں اور اس برائی کی مجبوری یہ ہے کہ یہ غریب قدیم اور فطری دوستوں کو بھی ایک دوسرے کا حریف بنا کر دشمنوں کے طبقات میں تقسیم کر دیا کرتی ہے اور اسی کے نتیجے میں جگہ جگہ آپس میں اندرونی فساد ہوتے ہوئے بھی چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔" مجھے اندازہ ہوا کہ مریم بات کرتے ہوئے ایک نیم واضح پیچ و تاپ سے بھی گزر رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے ایکا ایک اُٹھیں۔ پرس سے ملاقاتی کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھا پھر میرا کارڈ طلب کیا، لمبی سی سانس بھر کر کارڈ پر نظر ڈالی اور رخصت کی اجازت لے کر چلی گئیں۔

ایک دن مریم زمانی کا فون آیا۔ اسکے گھر پر ایک مشہور پینٹر کی آمد پر اس نے ایک مختصر سی پارٹی رکھی تھی اور انکساری سے میری شرکت کے لئے بھی درخواست کی۔ بعد میں یکا یک خیال آیا کہ بڑے کمرے میں بھی فون کیا ہوگا۔ پتا لگا وہاں فون پہلے ہی آ گیا تھا لیکن وہ کہیں اور مصروف تھے۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں یہ فیصلہ انھوں نے مجھ پر چھوڑ دیا۔ یہ جان کر مجھے حیرت نہ ہوئی کہ وہ مریم زمانی اور اسکے خاندان وغیرہ کے بارے میں خاصہ جانتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ مریم دوسرے نام سے کبھی کبھی انگریزی نظمیں بھی لکھتی تھیں اور بعض موقعوں پر وہ ان سے مل بھی چکے تھے۔

پارٹی میں مریم سے ملاقات ہوئی تو یہ عقدہ بھی کھلا کہ اسکے باپ مسلمان اور ماں کرسچین تھیں۔ گھر میں دو گاڑیاں تھیں، کتابوں سے بھری ایک موروثی لائبریری تھی، خوبصورت اور کشادہ لان تھا۔ گھر کے اندر کا ماحول خوابناک تھا۔ وائلن پیانو، مرعوب کن علامتی مسیحی صلیب اور کنواری مریم کا جاذب نظر مجسمہ بڑی نفاست اور سلیقے سے آرائش کا حصہ بنائے گئے تھے۔ وہیں کشادہ اور نیم روشن دیوار کی ملگجی روشنی میں ایک پینٹنگ بھی نصب تھی جس پر اندر داخل ہوتے ہی نظر پڑتی تھی۔ سفید اور ہلکے سرمئی رنگوں کے استعمال کے ساتھ پینٹنگ اس موقعے کا دھندلایا ہوا منظر پیش کر رہی تھی جب مدینے کے کچھ مسلمان حج کا احرام باندھے ہوئے حدیبیہ کے میدان میں بیٹھے تھے اور اپنے رسول کے ہمراہ کعبے میں داخلے کے لئے قریش سرداروں کے اجازت نامے کے منتظر تھے۔ پوری پینٹنگ کی فضا یاسیت اور حزن بھرے تحمل کی سوگوار دھند میں

ڈوبی ہوئی تھی اور عنوان کے جگہ عربی خط میں ''لبیک لبیک'' لکھا ہوا تھا۔

مریم زمانی کے صنعت پیشہ باپ اودھ کے مرغوب لباس میں مہمانوں کی تواضع مغلوں کے شاہی دسترخوان کے رنگا رنگ کبابوں سے کر رہے تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی مریم زمانی کی تعلیم وتربیت ان کی ماں کی نگرانی میں اعلیٰ درجے کے پبلک اسکولوں میں ہوئی تھی اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ مریم نے اپنا اسٹڈی روم دکھایا جہاں کتابوں اور رسالوں کا بے ترتیب انبار تھا۔ میز پر رکھے کمپیوٹر کے پاس بہت سے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ کے سرنامے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔What is openion mafia۔ میں تجسس سے اسے دیکھنے لگا تو وہ بولیں۔''میری ناول کا موضوع اسی سے تعلق رکھتا ہے۔''

''آپ ناول لکھ رہی ہیں۔''

''لکھ کیا رہی ہوں۔ کچھ دنوں سے جھک مار رہی ہوں۔ لکھا ہوا پڑھتی ہوں پھر آدھا پھاڑ دیتی ہوں لیکن اسے پھینکتی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ ''کبھی کبھی پھاڑے ہوئے سے بھی کچھ کمپیوٹر کی میموری میں ڈال دیتی ہوں۔'' میں نے ان سے پوچھ لیا۔

''آپ ناول کو کس طرح محسوس کرتی ہیں۔'' یہ سن کر وہ اپنی ہنسی روک کر خاصی سنجیدہ ہوگئی۔ پھر دھیرے سے بولی:

''میں ناول میں انسان دوستی کے زاویئے سے محرکات اور اسباب کی نشاندہی کو اہمیت دیتی ہوں۔''

مجھے ہمیشہ سے یہ لگتا رہا کہ اس عمارت سے باہر نکل کر میں دوسرا آدمی بن جایا کرتا تھا۔ وہسکی پینا اور اپنے بچوں سے پیار کرنا مجھے اچھا لگتا۔ جب بعض پڑھی ہوئی کتابوں کے تبصرے اخباروں میں دیکھتا تو کبھی کبھی سینے میں گھومتی اور جتن کر کے باہر نکل جانے میں ناکام رہ جانے والی آوازیں ان خوشامدی، منافق اور چالاکی سے پالش کیے لفظوں میں لپیٹ کر پیپ بھرا جھوٹ بیچنے والے گھناونے تبصرہ نگاروں کو چیخ چیخ کر گالیاں دیتی تھیں۔ اس غصے کی لپٹیں لگتا تھا میرے جسم کو خاکستر کر دیں گی۔ اس کیفیت میں بکھری نظموں کا مجموعہ چھپ چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کا ترجمہ شدہ مجموعہ مریم کے پاس موجود تھا۔ کسی کے ہاتھ میں میرے

ہونے کی تھوڑی خوشی مجھے ضرور ہوئی۔

''آپ نے یہ نظمیں پڑھیں۔؟''میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے دوسرے مہمانوں کے پاس لے آئیں۔آرٹ پر دھیمے دھیمے باتیں کرنے والوں کے بیچ اچھا وقت گزرا۔ چلتے وقت مریم مجھے صدر دروازے تک چھوڑنے آئیں اور بولیں۔

''ایک خاموش طوفان کے پیش خیمہ جیسا تھا وہ وقت جب سروں پر بے پائلٹ جہازوں سے گرائے گئے بموں کا ڈر نہ تھا۔سپاہی آپس میں اپنے قبیلے کی عظمت دشمن کو یاد دلا کر ہاتھوں سے لڑتے تھے۔'' پھر اداس لہجے میں کہنے لگیں۔''اس وقت غصے کی پلیٹ کو ٹھنڈا کر کے کھانا شائد اتنا دشوار نہ تھا۔سنا ہے رسولؐ نے غصے کی پلیٹ ہمیشہ ٹھنڈی کر کے کھائی ہے۔'' یہ سن کر میں مریم کی آنکھوں میں دو پل دیکھتا رہا۔یہ جھانکنے کے لئے کہ غصہ ٹھنڈا کر کے کھانے کی ہدایت کہیں وہ میری نظمیں پڑھنے کے بعد تو نہیں دے رہی ہیں۔لیکن ان کی آنکھیں کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔میں نے پوچھا:

''آپ کرسچن ہیں یا مسلمان؟'' جواب میں وہ مسکرائیں اور بولیں۔''پھر کبھی ___'' انھوں نے میری گاڑی کا دروازہ کھولا۔میں بیٹھ گیا گاڑی بڑھی تو وہ اندر چلی گئیں۔راستے بھر میں ان کی پینٹنگ کے بارے میں سوچتا رہا۔شائد گاندھی نے ستہ گرہ کا راستہ حدیبیہ کے میدان سے لیا ہوگا۔ میں نے مریم زمانی سے نہ تو کبھی پھر یہ سوال کیا کہ وہ کرسچین ہیں یا مسلمان۔نہ انھوں نے کبھی بتایا۔ مجھے وہسکی پینے کے دوران اکثر ایسا لگا کہ مذاہب بھی میری عمارت میں جڑی تختیاں جیسے ہی ہیں۔

کافی عرصہ گزر گیا مریم زمانی سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ایک دو بار میں نے انھیں عمارت کے بڑے کمرے سے باہر نکل کر تیز قدموں سے نیچے جاتے دیکھا۔ایک بار تو مجھے ایسا لگا کہ کمرے سے باہر نکلنے پر ان کا چہرہ شائد غصے سے تمتمایا ہوا تھا۔وہ میرے کمرے میں نہیں آئیں۔ممکن ہے اس کے علاوہ بھی کبھی کبھی وہ بڑے کمرے میں آئی ہوں۔میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ایک دن خبر آئی کہ مریم زمانی کا ناول چھپ گیا ہے۔طبیعت نہیں مانی تو میں

نے انھیں فون کیا تو شام کو کافی ہاؤس میں ملنے کی تجویز انھوں نے رکھی۔ میں پہنچا تو وہ کونے کی میز پر تنہا بیٹھی ہوئی ملیں، لگا کہ انکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پتا چلا کہ انکی قریبی دوست جو ایک اچھی شاعرہ تھیں گذر گئی ہیں اور وہ وہیں جائیں گی۔ اُن شاعرہ کا کلام کبھی کبھی میں نے بھی پڑھا تھا اور مرعوب بھی تھا، افسوس کا اظہار کیا تو وہ بولیں

''آپ کی عمارت نے کبھی انکا اعتراف نہیں کیا۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ تنگ آکر برسوں سے ان سوالوں کو بیوی بچوں اور اپاہج باپ کے مسائل کے ساتھ وہسکی میں ڈبو چکا تھا

''میں جانتی ہوں کہ Openion Mafia کیسے بنتی ہے اور کسطرح کام کرتی ہے'' شائد وہ خود سے کہہ رہی تھیں

''جو دانشور آپ کے مقتدر سے، اسکے وفادار رہتے ہیں، وہ خراج کے طور پر انھیں وفاداروں کو اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کے لئے نامزد کرتا ہے۔ ان وفاداروں کو لگاتار اپنی پناہ میں رکھا جاتا ہے۔'' پھر اس نے اپنی ناول کی ایک جلد میری طرف بڑھائی۔

''اسے پڑھیے۔ جمہوریت کے ضابطے کو دست پناہ بنانے کا کھیل کیسے کھیلا جاتا ہے۔ پھر اقتدار والے کی چہیتی خود مرکزیت کے نازک ہاتھوں کو یہ دست پناہ انگاروں سے جلنے سے کیسے بچاتا ہے۔''

میں نے مریم سے ناول کی دو جلدیں لے لیں۔ ایک سادے کاغذ پر ایک جگہ دستخط کروائی اور وعدہ کیا کہ انکی ناول صحیح جگہ پر برائے غور پہنچ جائے گی تو وہ تلخی سے بولیں:

''کیا عمارت کی دیمکیں ابھی بھی بھوکی ہیں۔؟''

اخباروں کے تبصروں میں مریم زمانی کے ناول کے اس خیال پر دلچسپ بحث کی گئی تھی کہ کسی فرد یا افراد کے ادارے کو اس لئے حکومتی اختیارات نہ دیئے جائیں کہ وہ انھیں اپنے ہی لوگوں پر استعمال کرے کیونکہ ایسی صورتِ حال سے ہی جبر، بے گانگی، گمراہی اور علحدگی پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان میں سے کئی تبصرہ نگاروں کو وہسکی کی دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے دیکھا تھا۔

دو تین سال گذر گئے لیکن میری عمارت سے مریم زمانی کی ناول کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ ایک دن وہ میرے گھر آئیں، باتوں باتوں میں اسکی مرحوم دوست کا ذکر نکل آیا جو شاعرہ تھیں اور جن پر ان دنوں خاصے مضامین چھپ رہے تھے۔ مریم نے بتایا کہ وہ شاعرہ افلاس کی ماری ایک گوشہ نشین خاتون تھی اور اپنے آپ سے بھی ڈری ڈری رہا کرتی تھی ایک بار اس نے مسلمانوں کی ایک برگزیدہ ہستی حضرت امام جعفر کا ایک عجیب وغریب قول سنایا تھا جو مریم کو یاد رہ گیا تھا۔ میں نے اُس قول کو جاننے میں دلچسپی لی تو مریم نے سنایا

"جب تم یہ دیکھو کہ لوگ اسکے حامی ہوں جو غالب آ جائے چاہے حق پر ہو یا باطل پر۔ جب تم یہ دیکھو کہ لوگوں کی ساری توجہ پیٹ پر اور شرم گاہ پر مرکوز ہو اور ہوائیں منافقوں کے حق میں چل رہی ہوں اور ایمانداروں کو کچھ حاصل نہ ہو تو ایسے زمانے میں اپنی حفاظت کرو اور خدا سے نجات طلب کرو کہ وہ تم کو مفاسد سے محفوظ رکھے۔

یہ سنا کر مریم یکا یک جذبات سے مغلوب ہو کر بولیں۔ "لیکن وہ شاعرہ جو بے نام اور بے شناخت مر گئی اس نے اپنی شاعری میں عجیب وغریب سوالات پوچھے تھے کیونکہ شاعری کے پاس سوال ہی ہوتے ہیں۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا اب طاقت کا مفہوم بدل نہیں گیا ہے۔ کیا طاقت پر طاقتور اور کمزور دونوں کی اجارہ داری نہیں ہو گئی ہے۔ لیکن اسے یوں نظر انداز کیا گیا کہ اس کے وہ دانت بھی ٹوٹ گئے جن سے سوال کر کے وہ کاٹ لیا کرتی تھی آخر کو اس نے اپنی خوابگاہ کی دیوار پر ایک تختی لگا دی جس پر لکھا تھا:

"انسان اصلاً صاحبِ ضمیر وجود ہے۔" وہ سمجھتی تھی کہ اس ضمیر کی وجہ سے انصاف اور ایمانداری کی گنجائش رہے گی۔ لیکن لوگ آتے تھے اور اس عبارت کو پڑھ کر ہنستے تھے، اچھلتے تھے، تختی پر تکیئے اور گدے اچھال اچھال کر مارتے تھے۔ جیسے جوتے اچھالے جاتے تھے اور وہ اکیلی سب سے کٹی ہوئی اپنے ضمیر کی ماری ہوئی اس بھیانک تنہائی سے نجات پانے کے لئے کافی ہاؤس میں دو کافیاں منگا کر ایک کافی اپنے مقابل کی خالی کرسی کے سامنے رکھتی اور دوسری کافی خود پیتی اور جب اس کے بعد بھی تنہائی بلائے جاں بنی رہی تو وہ حضرت امام جعفر کے اقوال کی پناہ میں چلی گئی اور مفاسد سے محفوظ رہنے کی دعائیں مانگنے لگی۔

مریم خاموش ہوئیں تو میں نے ان سے نظریں نہیں ملائیں۔ میں سمجھا تھا کہ عمارت میں ان کی ناول پر خاموشی کو لے کر شاید وہ مجھ سے بات کریں گی۔ لیکن جب انھوں نے کوئی بازپرس نہ کی تو میں نے ان سے پوچھا:

''آپ نے ہماری عمارت کے بڑے کمرے میں جا کر کیا پھر کبھی ان سے ملاقات کی؟''

''ہاں کی تھی'' وہ بولیں۔ ''انھیں یاد دلایا تھا کہ وہ اپنی اجارہ داری کے لئے Despotic rule کو کتنا بڑھوا اور دیں گے۔؟ کیا انکے عمل سے لوگوں میں اعتماد کے بجائے عدم تحفظ نہیں بڑھ رہا ہے۔''

''وہ کیا بولے۔'' میرے سوال پر پہلے تو وہ خاموش رہیں پھر کہنے لگیں۔

''میری بات پر انھوں نے مجھ سے الٹا سوال کرلیا۔ پوچھا یہ بتائے عام لوگوں کو تحفظ دینے میں اسٹیٹ اپنی ذمہ داری کتنی نبھاتی ہے۔ ہمیں بدقماشوں سے بچانے میں کیا وہ کامیاب ہوئی ہے۔ وہ افلاس کی گود میں جرائم پیشہ لوگ تیار کرتی ہے۔ وہ لوٹ مار کرتے ہیں، تو جیلوں میں بند کرتی ہے۔'' پھر انھوں نے اپنے لہجے میں شہد گھولتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو آپ دیکھتی ہوں گی کہ ریاست اپنی غیر منصفانہ اجارہ داریوں کو خود ہی انتہائی مضبوط تحفظ مہیا کرتی ہے۔ جو ریاست اجارے داریوں کی حفاظت کرتی ہو وہ ان اجارہ داریوں کو ختم کس لئے کرے گی۔''

مریم ٹھیک بتا رہی تھیں۔ وہ ایسے ہی بات کرتے تھے۔ تھوڑی خاموشی کے بعد میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''کیا پھر آپ ان سے نہیں ملیں۔''

''کن سے؟''

''بڑے کمرے والے سے۔'' میں نے وضاحت کی تو انھوں نے جواب دیا۔

''میں تو ملتی ہی رہی ہوں لیکن مجھ سے زیادہ میری ناول ان سے مل کر پوچھتی رہی ہے کہ وہ جو بڑے کمرے میں ہوتے ہیں، جہاں دروازے کی دیوار پر لال بلب جلتا بجھتا ہے اور اندر ایک بستر لگا ریٹائرنگ روم بھی ہوا کرتا ہے جہاں شکم کو تو بس ککڑی اور پنیر کے ٹکڑوں پر ٹرخا

کر قیلولہ ہوتا ہے لیکن بستر سے ٹھیک اوپر نظر اپنے پورے ارتکاز کے ساتھ چھت پر ٹنگی کسی شرم گاہ پر مرکوز رہتی ہے افسوس کہ وہ ہر بار شرمگاہوں سے یوں معاملے کر کے کتنے تنہا رہ جاتے ہوں گے؟ میری ناول ان سے سوال کرتی ہے کہ برسہا برس کلاسیکی شاعری میں عورت کے بال آنکھیں، ابرو، کمر، سینہ، ناف، زیرناف پڑھانے والوں کا جنسی تجربہ کیا وہی ہوتا ہے جو مفاسد سے پناہ مانگنے والی عورت کا جس کی زندگی کی معیاد کلی کے چٹک کر تبسم کرنے تک ہے۔''

میرے رٹائرمنٹ میں مشکل سے ایک ہفتہ رہ گیا تھا کہ مریم مجھے فون کر کے کافی ہاؤس میں ملیں۔ اب وہ سگریٹ بھی پینے لگی تھیں۔ وہ بے صبری سے غالباً میری منتظر تھیں۔ ایش ٹرے پر سگریٹ رکھ کر شروع ہو گئیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ ان حالات میں فسادوں سے اپنی خیر منانا ممکن نہیں ہے۔ خدا بھی ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ ان حالات میں انسان کی بنیادی صفا - جنگ کے ذریعے ہی خود کو نمایاں کرتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔ لگاتار سب کچھ پُرسکون، پُرامن اور خوشگوار رہے، یہ محض خواب ہے۔ اگر ہم لکھنے والے اپنی توقیر اور اپنے وقار کی بنیادی شناخت کو بھول چکے ہیں تو ہم کیوں لکھتے ہیں۔ میرا لکھنا جو میرا مذہب ہے موجودہ حالات نے اسے میری ہی نظر میں گرا دیا ہے۔ جب اندلس میں اسلام کی حکومت بنی اور عیسائیوں پر مسلمانوں کا غلبہ ہوا تو راجدھانی کارڈورا کے بعض عیسائی راہب تڑپ اٹھے۔ وہ اپنے تشخص کو منوانے کے لئے اسلامی عدالتوں میں قاضی کے سامنے کھڑے ہو کر محمدؐ صاحب کی ایسی تضحیک کرتے تھے کہ قاضی انھیں پھانسی پر لٹکا دیتا تھا۔''

میں مریم کو خاموشی سے تک رہا تھا اور وہ مجھے بتا رہی تھی کہ وہ کل بڑے کمرے میں ان سے ملنے جا رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر نہ کالی داڑھی ہوگی، نہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے ہوں گے، نہ سر پر صافہ ہوگا نہ ہاتھوں میں اے۔ کے سینتالیس۔ وہ تو صرف اس کمرے میں ایک ایسی چیز میں خود کو کھو دینا چاہتی ہے جو کہیں کھو گئی ہے۔ وہ تو شرم گاہ پر مرکوز رہنے والے ارتکاز سے ایک یادگار ہم بستری کے لئے جا رہی ہیں۔ یہ بتا کر مریم چلی گئیں اور میں روکتا ہی رہ گیا۔

میں عمارت کے مسائل کو گھر لے کر نہیں جاتا تھا مجھے شام کو وہسکی سے شغل، بچوں سے پیار کرنا

اچھا لگتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ادب اور شاعری کسی کو کار آمد نہیں بنا سکتی کیوں کہ مجھ سے زیادہ تو تھانے میں ایف۔آئی۔آر درج کرنے والا منشی کار آمد ہوا کرتا ہے۔

صبح ہوئی تو میرا جی نہ مانا ایک عجیب سا ہول دل پر طاری تھا۔ میں نے مریم کو فون کیا اور ان سے بتایا کہ میں اس کی باتوں سے بہت فکر مند ہوں اور وہ نادانی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے کہ اسے پچھتاوا ہو۔ تو وہ ہنسی پھر فون پر اس کے مسلسل بولتے رہنے کی آواز آئی، الفاظ اور جملے سیلاب زدہ دریا کی طرح بہہ رہے تھے۔

''میں یہ بات جانتی ہوں کہ آپ بھی اس عمارت کا ایک حصہ ہیں۔ شہروں شہروں اس عمارت میں رکھی ردّی کی ٹوکریاں ان کے کاغذات، ان میں پھینکی گئی پان کی پڑیاں اور سگریٹ کی خالی ڈبیاں اور اندام نہانیوں کی طرف سے بھیجے گئے پیغامات کے چاک شدہ رقعے اور سوٹ اور شیروانیوں میں ہانپتے ہوئے بے گناہ اور معصوم لوگ جو بغل میں اپنی کتابوں کے پلندے دبائے زینہ چڑھتے اترتے ہیں وہ سب ہی اس عمارت کا ایک حصہ ہیں اور وہ سب بھی جن کو اس عمارت نے اپنی مصلحت کے تحت سرفراز کیا اور وہ بھی جو ہزیمت شدہ اور تنہا رہ کر ایک کافی خالی کرسی کے سامنے رکھ کر دوسری کافی خود پیتے رہے سب اس عمارت کی پیداوار ہیں اور یہ عمارت ان بے گناہوں اور معصوموں کے بنیادی انسانی اوصاف کو زوال پرستی کی طرف یوں ڈھکیل چکی ہے کہ یہ سب وقت کی موج خرام سے کترے ہوئے گلوں کے نمونے بن چکے ہیں۔ خود میں بھی جو اندلس کی راجدھانی کارڈووا کی عدالت میں جلوہ افروز قاضی القضات اور اس کی دیواروں پر جڑی تختیوں کو خاک و خون اور دھوئیں میں بدل دینا چاہتی ہوں، وہ بھی خرام یار کے قدموں میں کبھی خاک سے زیادہ اور کیا ہوگی۔'' یہ کہہ کر مریم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ایسا بیان اور مکالمہ اب کان سننے کے عادی نہ رہ گئے تھے کاش مریم خواتین کی پولیس سروس میں چلی گئی ہوتی تو اب تک ڈی آئی جی ہوتی، وہ سکی بیتی بچوں سے پیار کرتی۔

دوسرے دن میں نے سوچا کہ جب میں بڑے کمرے میں داخل ہونگا تو وہاں دھواں بھرا ہوگا۔ زخم خوردہ اور جھلسا ہوا ساز و سامان ہوگا، انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اعضاء ہونگے اور دھماکے سبب چھت کے مڑے تڑے پنکھے پر دیوار کی وہ تختی اکھڑ کر لٹک گئی ہوگی جس پر لکھا تھا:

"دانشوروں کو مکتبی اور ادارتی منتظمین کا غلام نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔
سنا ہے مریم خودکش جہادیوں کی طرح اپنے پیٹ پر بارود کے بجائے اپنی ناول باندھ کر بڑے کمرے میں گئی تھی لیکن وہاں اُسے سمجھا دیا گیا کہ مانا کہ الفاظ بھرے ہوئے پستول کے مانند ہوتے ہیں لیکن مریم جنہیں نشانہ بنانا چاہتی ہے وہ کمرے بلٹ پروف ہیں اور ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وسائل بہت وسیع ہیں، پستول کو گولیوں سے بھر لینا ہی کافی نہیں بلکہ کارگر نشانہ کہاں لگانا ہے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔

☆☆☆

مدت ہوئی میں اس عمارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔ اب تو اس عمارت کا آپا بھی بدل چکا ہے۔ اور میرے زمانے کی تختیاں بھی اب وہاں سے اکھاڑی جا چکی ہیں اور نئی ہدایتوں کے ساتھ نئی تختیاں لگائی جا چکی ہیں۔ ایک تختی پر اب یہ لکھا ہے: "تاریخ میں کوئی بھی دستاویز ایسی نہیں جو دہشت اور بربریت سے عبارت نہ ہو۔ آپ کے سامان کی تلاشی لی جا سکتی ہے، تعاون کیجئے۔" سنا ہے اب کتابیں بھی برائے غور نہیں بھیجی جاتیں۔ صرف فلیپ پر چھپی آراء کے ساتھ کتابوں کے گردپوش پیش کئے جاتے ہیں۔ جن گردپوشوں پر ہیڈ کوارٹر سے Clear (کلیر) کی مہر لگ کر آتی ہے انھیں اگلی کارروائی کے لئے رکھ لیا جاتا ہے۔ اخبارات عمارت کی کارکردگی کی تعریف کر رہے ہیں۔ اب تو وہاں صدر دروازے پر ہی میٹل ڈیٹکٹر نصب کر دیا گیا ہے اور دیواروں پر لگے نیم مخفی کیمرے آنے جانے والوں پر نظر رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان عمارتوں کے مقصد کی حفاظت کے لئے نا چاہتے ہوئے بھی انھیں زیادہ فوجی ساز و سامان کے ساتھ ایک طاقتور عسکری کیمپ میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور پہلے پھاٹک پر ہی نئی تختیاں بھی جڑی گئی ہیں۔ یہ تو خیر مجھے اطمینان تھا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا بھی تھا کہ تختیاں کسی روز اکھاڑے جانے کے لئے جڑی جاتی ہیں۔

☆☆☆

یاد بزرگاں و دوستاں

لکھنؤ

۱؍ اپریل ۲۰۰۳ء

ڈیر اقبال مجید   خوش رہو

تم کو یہ تو معلوم ہے کہ نصرت پبلشرز کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور پچھلے دو برسوں سے خطرناک ترین امراض کا شکار رہ کر ایک طویل عرصہ تک بستر سے لگا رہا ہوں۔ مرض تو اپنی جگہ قائم ہے لیکن اب لکھنے پڑھنے کا کام دھیرے دھیرے شروع کیا ہے۔ کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے، ان میں تمہاری کتاب کی سو سے زیادہ کاپیاں ہیں تمہیں اگر چند کتابوں کی ضرورت ہو تو پچاس فی صد کمیشن پر حاصل کر سکتے ہو۔ ڈاک خرچ تمہارے ذمے اس کی ضرورت یوں پڑی کہ دکان بند کرتے وقت اسی پچاسی ہزار روپئے ادا کرنے کے باوجود ابھی بھی بیس ہزار روپئے ادا کرنے ہیں۔ نصرت پبلشرز کے تقریباً پچاس ہزار روپے اداروں اور افراد پر باقی ہیں لیکن اب اس رقم کی ملنے کی امید نہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی یہ جان کر کہ اس میں سے تقریباً پندرہ ہزار روپئے الہ آباد یونیورسٹی پر ہیں۔ یہ شہر کبھی میرے دوستوں سے بھرا ہوا تھا۔ خیر اسے چھوڑو۔۔۔۔۔۔!

تمہارا

عابد سہیل

اضطراب

اس برسات کی اکتا دینے والی رات میں بھی وہ اپنے پرانے شغل میں بتلا تھا جس کو اس کے روز مرہ کے مشاغل میں شامل سمجھا جانا غلط نہ ہوگا۔ ماجد سامنے کی مسہری پر اوندھا دراز تھا، جوتے اس نے نہیں اُتارے تھے اور قمیض کے کالر کو ڈھیلا کرلیا تھا۔ دن بھر کی گرد اور کثافت نے اس کے گھونگھریالے بالوں کی توانائی مرجھادی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی انگلیاں موبائل کے بٹنوں پر چل رہی تھیں اور اپنے گردو پیش سے بے خبر اس کی آنکھیں موبائل کے بلوری پردے پر انہماک کے ساتھ گڑی ہوئی تھیں۔ اس کے اس شغل سے میں اب کچھ اکتا سا چکا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے موبائل کے اسکرین پر دو lesbian لڑکیوں کی چھوٹی Movie دکھائی تھی جو خاصے گدیلے اور آرام دہ بستر پر دراز ایک دوسرے کی ٹی شرٹ اُتار رہی تھیں۔ خدا جانے آدھے منٹ کی مووی کے ایسے عریاں اور شہوت انگیز ٹکڑے وہ کہاں سے اور کیسے حاصل کرلیتا تھا۔ میں نے لپک کر اس کا موبائل چھین لیا اور اس کے اسکرین پر نظر ڈالی مگر تب تک پردے پر اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں نے موبائل اس کے بستر پر ڈال دیا۔ ماجد اٹھائیس سال سے زیادہ کا نہ تھا جنسیت سے اس کی دلچسپی اس کی عمر کا تقاضا تھا اس لئے میں نے اس سے پوچھا کہ اس بار وہ کونسی فحش فلم Download کرا کرلایا ہے۔

ہم دونوں ایک ہی کمپنی میں ملازم تھے میں اس سے کئی سال بڑا تھا اور کمپنی میں خاصہ پرانا ہو چکا تھا۔ وہ میری تقرری کے کئی سال بعد کمپنی کے مارکٹنگ سیکشن میں آیا تھا۔ میرے بیوی بچے تو وطن میں تھے۔ مکان میں جگہ بھی تھی اور ماجد اکیلا ہی تھا میں نے اس کو پیئنگ گیسٹ کے طور پر جگہ دے دی۔ ماجد ایک تیز طرار اور ذہین لڑکا تھا۔ اس کا رنگ صاف، ناک نقشہ متوازن اور قد نکلتا ہوا تھا۔ انگریزی بھی اچھی بولتا تھا۔ چال ڈھال میں تھوڑی سی اکڑ اور خودسری کا انداز صاف نمایاں تھا۔ کئی بار میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس مجھ سے گھلنے ملنے یا

بے تکلف ہو کر باتیں کرنے کے لئے کوئی موضوع نہیں ہوتا جس کے سبب وہ خود اپنے خول میں مگن رہتا۔ ایک دن نہ جانے کس جھونک میں اور بڑے منھ پھٹ انداز میں اس نے اس رویئے کا سبب بھی بتا دیا۔ کہنے لگا ''میں نے سنا ہے کہ آپ نے کمپنی کو لکھ کر دے دیا ہے کہ آپ کو کوئی ایسا کام نہ سونپا جائے جس میں کمپیوٹر کی ضرورت پڑے کیونکہ آپ کو اسے آپریٹ کرنا نہیں آتا اور آخری عمر میں کمپیوٹر سیکھنے کے جھمیلے میں آپ پڑنا بھی نہیں چاہتے۔'' میں نے ماجد کو بتایا کہ اس نے ٹھیک سنا ہے، کمپیوٹر سے مجھے وحشت ہوتی ہے وہ دوسروں کا منھ کھلوائے بغیر باتیں کرتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ تیوریوں پر بل دے کر بولا۔ ''مجھ جیسے لوگوں کو جو تہذیب پال رہی ہے اس کو ٹکنو کلچر کا نام دیا جاتا ہے جناب اتنا فاصلہ ہو گیا ہے ہمارے اور آپ کے درمیان کہ جب بھی میں خالی وقت میں آپ سے گپ لڑانا چاہتا ہوں تو گھنٹہ بھر یہی سوچتا رہتا ہوں کہ ہم دونوں کون سے ایسے ٹاپک پر بات کر سکتے ہیں جس کے درمیان کوئی کڑواہٹ پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔ صاحب مجھے تو آپ کے ہاتھ کی بنائی کافی کی تعریف کرتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے مزے لیتا ہوں اور خاموشی سے پی جاتا ہوں۔''

یہ بات اگر ماجد مجھے نہ بھی بتاتا تو بھی مجھے اس کا احساس تھا۔ وہ مجھے گھر کے اندر کی ایک بے معنی سی شئے سمجھ کر نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خود کمپنی نے جس کا میں برسوں سے ملازم تھا مجھے صاف بتا دیا تھا کہ اگلے ایک سال کے عرصے کے بعد وہ مجھے نکال دے گی۔ دیکھا جائے تو اس میں نہ کمپنی کا کوئی قصور تھا نہ مجھ جیسے بوڑھے آدمی کا۔ یہ بتانے میں مجھے تکلف نہیں کہ بستر پر لیٹے لیٹے اس بدلتی دنیا کے بارے میں فکرمندی سے میں سوچا کرتا، دیکھتے ہی دیکھتے تجارت کی دنیا میں جو انقلاب آیا تھا اس نے مجھ جیسے بہت سے لوگوں کو یکا یک بے مصرف ثابت کر دیا تھا۔ میں اگر کمپیوٹر چلانا سیکھ بھی لیتا تو اپنے مزاج اور پوری شخصیت کو کیسے بدلتا جو نئے تجارتی نظام کی نئی ضرورتوں کے پیش نظر ناکارہ ثابت ہو چکی تھی۔ ماجد جتنا وقت موبائل پر صرف کرتا شاید اتنا ہی وقت وہ اپنے کمپیوٹر پر انٹرنیٹ کی ہواخوری میں بھی گزارتا۔ ایک دن جب میں نے اس کو حسب معمول رات کے وقت بستر پر موبائل سے شغل کرتے دیکھا تو چڑھ کر بولا ''میاں تم سے اگر کوئی بات کرنا بھی چاہے تو کب کرے تم کو اپنے کھلونے سے فرصت

نہیں ملتی''، میری بات سن۔ اس نے موبائل پر سے نظر تو نہیں ہٹائی لیکن دھیرے سے مسکرایا اور بولا ''ابھی ابھی ایک Message آیا ہے۔ لیجئے آپ بھی سنئے'' یہ کہہ کر اس نے اسکرین پر لکھی عبارت پر نظر ڈالی اور بولا ''اس پیغام کا عنوان ہے''۔ دائمی رہائش گاہ۔'' پھر اس نے عبارت پڑھنا شروع کی۔ ''اے لوگو لپکو اپنے رب کی طرف، اس کی پر کیف اور پُر بہار جنتوں، نیز اس کی حفاظت اور آغوش پناہ یعنی مغفرت کی طرف کہ وہی حقیقی اور دائمی رہائش گاہ ہے''۔

ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اس چھوٹے سے Handset کی کرامتوں سے مجھے پوری آگاہی نہ تھی اور نہ دلچسپی۔ جب کبھی بال بچوں کو فون کرنے کی ضرورت پڑتی تو پی سی او یا دفتر کے فون سے کام چلا لیتا تھا۔ بیوی تو دفتر کے ہی فون پر رابطہ قائم کر لیا کرتی تھی۔ دراصل اس کمپنی سے میرا معاملہ کچھ گھریلو قسم کا تھا۔ میرا باپ اپنی نوعمری کے زمانے سے ہی کمپنی کے موجودہ مالک کے باپ کا نجی سکریٹری تھا اور اپنے بڑھاپے تک اسے چھوڑ کر کہیں نہ گیا۔ یہاں تک کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مجھے یہاں ملازمت باپ کی خدمات کے مدنظر ہی ملی تھی۔ ماجد موبائل پر بھیجی گئی اس عبارت کو سنانے کے بعد اس بات کی دیر تک کوشش کرتا کہ مجھ سے باتیں کرے اس درمیان اُس نے مجھے بتایا کہ موبائل ہمارے نظام سرمایہ داری کی رگ رگ میں سما چکا ہے۔ میں نے اس موقع پر ماجد کے بارے میں اپنے دل کی بات پہلی بار کہہ دی۔

''ہمارے دن اور رات اب کارپوریٹ سوسائٹی میں گزرتے ہیں۔ نفع نقصان پر قائم اس سماج میں جینے کے لئے میرا خیال ہے کہ جسم میں خون کی گردش ذرا تیز چاہئے۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کا بلڈ ہمیشہ نارمل سے کچھ زیادہ بڑھا ہوا ہی رہتا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ کافی میں دودھ کے بجائے اسپرن کی گولی ڈال کر پیا کرتا تھا دوسری حیرت انگیز بات اس کی نیند کے بارے میں تھی۔ دیر رات تک میں اس کو انٹرنیٹ پر شادی ڈاٹ کام کی سیر کرتے دیکھتا۔ پھر نصف شب کے آس پاس جیسے ایک نئی تازگی آ جایا کرتی۔ اس وقت اگر میں کچھ دیر کو ہوشیار ہو جاتا تو ماجد کو موبائل پر کسی سے باتیں کرتے ہوئے پاتا۔

اس گفتگو کے آدھے جملے جو میرے کانوں تک پہنچتے انھیں ادا کرتے وقت اس کے سینے میں مچلتے جذبات کی جو دھوپ چھاؤں مجھے اس کے چہرے پر آتی جاتی دکھائی دیتی اور جس

کے ساتھ اس کی آنکھیں بار بار چمک اُٹھتیں اور چہرہ تمتما جایا کرتا تھا یا پھر گالوں پر شرارت بھری کیفیت کا شوخ رنگ سا بکھر جایا کرتا اور پھر جذبات کی آنچ سے پگھلے ہوئے الفاظ قطرہ قطرہ اس کے موبائل کے مائک پر ٹپکنے لگتے اور آواز میں ایک میٹھا سا مخملی سا ارتعاش کھنک جایا کرتا اور بیقراری کی اس کیفیت میں یہ اندازہ کر کے کہ میں جاگ گیا ہوں اس کا اچھل کر بستر چھوڑ دینا اور لمبے ڈگ بھر کر ڈرائنگ روم میں جا کر سلسلہ کلام جاری رکھنا ان باتوں سے مجھے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا کہ موبائل کی دوسری طرف جو کوئی بھی ہے وہ کوئی عام اور کاروباری فرد نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا شناسا یا عزیز ہے جس کے لئے اتنے تن من کے ساتھ اتنی گہرائی میں اتر کر تیرنے کا مزہ لیا جاتا ہے اور جس کی دوسروں سے رازداری بھی برتی جاتی ہے۔ راتوں کی ان مہمات کو سر کرنے کے بعد خدا جانے وہ اپنی نیند کب پوری کرتا تھا۔

دھیرے دھیرے مجھے ماجد کے بارے میں جس کا پورا نام ماجد شیخ تھا کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ ماجد کا باپ ایک سرکاری افسر تھا جو چند سال پہلے فوت ہو چکا تھا۔ ایک بڑا بھائی تھا جو ماں سے لڑ جھگڑ کر بیوی بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ بڑی بہن کسی ڈگری کالج میں پڑھاتی تھی اور ماں کی کفالت کر رہی تھی۔

ایک رات وہ انٹرنیٹ پر شادی ڈاٹ کام میں اسکرین پر ایک لڑکی کی تصویر کو انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی رہی ہوگی تصویر میں وہ خاصی جاذب نظر کہی جا سکتی تھی، دوپٹے سے آدھا سر ڈھکا ہوا، شرمائی سی، کیمرہ مین کے بہت اصرار پر آدھی ادھوری نگاہوں سے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ملاحت اور بھولے پن کی گھریلو سی کشش تصویر سے نکل کر جیسے پھاندی پڑ رہی تھی اس پر نظر پڑتے ہی اپنی جگہ ٹھٹھک سا گیا دھندلا سا خیال یہ بھی آیا کہ غالباً وہ چہرہ کہیں دیکھا تھا لیکن اس سے قبل کہ میں تصویر کی جانب پوری طرح متوجہ ہوں ماجد نے بڑے تیزی سے تصویر کو اسکرین پر سے غائب کر دیا۔ مجھے شک ہوا کہ کہیں یہ لڑکی وہ تو نہیں جس سے راتوں میں موبائل پر ماجد دیر تک باتیں کیا کرتا ہے۔ لیکن میں نے بھی چشم پوشی سے کام لیا۔ اور ماجد سے کچھ نہیں پوچھا۔ اسی وقت ماجد کے موبائل پر کوئی پیغام آنے کی گھنٹی بجی۔ ماجد نے پیغام پڑھا۔ زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ’’آپ دیکھ لیجئے

ٹیکنالوجی کہاں کہاں اور کیسے استعمال ہو رہی ہے۔ اس پیغام کا عنوان ہے۔ ''حیات اور شعور'' پھر اس نے عبارت پڑھ کر سنائی۔ ''موت فنا نہیں بلکہ بقاء کا نام ہے۔ یہ وصالِ حق کا ذریعہ ہے، موت آنا محدود کو چھوڑ کر لامحدود کی طرف جانا ہے۔ ہوش مند اور باشعور لوگوں کی طرح طبعی موت کے پہلے ارادی موت اختیار کر کے اس کی لذت اور راحت کا مزہ چکھ لو۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔'' کچھ دنوں میں اب یہ Message آئے گا کہ ارادی موت کس کو کہتے ہیں اور اس موت کو کیسے گلے لگانا چاہئے تا کہ سیدھے جنت میں جانے کو مل جائے۔'' مجھے ان پیغامات میں دلچسپی نہ تھی، میں نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسری طرف کروٹ لیکر سو گیا۔

یہ کہنے میں مجھے تکلف نہیں کہ ماجد ایک محنتی اور ذہین لڑکا تھا جو اپنی ماں سے دور رہنے کے سبب کبھی کبھی اسے بہت یاد کرتا، موبائل پر اس سے بات کرتے ہوئے رو بھی پڑتا اس کا خیال تھا کہ ماں نے اس کے لئے سب دکھ اُٹھائے تھے اور اس کے بڑے بھائی نے نہ صرف اپنی پسند سے شادی کر کے اور پھر اکثر ماں کے مقابلے میں اپنی بیوی کی بے جا طرفداری کر کے ماں کا بہت دل دکھایا تھا۔

جن دنوں مجھ سے پردہ داری کے ساتھ ماجد موبائل پر راتوں میں عشق لڑایا کرتا مجھے اکثر اپنی جوانی یاد آجایا کرتی، تب پیغام وسلام پہنچانے کے لئے اتنے آسان ذرائع موجود نہ تھے اس وقت ہر گھر میں فون بھی نہ تھے۔ میری معشوقہ جو آج میرے جوان بچوں کی ماں ہے اس لڑکی تک ایک رقعہ حفاظت سے پہنچانے کے لئے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ جوانی کے وہ پاگل پن کے دن مجھے یاد آتے جب میں اس پردہ دار لڑکی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اسکول کی بس کے انتظار میں گرمی کی دوپہروں میں ان پیڑوں کے نیچے ٹہلا کرتا تھا جہاں کنکوے کا مانجھا سوتنے والے کاریگر اپنا کام کر رہے ہوتے۔ یہ عشق میں نے طالب علمی کے زمانہ میں کیا تھا۔ تعلیم پوری ہوئی تو نوکری ملنا آسان نہ تھا۔ لڑکی غریب گھر کی تھی اس کے بھائی وغیرہ پہلے ہی پاکستان جاچکے تھے۔ بیوہ ماں اس کی شادی بلا تاخیر کر کے اپنے بیٹوں کے پاس کراچی جانے کے لئے بہت دنوں سے بے حد پریشان تھی۔ اس لئے ایک بہت معمولی سی ملازمت اختیار کر کے اپنے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود اپنی محبوبہ کو بیاہ کر لانا پڑا تھا۔ جب

میں ماجد کو جذبات میں ڈوب کر راتوں کی تنہائیوں میں اس کی محبوبہ سے باتیں کرتے دیکھتا تو مجھے لگتا شائد میں ایک بار پھر اپنی جوانی کے گزرے ہوئے عہد میں لوٹ آیا ہوں اور ماجد وہ شب بیداریاں مجھے اپنی شب بیداریاں لگنے لگتیں۔

ایک دن ماجد کی غیر موجودگی میں ایک خاتون نے گھر کی Bell بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ متوسط گھرانے کی ایک مسلم خاتون دروازے پر کھڑی ہے اس خاتون نے مجھے بتایا کہ وہ ماجد شیخ کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرنے کے لئے اسکی غیر موجودگی میں مجھ سے ملنے کی فکر میں تھی۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ اس لڑکی کی ایک سہیلی کی بڑی بہن ہے جس کو ماجد یہاں سے سیکڑوں میل دور کے ایک چھوٹے سے شہر میں شادی ڈاٹ کام میں اس کی تصویر دیکھنے کے بعد کافی دنوں سے بلاناغہ فون کیا کرتا ہے۔ لڑکی متوط گھرانے کی ہے۔ بی۔اے پاس ہے گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے قبول صورت ہے۔ لمبے انتظار کے بعد کوئی معقول رشتہ نہ آنے کے سبب اس نے گھر والوں سے چھپا کر ماں کی رضامندی سے لیکن باپ کی لاعلمی میں رشتے کی تلاش میں انٹرنیٹ پر اپنی تصویر اور موبائل نمبر دیا تھا وہ ایک ایسے باپ کی بیٹی ہے جس کا یہ ایمان ہے کہ جو لڑکیاں ٹی وی دیکھا کرتی ہیں ان کا جنازہ اس وقت تک قبر میں دفن ہونے سے انکار کر دیا کرتا ہے جب تک ان کا ٹی وی بھی ان کے ساتھ قبر میں دفن نہ کر دیا جائے۔ وہ ٹی وی کو تالے میں رکھتا ہے۔ اس خاتون نے بتایا کہ لڑکی کا باپ کسی پرائیویٹ کالج میں پڑھاتا تھا اب رٹائر ہو چکا ہے اور کئی بیماریوں کا مریض ہے۔ لڑکی کی ماں ایک گھریلو عورت ہے اور گٹھیا کے شدید مرض میں مبتلا ہے۔ جہاں تک لڑکی کا سوال ہے وہ بہت سگھڑ، گھریلو، نیک مزاج اور روزہ نماز کی پابند ہے۔ میں نے اس خاتون سے پوچھا۔

”کیا وہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی ملے ہیں؟“

”نہیں۔ صرف دونوں نے ایک دوسرے کی تصویریں انٹرنیٹ پر دیکھی ہیں۔“

”کیا دونوں نے اپنے بزرگوں کو اس سلسلے میں اعتماد میں لیا؟“ میں نے جاننا چاہا۔

”نہیں۔ دونوں کو اس معاملے میں اپنے بزرگوں پر اعتماد نہیں ہے۔“ یہ جواب سن کر مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ تو اس نے بتایا کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے بارے

میں سمجھنے اور سمجھانے میں لگے رہتے ہیں لیکن اپنے اپنے بزرگوں کو شامل نہیں کرنا چاہتے۔
پھر میں نے اس ادھیڑ عمر کی سادہ مزاج خاتون سے آخری سوال کیا۔
''کیا وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں؟''
''یہ بات تو وہ دونوں ہی زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں تو آپ سے ماجد کے چال چلن وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ وہ بھی اپنے طور پر، کیوں کہ اس لڑکی نے اپنی سہیلی کو جس کی میں بڑی بہن ہوں در پردہ اپنا ہم راز بنایا ہوا ہے اور کیونکہ میری بہن یہیں میرے پاس ہے اس لئے وہ اپنی دوست کی بہتری کے لئے اپنی جگہ چپ چاپ ماجد کے بارے میں معلومات کر لینا چاہتی ہے۔''
میں نے اس خاتون کو بتا دیا کہ لڑکا مناسب تنخواہ پاتا ہے، کمپنی میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے اس کا چال چلن بھی ٹھیک ہی ہے البتہ خاندانی حالات کا مجھے کوئی خاص علم نہیں ہے۔ لڑکی کے بارے میں اس خاتون کی بتائی ہوئی باتوں میں مجھے ایک بات پریشان کر رہی تھی اس لئے میں نے اس سے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔
''آپ کہتی ہیں کہ لڑکی کو ٹی وی دیکھنے کی ممانعت ہے اور باپ ٹی وی کو تالے میں رکھتا ہے۔''
''جی ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ لڑکی کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس پر وہ کبھی کبھی کھڑی ہوتی تھی۔ سامنے ایک قصائی کی دوکان تھی اس کا جوان لڑکا اس پر ڈورے ڈالنے لگا۔ بڑا واویلا ہوا۔ باپ کا خیال تھا کہ ایسی گمراہیاں ٹی وی دیکھنے سے ہوتی ہیں باپ نے ٹی وی میں تالا لگا دیا اور وہ کھڑکی بھی چنوا دی۔''
میں نے پوچھا۔ ''پھر اس لڑکی کو موبائل کیوں تھما دیا گیا جو سیکڑوں میل دور ایک انجان لڑکے سے راتوں میں عشق و محبت کی باتیں کیا کرتی ہے۔''
اس کے جواب میں اس خاتون نے مجھے بتایا کہ لڑکی کی ماں زمانہ شناس ہے۔ اس کا خیال ہے کہ لڑکی کا باپ تو بیٹی کا رشتہ تلاش کرنے میں کچھ نہیں کر پا رہا ہے اگر لڑکی کو بھی مشکیں باندھ کر رکھا گیا تو شائد وہ زندگی بھر کنواری ہی بیٹھی رہے۔
ماجد کے بارے میں اس اجنبی خاتون کی تفتیش کے بعد خاصہ وقت گزر چکا ہے۔ سچ تو

یہ ہے کہ اس دوران میں اپنی گھریلو پریشانیوں کے سبب ماجد کی صحبت سے کچھ کٹ سا گیا تھا۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ دراصل ماجد نے اس کا جن لفظوں میں تجزیہ کیا تھا اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک دن ماجد حسب معمول بستر پر دراز اپنے موبائل کے پردے پر آنکھیں جمائے کوئی منظر دیکھنے میں محو تھا میں نے ہمیشہ کی طرح اس سے دریافت کیا۔

''پھر تم نے کوئی فحش منظر کہیں سے اُڑا لیا۔'' جواب میں وہ خاموشی سے اسکرین دیکھتا رہا تو میں نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھیننا چاہا 'ٹھہریئے' وہ بولا۔ ''لیجئے ایک قصائی سے آپ کی ملاقات کرواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے موبائل کے کچھ بٹن دبائے اسکرین جب روشن ہوگیا تو موبائل اس نے میری طرف بڑھادیا۔ اسکرین پر سیاہ شلوار اور لمبے کرتے میں ارغوانی رنگ کی واسکٹ پہنے اور سر پر چینٹ دار گول ٹوپی لگائے بے ڈول بدن کا ڈاڑھی والا ایک پٹھان ہاتھ میں ننگی تلوار لئے کھڑا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس ہی ایک آدمی جس کی دونوں کلائیاں پیٹھ کے پیچھے رسی سے بندھی ہوئی تھیں، فرش پر سینہ کے بل پڑا ہوا تھا۔ یکایک وہ تلوار والا پٹھان اپنا ایک گھٹنا اس کی پیٹھ پر رکھ کر بیٹھتا ہے۔ اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی سے اس کے سر کے بالوں کو کھینچ کر فرش پر پڑے آدمی کا چہرہ اوپر کی جانب اُٹھاتا ہے اور اللہ اکبر کا بلند نعرہ لگا کر اُس کی اوپر کھنچی گردن پر مہارت کے ساتھ تلوار کا دھاردار پھل چلا دیتا ہے یہاں تک کہ سر تن سے جدا ہو جاتا ہے۔ پھر زمین پر لرزتے ہوئے بے سر کے تن کی پیٹھ پر کٹے ہوئے سر کو رکھ دیتا ہے۔ زمین پر خون کی نہر بہہ اُٹھتی ہے اسی وقت ایک عبارت پیش منظر میں ابھرتی ہے لکھا ہے۔ ''یہ ظلم نہیں۔ بڑے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد ہے۔''

میں اس بھیانک اور دل سوز منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ کچھ پل بعد اس سکتہ کی کیفیت سے نکل کر میں سانس روکے ماجد کی طرف دیکھتا ہوں اور پوچھتا ہوں۔

''یہ سب کیا ہے؟'' جواب میں ماجد چپ رہتا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں۔

''اپنے حلیے سے یہ افغانستان کا کوئی طالبان لگ رہا ہے شائد۔'' ماجد کوئی جواب نہیں دیتا، اپنا موبائل جیب میں رکھ کر گھر سے باہر چلا جاتا ہے۔ لیکن اس موضوع کو لے کر دوسرے دن ناشتے پر ماجد سے میری جو بات ہوئی اس نے مجھے اور بھی پریشان اور فکر مند کر دیا تھا میں

نے اس سے پوچھا تھا۔

''کیا وہ افغانستان میں کھینچی گئی کوئی فلم تھی؟''

''معاملہ افغانستان، ترکستان یا بلوچستان کا نہیں ہے۔ معاملہ تو ان وسائل کا ہے جن کی مدد سے یہ منظر آپ تک پہنچ رہا ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا تھا۔ ''ٹکنالوجی کی مدد سے ایسے قصائی بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں، جو ٹائم بم کی طرح کہیں بھی اور کبھی بھی پھٹ سکتے ہیں۔ اس کو ٹکنالوجی کلچر کی ایک چھوٹی سی سوغات کہا جاتا ہے۔'' اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا مگر میں اس کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے اس سے معلوم کرنا چاہا کہ کیا وہ طالبانوں کا ہمدرد ہے۔'' کیا وہ مذہبی آدمی ہے، آخر اس نے اس فلم کو اپنے موبائل پر ڈاؤن لوڈ کیوں کیا؟ جواب میں وہ میرے سارے سوالوں کا مذاق اُڑاتا رہا۔ پھر بولا۔'' اس کو آپ لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ سمجھ لیجیے۔ یہ چیزیں میرے لئے ایسپرین کا کام دیتی ہیں۔'' اس میں شک نہیں کہ ماجد کو بہ ظاہر مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنے علاوہ کن چیزوں سے دلچسپی تھی یہ بتانا مشکل ہی تھا۔

اس واقعے کو کوئی دن گزر چکے تھے ماجد اپنا تبادلہ کرا کر ماں کے پاس جا چکا تھا۔ اس کے معاشقے نے اتنے عرصے میں کیا صورت اختیار کی تھی اس کی جستجو بھی میرے اندر اب پہلی جیسی نہیں رہ گئی تھی لیکن ایک دن دفتر کے کچھ لوگوں میں ایک عجیب سی کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ بات کو کریدنے پر اتنا معلوم ہوا کہ ماجد نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر ان کی شمولیت کے بغیر سیکڑوں میل دور کسی شہر میں اپنی پسند کی شادی کر لی ہے۔ یہ بات میرے لئے خوشی کی بھی تھی اور کچھ تشویش کی بھی۔ میں نے ماجد سے فون پر بڑی بے صبری سے اس پُر اسرار خبر کی تصدیق چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ خبر درست تھی اور وہ لڑکی وہی تھی جس سے ماجد راتوں میں موبائل پر باتیں کیا کرتا تھا۔ اتنی معلومات ہونا میری جستجو کے لئے کافی تھی۔ حالانکہ تفصیل کے طور پر جاننے کے لئے ابھی بہت کچھ باقی تھا مثلاً یہی کہ شادی کیوں کر ہوئی، گھر والے کیوں شریک نہیں ہوئے اور شادی کر کے ماجد اپنی بیوی کو کہاں لے کر آیا اور لڑکی فی الحال کہاں مقیم ہے۔

ماجد کی شادی کی خوش خبری مجھ تک پہنچے ہوئے غالباً ایک ماہ گزرا ہوگا کہ ایک دن

میرے گھر کی کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا وہی مقامی خاتون ایک بار پھر دروازے پر کھڑی ہیں جنھوں نے خود کو کچھ عرصہ پہلے ماجد کی معشوقہ کی کسی سہیلی کی بڑی بہن کہہ کر متعارف کروایا تھا۔ اس اجنبی خاتون نے جو سنسنی خیز باتیں مجھے بتائیں وہ اخباروں کے لئے تو اچھا خاصا مصالحہ تھا لیکن میں تو جیسے تھرا کر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ ماجد نے لڑکی کو اس بات پر رضامند کیا کہ بارات میں مع اپنی والدہ کے وہ کسی عزیز کو شریک نہیں کرے گا۔ اور صرف دو چار دوستوں کے ساتھ بارات لے کر آئے گا۔ ہوٹل میں قیام کرے گا اور دلہن کو رخصت کر کے ہوٹل میں لائے گا پھر شب عروسی گزار کر دوسرے دن ہنی مون کے لئے کسی پہاڑی اسٹیشن پر لے جائے گا۔ لڑکی کے ماں باپ راضی ہو گئے۔ یہ ان کے گھر کی پہلی اور آخری شادی تھی انھوں نے پورے اہتمام اور تمام رسومات کے ساتھ بیٹی کا عقد اور مہمانوں کی ضیافت کر کے اسے رخصت کیا۔ لڑکی رات بھر اپنے دولہا کے ساتھ ہوٹل میں رہی وہاں دونوں کے درمیان زن و شوہر کا رشتہ قائم ہوا لیکن دسرے روز تین پہر دن گزارنے کے بعد دولہا اپنی دلہن کو ہوٹل میں چھوڑ کر اور دلہن کی ماں کو یہ فون کر کے کہ ماجد کی والدہ دل کا دورہ پڑنے سے اسپتال میں بھرتی کی گئی ہے الٹے پیروں جہاں سے آیا تھا وہاں واپس ہو گیا۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی اسی نے موبائل پر لڑکی کو بتایا کہ وہ اسے طلاق دے چکا ہے۔ طلاق کی نوعیت کیا تھی یہ بھی وہی جانتا تھا۔ لڑکی کی ماں نے فون پر ماجد کی والدہ سے جب بات کی تو اس نے جواب دیا کہ لڑکی والوں نے نہ تو شادی کے معاملے میں اس کی ایما لی اور نہ اس کو شریک کیا گیا۔ اس لئے جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ماں پر عائد نہیں ہوتی۔ جب لڑکی کی ماں نے قانونی چارہ جوئی کے لئے وکیلوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ جہیز کا مقدمہ قائم کرنا پڑے گا۔ لڑکی کو بہت سے جھوٹ بولنا پڑیں گے۔ دو تین سال کی مدت کے بعد تقریباً تین لاکھ روپیہ لڑکا گلو خلاصی کے عوض دے گا جس میں سے آدھی رقم وکیل اپنے محنتانے کے بہ طور لے لے گا۔ لڑکی کے ماں باپ ضعیف اور بیمار ہیں دوسرا کوئی دوڑنے دھوپنے والا گھر میں نہیں۔ مقدمہ لڑنا ان کے لئے عذاب تھا مگر لڑکی نے یہ کہہ کر ان کی مشکل آسان کر دی کہ وہ عدالت میں اپنے وکیل کے سکھائے ایک بھی جھوٹ کو بولنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ یہ احوال بتا کر وہ خاتون کمرے سے

باہر آئی کچھ فاصلے پر کھڑی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ کر آواز لگائی ٹیکسی سے چادر میں لپٹی ایک لڑکی اتری جس کے ساتھ وہ کمرے میں واپس آئی۔ میں نے دیکھا وہ وہی تصویر والا چہرہ تھا، بھولا سا، اداس اور شرمیلا سا چہرہ۔ اس لڑکی نے صرف مجھے اتنا بتایا کہ نکاح سے پہلے جب ماجد ڈائس پر آکر بیٹھا تو بھی بار بار وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور نکاح کے بعد بھی وہ مسلسل موبائل پر ہی مصروف تھا۔ پھر وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''انکل میں آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے اس قصائی سے ملوا دیجئے۔'' میں نے مردہ سی آواز میں بتا دیا کہ ماجد کا تبادلہ ہو چکا ہے اور وہ اپنے وطن اپنی والدہ کے پاس جا چکا ہے۔''

میرے لئے یہ افسوس ناک واقعہ تھا۔ جب مجھے ماجد سے اس موضوع پر بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اس سے پوچھا'' یہ تم نے کیا کیا ماجد تم سے ایسی امید نہ تھی۔'' بڑا مقصد حاصل کئے جانے والے فیصلے جلد بازی میں نہیں کرنا چاہئے''۔ یہ سن کر میں اپنا غصہ نہ روک سکا۔ بولا'' یہ قصائی پن تم نے کیوں کیا؟'' اس کا جواب تھا۔

''کیسا قصائی پن۔ شادیاں ہوتی ہیں تو طلاقیں بھی ہوتی ہیں۔''

اس گفتگو کے بعد ماجد سے پھر میری ملاقات نہ ہوئی۔ ایک موسم گرما کی شام جب عید کا تیوہار قریب تھا میں گھر کے لئے کچھ خریداری کے واسطے بازار گیا۔ چوڑی والی گلی میں اس شام خواتین کا مجمع تھا وہیں مجھے اتفاق سے وہ خاتون مل گئیں جو ایک بار ماجد کی محبوبہ کو میرے گھر لے کر آئی تھیں میں نے ان سے اس لڑکی کے ساتھ ہونے والے حادثے پر افسوس کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ اس لڑکی کے سامنے جینے کا کوئی مقصد نہ رہ گیا تھا اس لئے اس نے پھانسی لگا کر خودکشی کر لی۔ یہ خبر سننے کے بعد نہ جانے کیوں کئی بار میری آنکھوں کے سامنے تلوار سے سر کاٹنے والا وہ دردناک منظر گھوم گیا جو ماجد نے کبھی موبائل کے اسکرین پر مجھے دکھا کر ایک قصائی سے ملوایا تھا۔

انھیں دنوں کی ایک رات میں نے خواب میں ماجد کو دیکھا۔ اس کے بدن پر ایک مختصر سی چڈھی کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا وہ ننگے بدن ایک اونچی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے کندھے

کے سہارے چمڑے کی ایک پیٹی لٹک رہی تھی جس میں ایک خاصہ بڑا سا خنجر بندھا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں اسے خائف نظروں سے دیکھتا رہا پھر میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

''بلاشبہ تم بے حد کمینے آدمی ہو۔'' میری کہی گئی اتنی سخت بات پر ذرا بھی برا مانے بغیر اس نے سوال کیا۔

''کیوں؟''

''تم نے اس سیدھی سادی معصوم لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ کرسی سے اُٹھا کندھے پر لٹکا ہوا خنجر کرسی کی پشت پر ٹانگا اور اپنے بدن سے چڈھی کو یوں اتارا جیسے وہ کسی کے سامنے نہیں بلکہ غسل خانے میں اکیلا ہو۔ میں نے اس کو مادرزاد ننگا دیکھا۔ اس نے چڈھی کو کرسی کی سیٹ پر رکھ کر ہاتھوں سے اس کی سلوٹوں کو برابر کرنے کا کام کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر ہم بد قسمتی سے اپنی پسند کی زندگی جی نہیں پائیں لیکن ہمیں اپنی پسند کی موت مرنے کا موقع مل جائے تو اس طرح کی موت مر جانے میں کونسی برائی ہے۔'' یہ کہہ کر ماجد نے کسی کو پکارا میں نے دیکھا کہ آواز پر کوئی اندر آیا مگر چہرہ نظر نہیں آیا مادرزاد ننگے ماجد نے اس کو اپنی چڈھی پکڑا دی۔ آنے والے نے ہاتھ بڑھا کر چڈھی لے لی اور جب واپس جانے کے لئے پلٹنے لگا تو اس کے چہرے پر روشنی پڑی میں نے صاف پہچان لیا کہ وہ زویا ہے میری اکلوتی بیٹی زویا جو بی.اے کے آخری سال میں پڑھ رہی تھی میرے منھ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں ماجد کو گھورتا رہا پھر یہ سوچ کر کہ ماجد کیا میری بیٹی کے سامنے بھی مادرزاد ننگا تھا میری نظر اس کی ناف کے نیچے پھسلی جہاں سیاہ بالوں کے گھناؤنے گچھے تھے میں نے ابکائی لی اور میری آنکھ کھل گئی۔ میرا بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا اور میں زویا کو چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔

اس روز سارا دن میں ایک عجیب سی کیفیت میں مضطرب رہا۔ دوپہر کو دفتر میں میری بیوی کا فون آیا خدا جانے کیوں اس اضطراب میں سب سے پہلے میں نے بیوی سے اپنی بیٹی زویا کی خیریت پوچھی۔ میری یکا یک اس غیر متوقع دریافت پر بیوی کو کچھ حیرت ہوئی۔ بولی'' کیوں؟'' زویا کو کیا ہوا ہے۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔'' پھر میری بیوی نے مجھے بتایا کہ زویا بہت

دنوں سے اپنے ماموں سے موبائل دلانے کی ضد کر رہی تھی۔ جو اسکے ماموں نے آج اسے تحفے میں دیا ہے کیوں کہ آج اس کی اٹھارویں سالگرہ ہے۔ یہ سن میں پھر ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو گیا ایک ہیجانی حالت میں زویا کو اسکے موبائل پر یہ سوچ کر فون کیا کہ اس کے یوم پیدائش پر اسے مبارکباد ہی دے دوں۔ ''ہلو....'' ادھر سے جانی پہچانی زندگی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز آئی ایک پل اس آواز کا سحر مجھے اچھا لگا پھر میں سینے میں کروٹیں لیتے اضطراب کو دباتے ہوئے بولا۔ ''بیٹی، اپنا خیال رکھنا۔'' میرے منہ سے مبارکباد کا ایک لفظ بھی نہ نکلا بلکہ اس کی جگہ باوجود اپنے کو پوری طاقت سے روکنے کے میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

یادِ بزرگاں و دوستاں

لکھنؤ

۷ر فروری ۲۰۰۱ء

پیارے اقبال مجید

تمہارا خط ملا۔ تم نے لکھنؤ کو شہر نگاراں لکھا ہے۔ مجھے پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ کبھی ٹیگور کی کابلی والا پڑھی تھی وہ یاد آ گئی کہ وہ افغانی جب پندرہ سال کے بعد جیل سے چھوٹا تو اس نے سب سے پہلے ۵ سال کی مُنّی کے لئے چوڑیاں خریدیں۔ اس کے ذہن میں یہ نہیں آیا کہ وہ اب بیس سال کی جوان لڑکی ہوگی۔ اسی طرح جس نگار کی وجہ سے تم اس کو شہر نگاراں کہتے ہو وہ بیچاری کب کی بوڑھی ہوگئی، دانت گر گئے، آنکھوں کے پپوٹے لٹک آئے۔ اس کے عشاق بھی اب نیم کور، گراں گوش اور گھٹنوں کے درد سے معذور ہو گئے ہیں۔ نہ کوئی دانش محل رہ گیا، نہ نعمت اللہ روڈ نہ ادبستان۔ سبطِ اختر آیا تھا اسی کابلی والے کی طرح بےچین۔ ہم سب سے مل کر چلا گیا۔ ہم میں اتنا بھی نہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھنے جائیں لکھنؤ میں تو لوگ ایک دوسرے کو فون بھی نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔۔

تمہارا

شارب ردولوی

قصۂ نازیبا

اب جبکہ میرے سر میں بڑھاپے کی دودھیا چاندنی چھٹک رہی ہے تو مجھے یاد آتا ہے ہے کہ اس چھوٹی سی زندگی میں کیسے کیسے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا جنھوں نے میری ذات کی تکمیل میں بڑا قیمتی حصہ لیا۔ انھیں میں ایک پروفیسر بھی تھا۔ اس پروفیسر سے میرا سابقہ تب پڑا جب میں فلسفے کے مضمون میں ایم فل کر رہی تھی۔ میرا پروفیسر 555 سگریٹ کا بھرا ہوا ڈبہ اپنی کار میں رکھ کر صبح نو بجے یونیورسٹی میں داخل ہوا کرتا اور واپسی میں وہ ڈبہ خالی ہو کر کار میں ایک طرف لُڑھکا پڑا ہوتا۔ اس نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ میں ریاضی کی معلومات نہیں رکھتی اس لئے آگے چل کر میں برٹرنڈ رسل پر کام کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لاؤں۔ پروفیسر کی عمر زیادہ نہ تھی غالباً وہ مجھے کبھی کبھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر یونیورسٹی کے دوسرے کونے پر سرخ پتھروں سے بنی اسٹاف کینٹین میں لے جاتا اور ٹھنڈی کوکو کا گلاس پلاتا اور خود لیموں کی ارغوانی چائے پیتے ہوئے مغربی فلسفے پر ڈھیر ساری باتیں کرتا۔

میں اسے بتا چکی تھی کہ پندرہ برس کی عمر میں ایک بلوے میں شکار ہونے کے بعد میں ایک نرسنگ ہوم میں لائی گئی تھی جہاں ایک بڑی انقلابی لیڈی ڈاکٹر نے جو خدا کی منکر تھی اور خاصے ترقی پسند خیالات والی خاتون تھی سارے مردوں کو ننگی ننگی گالیاں دیکر میرے زخم میں پانچ ٹانکے لگائے تھے کیونکہ مجھے اجتماعی طور پر ریپ کیا گیا تھا۔ یہ موضوع کینٹین میں چائے پینے کے دوران شروع ہوا تھا جس میں نندنی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

''نندنی کی باتوں نے میرے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا''۔

''کون نندنی؟'' پروفیسر کے استفسار پر میں نے اسے بتایا کہ وہی انقلابی لیڈر جس نے میرے ٹانکے لگائے تھے اور چند روز اپنے نرسنگ ہوم میں رکھ کر میرے مفلوج ہوش و حواس کا علاج کیا تھا۔ پھر میں نے پروفیسر کو وہ ساری باتیں بتائیں جو نندنی کو بتا چکی تھی کہ کس طرح

کئی برس پہلے قصبے میں ہماری بستی کو سیکڑوں بلوائیوں نے گھیر کر گھر کی نقدی ااور زیورات کا مطالبہ کیا تھا بالکل اسی طرح جیسے تقسیم کے زمانے کے فسادات میں کہیں کہیں کیا گیا تھا اور ہمیں صرف ایک رات کی مہلت دی گئی تھی، لیکن جب رات گئے دوسرے گاؤں کے بلوائیوں کے جتھے بستی کو گھیرے ہوئے بلوائیوں میں شامل ہو گئے تو اانہوں نے اُس رحمدلانہ اقدام کو مسترد کر کے بڑی سفا کی سے بستی پر دھاوا بول دیا، بزرگوں نے خاندان کی جوان اور کنواری لڑکیوں کو اپنی عفت اور عصمت بچانے کے لئے کنویں میں پھاند پڑنے کا حکم دیا لیکن میں کنویں میں جھانکنے سے لرزتی تھی، پھر الہڑ پن کی عمر میں جینے کی امنگ بہت تھی اور مرنے سے بہت ڈر لگتا تھا میں نے پھاندنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور جب دیکھا کہ مجھے زبردستی کنویں میں ڈالنے کا ارادہ کیا جا رہا تھا تو میں بھاگ نکلی اور بلوائیوں کے ہاتھ لگی جن میں سے تین مردوں نے میری تکا بوٹی کر ڈالی۔

ایک غیر سرکاری تنظیم نے مجھے اسٹریچر پر نندنی کے پاس بھیجا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ نندنی جی اس تنظیم کی ایک ممبر تھیں۔ اس لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا تو مٹھی بھینچ کر اور دانت پیس کر بولی تھی۔

''ریپ ہمیشہ عورت کا ہی کیوں ہوتا ہے، عورت مردوں کو اس حادثے میں مبتلا کیوں نہیں کر سکتی۔ تین چار لڑکیاں مل کر ایک مرد کو چپلیں مار مار کر اس کی مرضی کے خلاف اسے طرح طرح کی ایذائیں پہنچا پہنچا کر اپنے لئے کیوں استعمال نہیں کرتیں'' اور پھر اس کی رانوں کے درمیان کے عضو کو دانتوں سے لہولہان کر کے اسے سرجن کی میز پر کیوں نہیں پہنچا سکتیں، نندنی بڑی عجیب تھی، اس کی آنکھیں لوگوں کے بدن کے آر پار دیکھ لیا کرتی تھیں، اس کی باتیں اس وقت اگر چہ میری سمجھ میں نہ آیا کرتیں مگر انھیں سن کر میری آنکھیں پھیل جایا کرتیں اور سوچتی نندنی کے پاس عجیب الفاظ تھے اور ان میں کتنی قوت اور کشش تھی۔

نرسنگ ہوم سے چھٹی پا کر وہاں سے نکلتے وقت نندنی نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا، چائے پلائی تھی، دو جوڑے کپڑے اور کچھ چیزیں دی تھیں اور پوچھا تھا۔

''ٹھیک ٹھیک بتاؤ تم کنویں میں کیوں نہیں کودی تھیں؟''

''شائد میں کنویں سے بہت ڈرتی تھی یا پھر میں نے سوچا تھا جو بھی ہو میں خود سے مرنا نہیں چاہتی''

تب نندنی نے مجھے بتایا کہ اخباروں کی خبر کے مطابق اس کنویں سے گیارہ لڑکیوں کی لاشیں نکلی تھیں، ان کا قصور یہ تھا کہ وہ اس روائت کی پابند تھیں یا انھیں پابند کیا گیا تھا کہ عورت کو جان دے دینا چاہیۓ مگر اپنی عصمت کو نہیں گنوانا چاہیۓ، چلتے وقت نندنی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

''تمہارا گھر برباد ہو چکا ہے، سب مارے گئے ہیں، میں تمہیں اس نرسنگ ہوم سے جہاں بھیج رہی ہوں وہاں تمہاری پیٹھ ٹھوکی جائے گی تم نے کنویں میں کودنے کی روائت کو نہیں مانا، کیونکہ روائت کو اس کے حق سے زیادہ دینے پر ہی ظلم اور بے انصافی شروع ہوتی ہے اور حق سے زیادہ دینے کے لئے کبھی کبھی اپنے وجود تک کو داؤں پر لگا دینا پڑتا ہے لیکن جب وجود ہی نہیں رہ جاتا تو روائت کس کے لئے بچتی ہے''

یونیورسٹی میں کچھ وقت گزرنے کے بعد پروفیسر سے میرے معاملات بڑی پیچیدہ صورت اختیار کر رہے تھے، کچھ تو میرا رنگ روپ، کچھ میری وہ صلاحتیں جو میرے لائق اور کامیاب شاگرد بننے کے امکانات اسے دکھا رہی تھیں یہ چیزیں میری جانب اس کو کچھ ایسی بیقراری سے کھینچنے لگیں کہ اسے اپنی خود اعتمادی کمزور ہوتے محسوس ہونے لگی جس کے سبب اس نے جلد ہی ان دلچسپیوں کی پرورش کا خیال رکھنا شروع کر دیا جو غیر معمولی ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن اس کے احتیاط کے باوجود پردہ ادھر یا اُدھر کھسک ہی جایا کرتا۔ اس کی یہ دلچسپی ایک نامعلوم سی تقویت اور خوشی تو مجھے ضرور دے رہی تھی لیکن تھوڑا تھوڑا ڈرانے بھی لگی تھی۔ نندنی کی بڑی بہن کے گھرانے نے جہاں میں اپنے ماں باپ اور گھر بار کو کھونے کے بعد پلی بڑھی، میرے دل و دماغ میں ایک بات سولہ برس کی عمر سے ہی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی وہ بات اس لئے بھی میں۔ نے جلد سیکھ لی تھی کہ شائد جانے ان جانے میری زندگی کا وہ سب سے بڑا حادثہ اس سبب ہی سے تو ہوا تھا جس نے ایک لمحہ میں میری ایک زندگی کو چھین کر دوسری نئی زندگی میری جھولی میں ڈال دی تھی ورنہ میں اپنے خاندان کی تربیت میں یہ زندگی شائد نہ حاصل کر پاتی اور اگر ایسا نہ ہو پاتا تو

میں بھی ان لڑکیوں میں سے ہی ہوتی جن کی لاشیں کنویں میں ملی تھیں۔

نندنی کی بڑی بہن بہت مالدار تھی، مشہور اور باعزت سوشل ورکر تھی، اخباروں میں لکھتی تھی، Human right کے کمیشن کی ممبر تھی، انگریزی میں اس کی ناولیں مشہور تھیں، اس گھر میں اپنی تربیت کے برس میں بھول نہیں سکتی، نندنی کی بہن فسادوں میں لُٹی پٹی بستیوں میں مجھے بھی لے کر جاتی تھی اور خانما برباد لوگوں کی بحالی میں مجھے بھی شامل کرتی جاتی اور کیمپوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ویسے لوگوں سے ملواتی جن کے بیدار ضمیر کی طاقت نے مشکل وقت میں مداخلت کر کے بیکسوں کی عزت اور ناموس کو بچایا تھا۔ اس گھر میں مجھے سکھایا گیا تھا کہ دنیا میں انصاف اور ایمانداری کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی کہ انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اپنا ضمیر بھی لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے بار بار ٹوک ٹوک کر، دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں حرام کر کے مجھے سستے اور فوری فائدوں پر بے شرمی سے لپکنے سے بچانے کے لئے مجھ میں یہ عادت ڈالی گئی تھی کہ خود کو بھی اور دنیا کو بھی سمجھنے کے راستے میں اگر ضمیر کو ہر طرح کے خوف اور مصلحتوں سے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو آدمی کی زندگی کتے کی طرح گزرتی ہے۔ پروفیسر جب مجھ میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے جذبات کی پردہ پوشی میں ناکام رہتا تو میں گفتگو کا موضوع بدل کر اسے فلسفے پر لے آتی اور وہ مشکل گھڑی ٹل جاتی، گھر آ کر سوچتی کہ وہ کنوارا ہے، عمر میں بھی مجھ سے دس بارہ برس بڑا ہے، میرا ایم فل کا آخری سال ہے، سوچتا ہوگا کہ مجھے امتیازی ڈگری حاصل کرنے کے لئے بہ طور خاص کچھ مراعات چاہئے ہوں گی تو میرے دل کو ٹھیس لگتی، اگر وہ میرا پروفیسر نہ ہوتا یا اس کے ہاتھ میں مجھے ایسا فائدہ پہنچانا ممکن نہ ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ کنھیں دوسری وجوہات کے سبب اس کے فلرٹ کرنے پر کوئی جنسی حکمت عملی اختیار کرتی لیکن میں تو اس کی ایک انتہائی خود اعتماد شاگرد تھی اس لئے اپنی اس خود اعتمادی کی قوت کو استعمال کرتے ہوئے ایک دن میں نے اس سے کہہ دیا کہ بڑا کام کرنے کی تمنا رکھنے والوں کو خود اعتمادی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے میں اس سے امتحانات ختم ہونے کے بعد ہی ملونگی۔

پروفیسر ذہین تھا۔ میرے شبہات کو بھانپ گیا، کافی دیر چپ رہ کر اس نے استادوں کے ہی انداز میں ہدایت کی کہ آگے چل کر مجھے فوکو (Faucault) کو تفصیل سے پڑھنا

چاہئے کیونکہ جنس کے بارے میں میرا تصور فطری نہیں اور شائد اسی کم علمی کے سبب میں خود اپنے آپ سے بھی اور اپنے پروفیسر سے بھی ڈر کر ایک غیر فطری فرار کا راستہ اختیار کر کے اس سے میل ملاپ کا سلسلہ عارضی طور پر روک دینا چاہتی ہوں، پھر اس نے یہ بھی کہا کہ کیونکہ میں فلسفے کی طالب علم ہوں اس لئے میرا یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جنس کے بارے میں عام لوگوں کی طرح میری بھی معلومات یا تو ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی ہے یا ماہرین نفسیات کی یا پھر مذہبی رہنماؤں کی رٹائی ہوئی ہے پھر اس نے دوٹوک بات کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔

''آج سے تم کو میری باتوں میں ایسی کسی ترغیب کا اشارہ بھی نہیں ملے گا جس سے ڈر کر تم مجھ سے بھاگ رہی تھیں، سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری ذات کی تعمیر میں تمہاری تھوڑی سی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لئے مسلسل ایک مکالمے کا جاری رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ خود آگہی دو کے بغیر ممکن نہیں''۔ پھر وہ مجھے نظر بھر کر دیکھتا رہا جس سے میں سہم سی گئی، پھر آہستہ سے بولا۔

''ایک ماڈرن اور تعلیم یافتہ گھرانے نے تمہاری پرورش کی ہے، نندنی جی میری اچھی دوست ہیں ان کی بڑی بہن کی میرے دل میں عزت ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم نیم خواندہ لڑکیوں کے فکری رویّوں میں ضروری تبدیلی لانے کی کوشش کرو اس لئے کہ عام طور پر عورت کو خاموش رکھا گیا ہے، تم خود بھی عورت ہو، تمھیں اس خاموش عورت کی روح کی تہہ میں سفر کرنے کے قابل بننا ہے، اس کو نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں لیکن وہ اپنے تجربوں کو زبان نہیں دے پا رہی ہے اس طرح کہ جس طرح تمھیں انھیں زبان دینے کے قابل بنایا جا رہا ہے۔ کیا تم جانتی ہو کہ تمہاری طرح لاکھوں ہندو اور مسلمان کنواریاں ہر دم کہیں نہ کہیں زور پشتوں اور بلوائیوں کے نشانے پر ہیں اور کسی وقت بھی اغوا، بے گھری اور زنا کا شکار ہو سکتی ہیں، تمہیں ان کو خود اپنی ذات کی طرح ایک طاقت ور اور خود آگاہ ذات میں بدلنے کا کام کرنا ہے، ذات کی نمود اور پرداخت کا کام آسان نہیں ہے اس لئے بہ حیثیت عورت تمھیں جاننا چاہئے کی طاقت اور جنس کے درمیان وہ رشتہ کیا ہے جس کی پردہ پوشی کی جاتی ہے، وہ پر تشدد طاقت اور فرقہ وارانہ نفرت جس کی تم شکار ہوئی ہو جنس کو اپنا نشانہ ہی نہیں بناتی بلکہ اسٹریجک (Strategic) طاقت بھی جنسی مظالم اور بے انصابیاں کرتی ہے، تمہیں میرے ہی مکالموں سے نہیں بلکہ

دوسرے ذرائع سے یہ سیکھنا ہوگا کہ جنگ اور تجارت کیسے بھیس بدل کر جنسی استحصال کو انجام دیتی ہے ثقافت اور سیاست کے کھیل اور شاندار ڈراموں میں جنس آلۂ کار کیسے بنتی ہے''۔

ان واقعات کو برسوں گزر گئے ہیں۔ اب میں خاصی ضعیف ہو چکی ہوں، میں نہیں جانتی کہ اپنی آپ بیتی کبھی لکھ سکوں گی اگر لکھ سکی تو یہ اعتراف ضرور کروں گی کہ یونیورسٹی میں فلسفے کے درس سے فرصت پانے کے کچھ سال بعد میں نے اپنے ضمیر پر کوئی بھی بوجھ محسوس کئے بغیر بہت سے شب و روز پروفیسر کے ساتھ اکیلے رہ کر گزارے اور عورت کے تقدس کی روایتی پہچان سے انکار کیا لیکن میرے لئے یہ ذرا سی بھی حیرت کی بات نہ تھی کہ کسی نے میرے منھ پر مجھے چھنال نہیں کہا۔ مجھ میں یہ طاقت کہاں سے آئی اس کا صحیح پتہ مجھے تب چلا جب نندنی اور اس کی بہن کے دائرہ اثر سے قائم کی گئی پرائیویٹ ویمن پالی ٹکنک کی لائبریری کا کاروبار کچھ دیر دیکھنے کے لئے میں کالج جانے لگی کیونکہ اس کا ڈپلوما میرے پاس تھا۔ وہاں درمیانی اور نچلے درمیانی طبقوں سے آنے والی لڑکیوں کو میں نے قریب سے دیکھا، ان لڑکیوں کے کپڑے، سر کا معمولی خوشبودار تیل، گھسی ہوئی چپلیں، سہمی سہمی سی چال ڈھال بات بات پر بے وجہ شرمانا، اردگرد کی دنیا سے بے خبری، فلمی دنیا کا عاشقانہ تصور، مطلب کی ادائیگی کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈ نہ پانا۔ ہر کام میں سستی، دبی کچلی نفسیات، سینوں میں ایک دوسرے کے لئے بھرا بغض وحسد، ان کی زود رنجی، تنگ ذہنی اور تنگ دلی، سوکھے ہوئے چہرے مرجھائے ہونٹ، خوابوں سے یکسر خالی آنکھیں۔ ان میں سے کسی کے اندر بھی زندگی کی محرومیوں کو اپنی طاقت بنا لینے کا عزم جب مجھے نظر نہیں آتا تو میں اداس ہو جاتی اور سوچتی کہ ان میں سے کوئی بھی لڑکی کسی بھی ارادے سے ایک شب کسی لڑکے کے ساتھ تنہائی میں بسر کرلے تو صبح اسے کس نام سے پکارے جانے کی توقع ہے اور کیوں؟ اور پھر شب و روز اسکنڈل اگلتے ان کے محلے، گلیاں اور کوچے ان کے گھروں کو، ان کی ماؤں اور باپوں کو بھائی بہنوں کو پلک جھپکتے انسان کے بجائے بپھرا ہوا شیر، چیتا، تیندوا اور سانپ بچھو بنا دیں گے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا، کنویں اب گھروں میں نہیں رہ گئے ہیں تو کیا ہوا چھت پر لٹکنے کے لئے پنکھوں کی کڑیاں تو ہیں۔ ان لڑکیوں کا یہ دردناک انجام نندنی کے خیال میں اس لئے ہونے کا خطرہ تھا کہ ان جیسی لڑکیاں دسروں کی وضع کی ہوئی حقیقتوں میں بسر کرنے کی اس لئے عادی بن چکی تھیں کہ انھیں خود اپنی سچائیوں کو خود تشکیل

دینے کا نہ تو حوصلہ تھا اور نہ طاقت ۔ اور وہی حوصلہ اور طاقت نندنی مجھ میں پیدا کرانا چاہتی تھی۔

یہ انھیں دنوں کی بات ہے جب ویمن پالی ٹکنک کے اسٹاف روم میں نجمہ سے میری ملاقات ہوئی، میں نے اسے کمرے کے ایک کونے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، دوپٹے کی سیاہ داؤنی میں اس کا سرخ وسپید چہرہ، جگ مگ کرتی پُرکشش شربتی آنکھیں جن پر گھنی اور نوکیلی سیاہ پلکیں، دراز قد، چھریرا بدن، نازک نازک مخروطی انگلیاں میں اسے نظر بھر کر بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی، جب تعارف ہوا تو پتہ چلا وہ انگریزی پڑھانے کے لئے رکھی گئی تھی اور بیچاری کی فرسٹ ڈویزن صرف تین نمبروں سے رہ گئی تھی۔ لیکن چھٹی کے بعد جب وہ گھر جانے لگی تو یہ دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا کہ وہ کپ بورڈ سے اپنا برقعہ نکال کر پہن رہی تھی۔ ہم روزانہ ہی ملنے لگے، وہ ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھی، طرح طرح کے پکوان ٹفن میں لاتی مجھے تلاش کر کے اور ساتھ بٹھا کر کھانے کے لئے اصرار کرتی، وہ میری ایک اچھی دوست بن گئی تو میں نے اسے زندگی کے زیادہ اہم مسائل کی جانب راغب ہونے کی ترغیب دینے کی کوشش کی۔ ایک دن میں نے اسے یہ کہہ کر متوجہ کیا کہ اس کی عمر کی باشعور لڑکیوں کی ایک ایسی منطق اور مدلّل زبان کو تشکیل دینے کی اجتماعی کوشش کرنی چاہئے جوان کے ماضی حال اور مستقبل کو ایک ایسی داستان میں بدل کر رکھ دے جو اپنی سچائی کے سبب اتنی باا ثر ہو کہ سب کی راتوں کی نیند اڑا کر رکھ دے۔ وہ میری باتیں سنتی، مجھے غور سے دیکھتی پھر ایک لمبی سانس بھر کر گردن جھکا لیتی۔ ایک دن جب مجھے پتا لگا کہ اس کا باپ ڈاکٹریٹ ہے اور پروفیسر ہے تو میں نے ہمت کر کے اس سے ایک روز پوچھ لیا۔

''کیا تم اپنی برادری کی بدحال لڑکیوں کو دیکھ کر ان میں کسی تبدیلی کی خواہاں نہیں ہو؟''۔

''ہوں تو، مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔'' پھر اس نے جلدی سے ٹفن کھول کر ایک کباب میرے منھ میں بھر کر اگلی کسی بات کے لئے منھ بند کر دیا۔ لیکن مجھے جب بھی موقع ملتا میں نجمہ کو اس کی برادری کی لڑکی بالیوں کی زندگی میں درپیش مشکل مرحلوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتی۔ نیا سوچنا اور نئے خوابوں کو آنکھوں میں بسانے کی تلقین کرتی، میری باتیں سن کر اس کے چہرے پر کبھی ایک رنگ آتا تو کبھی دوسرا، ایک دن میں کسی بات پر برافروختہ سی تھی کہ میں

نے نجمہ سے کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ سے پوچھ کر بتائے کہ نجمہ جیسی عورتیں جو صدیوں سے برف سے زیادہ ٹھنڈی بے حسی سے دوستی کئے ہوئے ہیں، ان کی رائے میں اس کا سبب کیا ہے اور یہ برف کب پگھلے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ نجمہ نے میرا سوال اپنے باپ سے پوچھا یا نہیں لیکن مجھے لگا کہ میرے ساتھ نجمہ کی پہلی سی گرمجوشی میں کچھ کمی آ گئی، کبھی کبھی لگتا کہ وہ کچھ کٹی کٹی اور الگ تھلگ سی رہنے کی کوشش کرتی تھی، مجھے اس سے ایسے رویئے کی توقع نہ تھی۔ ایک دن میں نے اسے لائبریری میں پالیا، جی نہیں مانا اپنے پاس بٹھا کر اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پیار سے اسے دیکھتی رہی، وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ پھر میں نرمی سے بولی۔

''کیا مجھ سے ناراض ہو؟''

''جی بالکل نہیں۔'' نظریں ملائے بغیر اس نے جواب دیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں اس گھر میں پلی ہوں جس نے خانماں برباد لڑکیوں کی بحالی میں اپنا پیسہ، اپنا وقت اور جسمانی محنت صرف کرنے میں کوئی دریغ نہیں کیا اور اس مہم میں بہت سے روشن ضمیر لوگ شامل تھے یہ لوگ سوچتے تھے کہ جیسا کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ویسا ہی کیوں ہوئے چلا جا رہا ہے، ان لوگوں نے دوسروں کی تشکیل دی ہوئی حقیقتوں کو بڑے غور و فکر کے بعد قبول کرنے سے انکار نہ کیا ہوتا تو ان میں اس قدر قربانی دینے اور جانفشانی اُٹھانے کا حوصلہ نہ پیدا ہوتا پھر میں نے نجمہ سے فیصلہ کن بات کی۔

''نجمہ میں چاہتی ہوں کہ تم جو کچھ ہمیشہ سے قبول کیا جاتا رہا ہے اس سے انکار کرنے کی قوت اپنے میں پیدا کرو''۔ نجمہ سب کچھ چپ چاپ سنا کرتی تھی مگر اس بار وہ اپنے اندر کی بےچینی نہیں دبا سکی جلدی سے بولی۔

''مگر آپ مجھ سے کس چیز سے انکار کی امید کر رہی ہیں۔''

نجمہ کے اس سوال نے میرے دل میں اس خلش کو ایک بار پھر زندہ کر دیا جو اسے کپ بورڈ سے برقعہ نکالتے ہوئے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی اس لئے میں نے فوراً کہہ دیا۔

''تم یہ برقعہ پہننے سے انکار کر دو''۔ نجمہ اس وقت ٹھیک میرے سامنے بیٹھی تھی۔ پلکیں جھکائے میز پر نظریں گاڑے رہی، اس کے گال تمتما اُٹھے تھے وہ ایک انگلی سے میز کی سطح کو دو پل کھرچتی رہی پھر کوئی جواب دیئے بغیر اُٹھ کر چلی گئی۔

نجمہ سے میری ملاقات کے اُس واقعے کو کئی دن گزر گئے مگر نجمہ کالج میں نظر نہیں آئی۔ معلوم ہوا بیماری کے سبب چھٹی پر تھی، پھر ایک دن وہ آ گئی، اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی اور چہرہ کھلا ہوا تھا، پتہ لگا اس کی شاید منگنی ہو گئی تھی۔ میں اس سے دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی باتوں باتوں میں ایک بار ہمت مجتمع کر کے اُس سے پوچھ لیا کہ جو باتیں میں اسے اکثر سمجھایا کرتی تھی ان کا ذکر کیا وہ اپنے باپ سے بھی کرتی ہے۔ نجمہ نے اس کا جواب ہاں میں دیا تو مجھے جستجو ہوئی۔

''کبھی تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے باپ کیا کہتے ہیں۔'' نجمہ مسکرائی اور بولی۔

''وہ کہتے ہیں کہ تم اور تمہاری میڈم کے سازو سامان الگ الگ ہیں۔''

''مطلب؟''

''وہ کہتے ہیں جو تمہارے پاس ہے وہ میڈم کے پاس نہیں ہے''۔ یہ سن کر میں نے سیدھے سیدھے دریافت کیا۔

''تمہارے پاس کیا ہے؟'' میرے سوال پر وہ زور سے ہنسی پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔

''میرے پاس وہ ہے جو آپ کو پسند نہیں اور آپ کے پاس وہ ہے جو میرے باپ کو پسند نہیں۔'' یہ سن کر میں کچھ بدمزہ ہو گئی، تھوڑا سا چڑھ کر بولی۔

''خیر تم تو یہ بتاؤ کہ تم کو کیا پسند ہے؟''

''میرے والد کہتے ہیں سب کو سب کچھ نہیں ملتا اس لئے جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر قناعت کرو۔'' یہ سن کر میں کچھ اور زیادہ چڑھ کر بولی۔

''لیکن غور و فکر بھی تو کوئی چیز ہے، اپنی عقل سے کام لو۔ خود تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟''

''جہاں عقل کام نہیں کرتی وہاں وجدان کام آتا ہے ایسا میرے باپ کا کہنا ہے، انھوں نے ڈاکٹر محمد اقبال پر پی ایچ ڈی کی ہے۔'' اس کی بات سن کر میں بجھ سی گئی اور اُسی بجھے پن سے پوچھ لیا۔

''تو تم یہ برقعہ نہیں اتارو گی۔''

''میرے والد کہتے ہیں کہ برقعہ ہماری قدروں نے ہم کو اپنی ضرورتوں کے لئے پہنایا

ہے۔‘‘اس کے جواب پر میں نے پھر اسے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں اور وہ بدل بھی رہی ہیں، یہ سن کر وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذرا بھی تکلف کیے بغیر بولی۔

’’جب تک میں اپنے باپ کی نگہبانی میں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں ویسا مجھے کرنا ہے، جب شوہر کی حفاظت میں چلی جاؤں گی تو جیسا وہ چاہے گا کرونگی۔‘‘ مجھے غصہ آگیا۔

’’یعنی تمہاری زندگی ایک طفیلیئے کی سی زندگی ہے جس کا اپنا کچھ نہیں۔‘‘ پھر میں نے اسے ڈانٹا ’’یہ تم کس بیہودہ زمانے کی باتیں کر رہی ہو۔‘‘

’’زمانے کو گالی مت دیجئے‘‘۔ اس نے ٹوکا

’’کیوں؟‘‘

’’اللہ حدیث قدسی میں فرماتا ہے ’’زمانے کو برا نہ کہو کہ میں ہی زمانہ ہوں۔‘‘

’’اچھا‘‘ میں چونکی یعنی تمہارا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ہی خدا ہے؟‘‘

’’جی۔ ابا بتاتے ہیں کہ یہ بات ڈاکٹر اقبال نے برگساں سے کہی تھی، جسے سن کر وہ اچھل پڑا تھا کہ جس خیال تک وہ پہنچ نہ سکا اسلام اس سے پہلے کیسے پہنچ گیا‘‘۔

میں چپ ہوگئی، پھر بہت دنوں تک نجمہ سے میری ملاقات تو ہوتی لیکن وہ مجھے باتیں کرنے کا موقع نہ دیتی، جتنی اپنائیت میرے اور اسکے درمیان ہوئی تھی اس پر ایک سرد سی بیگانگی کی دھند پھیلنے لگی تھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے بڑی کوفت ہوئی کہ جس طرح وہ والہانہ میری جانب لپک پڑتی تھی اس کا وہ جوش وخروش بجھ سا گیا تھا۔ یہ بات میرے لئے دکھ کی تھی کہ ایک ذہین، خوش اخلاق اور ملنسار اور لگ بھگ ہم عمر لڑکی سے میری باتوں نے مجھے قریب لانے کے بجائے دور کر دیا، کچھ ہی دنوں میں میرے دل نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ کہیں نجمہ سے ربط و ضبط قائم کرنے میں میرا ہی کوئی قدم کسی وقت غلط تو نہیں اُٹھ گیا۔ میں نے بہت سوچا کہ نجمہ سے جو مکالمات میں نے وقتاً فوقتاً قائم کیے ان کا ایمانداری کے ساتھ مقصد کیا تھا؟۔ میرے دل و دماغ نے اس کا جواب یہ دیا کہ میں نجمہ کو اس کی جنس اور دنیا کے بارے میں ایک نیا موقف اختیار کرنے پر اُکسانا چاہتی تھی۔ پھر ایسا کیا ہوا جس نے ہمارے باہمی تعلقات میں

ایک کشاکش سی پیدا کردی۔ میں انھیں الجھنوں میں تھی کہ ایک دن میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نجمہ یکا یک لائبریری میں وارد ہوئی اور مجھ سے گلے لگ کر لپٹ گئی اور اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ میں ٹپٹا گئی پوچھا کس لئے؟ تو وہ ہمک کر بولی

''میرے ابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں''۔ نجمہ کے اس انکشاف نے مجھے خاصہ متجسس کردیا۔ میں نے تھوڑے وقفے کے بعد اس کی دعوت قبول کرلی۔

نجمہ کے والد مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک مجھے بتاتے رہے کہ نجمہ بڑی دلچسپی کے ساتھ انھیں میری باتیں بتایا کرتی تھی۔ پھر انھوں نے اپنے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتائیں۔ یہ بھی کہا کہ وہ سچے مسلمان نہیں، مذہب کے جو احکامات انھیں برتنے میں آسان لگتے ہیں وہ انھیں قبول کرلیتے ہیں۔ سچے مسلمان انھیں مسلمان ہی نہیں مانتے اور جو مسلمان اُن سچے مسلمانوں سے زیادہ سچے ہیں وہ اُن سچے مسلمانوں کو بھی مسلمان نہیں مانتے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر قہقہے لگاتے تھے انھیں مزیدار باتوں کے درمیان انھوں نے خاصی سنجیدگی سے مجھے بتایا کہ نجمہ کو خود ان کی اپنی ترجیحات اور ترغیبات نے بنایا ہے اور وہ ساری ترغیبات ان کو ان کی زمانہ شناسی ہی نے عطا کی تھیں۔ انھوں نے خاصہ زور دیکر کہا کہ وہ نجمہ کی کردار سازی سے غافل نہ رہے، جس کے لئے انھیں اپنے مرضی کے خلاف بہت کچھ تجنا پڑا کیوں کہ انہوں نے ایک ایسے شاعر پر تحقیق کی تھی جو خود بھی تشکیک کے تازیانوں کی چوٹ کھایا ہوا تھا پھر انھوں نے ایک عجیب انکشاف کرتے ہوئے مجھ سے یہ بھی کہا کہ سماج کے اعلیٰ اور پڑھے لکھے گھرانوں کے لڑکوں میں کس قماش کی لڑکیوں کی مانگ ہے اس پر ہمیشہ ان کی نظر رہی۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے متمول اور اچھے عہدوں والے لڑکے اپنی بیویوں کو بس کچھ دیر اپنے ساتھ باہر نکال کر، ماڈرن لباس پہنا کر، ان سے انگریزی بلوا کر اور ہوٹلوں میں دوستوں سے ہاتھ ملوا کر پھر اپنے قلعہ بند گھروں میں ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے گھر اور بال بچوں کو روائتی تہذیب کے بنیادی سانچے میں ڈھالنے کے جتن کرسکیں، پھر ان کی ترجیح یہ ہوتی ہے کہ ان کی بیویاں ہوٹلوں میں صرف انگریزی ہی نہ بولیں بلکہ اپنی رسومات اور مذہبیات کو برتنے کا سلیقہ بھی رکھیں تا کہ بچے نہا دھو کر اور عطر لگا کر عیدگاہ کی نماز میں شریک ہوسکیں۔ میں نے ان کی گفتگو کے

میری باتیں کہیں اس کو بے راہ روی کے راستے پر تو نہیں لگانا چاہتیں، تو نجمہ کے باپ نے ہی اس کو سمجھایا کہ جب بھی کوئی نیا مکالمہ قائم ہوتا ہے تو وہ پرانے خیالات کو بالکل تباہ نہیں کر پاتا بلکہ نئے خیالات کے لئے تھوڑی سی جگہ بنا لیتا ہے پھر ان نئے خیالات کی کونپلیں خود بخود پھوٹتی رہتی ہیں، پھر وہ بڑے ادب سے انگلیوں کو ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا کر بولے تھے ''خود ہمارے حضور نے بھی نئے خیالات کے لئے پہلے جگہ ہی تو بنائی تھی''۔

پھر بڑی محبت سے مجھے اپنی کار میں بٹھا کر گھر چھوڑنے آئے۔ جب انھوں نے دروازہ کھول کر کار سے مجھے اُتارا تو میں نے دیکھا ان کی آنکھیں نم تھیں۔ دھیرے سے بولے ''آپ کا اچھے گھروں میں اُٹھنا بیٹھنا ہے، کہیں کوئی موزوں لڑکا دکھائی دے تو بتائیے گا، نجمہ کی منگنی ٹوٹ گئی ہے، جس کی ابھی اسے خبر نہیں ہے۔ وہ لڑکا خود تو نہیں پیتا لیکن چاہتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے دوستوں کو وائن بھی سرو (Serve) کر سکے۔''

کتنے ہی برس گزر گئے ان واقعات کو، آج میرے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، نہ میں نے شادی کی اور نہ کوئی اولاد چھوڑونگی۔ جو مرد میری زندگی میں آئے میری شرطوں پر آئے۔ نندنی کا گھر اپنے خوابوں کے مطابق مجھے کتنا بنا پایا میں نہیں جانتی۔ آج اپنی کمزور آنکھوں سے جو زمانہ دیکھ رہی ہوں اس میں میرے ساتھ کی ساری نجمائیں جہاں بھی ہیں بوڑھی ہو چکی ہیں اور ان بوڑھی نجماؤں کے بچے کہیں برقعہ پہنتے ہیں تو کہیں کھلے عام جینس پر ٹاپس، جن سے ابلتی ہوئی شہوت انگیز چھاتیاں، دیکھنے والوں کی سانسیں بے قابو کر دیتی ہیں۔ آج جب کھڑکی پر کھڑے ہو کر آتی جاتی رنگا رنگ مخلوق کو دیکھتی ہوں تو مجھے نجمہ کے باپ جو اس دنیا میں نہیں ہیں کی سنائی ہوئی حدیث قدسی یاد آتی ہے ''زمانے کو بُرا نہ کہو کہ میں ہی زمانہ ہوں، تب میرا اداس اور بوڑھا دل مجھے یہ تسلی دیتا ہے کہ ایک ہی زمانے میں خدا کو اتنی بہت سی شکلوں میں بسر کرنے کی کوئی تو مجبوری یا ضرورت رہی ہوگی۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

کراچی

۲۸ر ستمبر ۲۰۰۶ء

ڈیر اقبال مجید بہت بہت پیار

۔۔۔۔۔۔ میری زندگی تو تم دیکھ ہی چکے ہو، کہیں سے تمہاری طرح ایک خوشبودار جھونکا آجاتا ہے اور پھر کچھ دنوں بعد وہی حبس کا عالم۔ تمہارے فون نے اداس کر دیا گزشتہ دنوں جب میں لکھنؤ میں تھا تو میں اور سبطِ اختر ہر دوسرے تیسرے عثمان غنی کے پاس پہنچ جاتے تھے اور گفتگو کرتے رہتے تھے۔ عثمان پُر امید تھا مگر میرے دل کے کسی کونے میں ناامیدی پھن کاڑھے کھڑی ہوئی تھی آخر وہ موت کے ہاتھوں ڈسا گیا۔ یہاں اسے کون جانتا تھا کہ اس سے لپٹ کر رو لیتا تم اور سبط دور دور، ضبط کئے رہا، اُٹھ کر چائے بنائی اور پیتا رہا کیا معلوم کہ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کا کوئی قطرہ پیالی میں گرا یا نہیں۔ اب کیا کہوں کہ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ یہ وہ کہے جسے بعد از موت حیات کے تصور پر پورا یقین ہو۔ کیسا اکیلا ہوتا جا رہا ہوں اقبال، عثمان، احمد جمال پاشا، شوکت عمر سب چھوڑ گئے ایک اور شخص تھا ندیم، گورا چٹا، خوبصورت شاید تمہیں یاد ہو وہ بھی میں نے سنا عرصہ ہوا بچھڑ گیا۔ بس ایک دن کسی گوشے میں اکیلا پا کر مجھے بھی موت گھیر لے گی۔ پھر ایسا ہم نے کیا کیا ہے کہ کوئی یاد کرے گا یاد کرنے والے تو ہم سے پہلے ہی بھاگے جا رہے ہیں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تمہارا

حسن عابد

پیاسے رہنے والے

میں پوری بستی میں اکیلا بوڑھا ہوں جو زندگی کے نوے برس پورے کر چکا ہے۔ میں ابھی بھی دھیرے دھیرے کچھ دور ہوا خوری کے لئے چل لیا کرتا ہوں، بھنی مونگ پھلی چبا لیتا ہوں، اخبار پڑھ لیتا ہوں اور میری دور کی یادداشت بھی دھندھلائی ہوئی نہیں ہے۔ آج بجلی کے تاروں سے گھرا آسمان جب یہاں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بستی کا وہ صاف ستھرا آسمان یاد آتا ہے جسے صرف گرد و غبار کے بگولے دھندھلایا کرتے تھے۔ آجکل میری بستی میں باگیشور ناتھ مندر کے پاس بڑے باغ کی شاہی باولی کو مٹی سے پاٹ دیئے جانے کی تجویز خاصی گرم ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کا خیال ہے کہ باولی کو جوں کا توں رہنے دیا جائے جبکہ بعض گروہ یہ چاہتے ہیں کہ باولی اب بے وجہ ہی کافی زمین گھیرے ہوئے ہے اتنی جگہ پر مچھلیاں پیدا کرنے کا تالاب تعمیر ہو سکتا ہے۔ دراصل وہ شاہی باولی معمولی نہیں ہے۔ بچپن میں منڈیر کے کنارے کھڑے ہو کر اس میں جھانکنے سے مجھ پر ہیبت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں زور سے آواز لگا کر اس سے آنے والی اپنی آواز کی بازگشت سنتا تھا۔ مشہور تھا کہ غدر کے زمانے میں اس باولی کے اندر چھپائے گئے کسی خزانے کے تلاش کرنے کی کچھ ناکام کوششیں بھی ہو چکی تھیں، لیکن سب سے زیادہ حیران کن بات اس باولی کے پانی کے یکا یک خشک ہو جانے کی مشہور تھی جس میں میرے بچپن میں ایک ہاتھی کا ڈباؤ بتایا جاتا تھا۔ میرے باپ منشی برج بھوشن لال جنکی زبان پر اکثر جوالا پرشاد برقؔ کے اشعار اور اقبالؔ کی نظم ہمالیہ رہا کرتی تھی علاقے میں تعلقہ دار آنجہانی منوہر پرشاد مرحوم کے موروثی کتب خانے کا انتظام دیکھتے تھے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی کی مذہبی، قانونی اور طب یونانی کی نایاب کتابوں سے مزیّن تھا۔

دراصل بستی کے پرانے دنوں کی معلومات مجھے خاصی ہے کچھ تو اس معلومات میں اضافہ مجھے اپنے باپ منشی برج بھوشن لال کے اُس روزنامچے سے بھی ہوا ہے جسے میں جان

سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ ہلکے زرد رنگ کے کاغذ کے اسی روزنامچے سے پہلی بار مجھے یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ اُس شاہی باولی کے یکایک خشک ہو جانے کی پیشین گوئی دلارے میاں نے کی تھی جن کے لئے مشہور تھا کہ آزادی سے بہت پہلے جاڑوں کی راتوں میں کلونیل راج کے ستائے نادار کھیت مزدوروں کو وہ چپکے چپکے کمبل تقسیم کیا کرتے تھے اور جن کے آنگن میں کچھ دیر گاندھی جی نے سنا ہے کہ چرخہ بھی کاتا تھا۔ دلارے میاں کے ٹوٹے پھوٹے مکان کی چھت بستی میں گنا پیلنے والے کولھوؤں کے میدان سے ملحق بیل گاڑیاں بنانے اور مرمت کرنے والے کاریگروں کی دکانوں سے جھانکتی نظر آتی تھی۔ کہتے ہیں کہ دلارے میاں نے فجر کی نماز کے بعد بس یونہی یکایک ایک دن یہ کہہ کر سب کو سکتہ میں ڈال دیا تھا کہ اس باولی میں ایک دن جوان کنواریاں اور نو بیاہتائیں سوئیں گی اور بستی والوں کی آنکھوں کے راستے باولی کا سارا پانی بہہ جائے گا اور باولی ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائے گی۔

دلارے میاں کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا تھا، وہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ تھا، ایک نیم پختہ مکان میں رہتے تھے جس کی کمزور دیواروں کی مرمت وہ خود کرتے تھے، انھوں نے شادی نہیں کی تھی، حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے گھر کا دروازہ کبھی بند نہ ہوتا، اپنی زمینوں سے انھیں کب کیا ملتا تھا اور کتنا دبا لیا جاتا تھا اس کا انھوں نے کبھی کوئی حساب نہ رکھا۔ سوئی سوئی سی بڑی غلافی آنکھیں کھڑی ناک شائدان کا ناک نقشہ بہادر شاہ ظفر کے بڑھاپے کی تصویر سے بہت ملتا جلتا تھا وہ کبھی تعلقیداروں کی چوکھٹ پر نہیں گئے اور نہ ان کوٹھیوں کے لق و دق کمروں میں بچھی بے داغ سفید چاندنیوں اور قالینوں پر بیٹھے ہوئے پائے گئے جن کی چھتوں پر بڑے بڑے رنگین جھالروں کے ہاتھ سے کھینچے جانے والے پنکھے لٹک رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ موٹے اناج کی روٹی وہ شوق سے کھاتے تھے اتنا تو سب ہی جانتے تھے کہ تیوہاروں کے موقعے پر وہ ترتراتی ہوئی ہانڈیوں اور لذیذ پکوانوں کے خوان قبول تو کر لیتے تھے مگر خود نہ کھا کر محتاجوں کو پہنچا دیا کرتے تھے۔ پتا نہیں لوگ انھیں دبی زبان سے ولی کیوں کہا کرتے تھے جبکہ ایسا تو تھا نہیں کہ انھیں دنیا سے کوئی مطلب نہ تھا، پڑھے لکھے تھے، گھر میں اردو فارسی ہی نہیں انگریزی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور اس زمانے کے بعض بڑے سیاسی لیڈروں کو بھی

کبھی ان کے پاس گھنٹوں بیٹھے دیکھا جایا کرتا تھا۔

باولی کے بارے میں دلارے میاں کی پیشین گوئی کی حقیقت آرتی مجھ سے معلوم کرنے آئی تھی۔ آرتی بائیس چوبیس برس کی گوری چٹی کائستھ گھرانے کی وہ لڑکی ہے۔ جس کے خاندان کے بزرگوں میں منشی بھگوتی سہائے ہوا کرتے تھے جو فنِ خطاطی میں ماہر تھے اور منشی نولکشور کے ہزار بار بلانے پر بڑے نخروں سے قرآن شریف کی کتابت کرنے کچھ راستہ پالکی سے اور کچھ پریس والوں کی ٹم ٹم کی سواری سے طے کر کے جایا کرتے تھے۔ بھگوتی سہائے خطاط نے میرے باپ کو بتایا تھا کہ قرآن شریف کی کتابت شروع کرنے سے پہلے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ غسل کی حالت میں ہیں کہ نہیں۔ وہاں زمین پر لگے چاندنی کے فرش پر لکھنے کے لئے اپنی نشست جمانے سے پہلے کاتب کو وضو کرنا پڑتا تھا، کمرے کے باہر کشادہ اور صاف ستھرا آنگن تھا جس میں دو بڑے حوض تھے ان میں صاف ستھرے بہشتی گنگا کا پانی بھرتے تھے جن سے چھپائی میں استعمال ہونے والی پتھر کی پلیٹیں اس طرح دھوئی جاتی تھیں کہ پانی نالیوں میں نہ جائے، اس پانی کو دریا میں بہانے کا خاص انتظام تھا۔ کتابت کے کمرے میں ایسے موقع پر سارے اگالدان اُٹھا لئے جاتے تھے، حقہ استعمال کرنا ممنوع تھا۔

ہماری بستی میں لکھوریوں سے بنی محراب دار برآمدوں اور کھپریل کی چھتوں والی نازک اور نفیس کھمبوں پر ٹکی وہ عمارت جو الگ ہی دکھائی دیتی تھی میرے باپ کے بیان کے مطابق بھگوتی سہائے نے ہی بنوائی تھی۔ اس خوبصورت اور نازک سی کوٹھی کے احاطے میں دو بھاری بھرکم اور گھنے املی کے درخت تھے جن کے نیچے میں اپنے لڑکپن میں درخت سے ٹپکی ہوئی پکی املیاں بٹورنے میں گرمی کی دوپہریں گزارتا تھا۔ سنا ہے ایک زمانے میں بھگوتی سہائے کے خاندان میں اس کوٹھی کو لیکر اندر ہی اندر کھینچا تانی بھی ہوئی تھی لیکن آرتی کی نانی بملا دیوی نے خاندان میں سب کو قسم دے رکھی تھی کہ انکے جیتے جی کوٹھی فروخت نہ کی جائے۔ بملا دیوی کا رنگ روپ پُرکشش تھا، وہ کھدّر پہنتی تھیں، میرے باپ بتاتے تھے کہ بستی سے ایک بار مہاتما گاندھی کا گزر ہوا تو وہ دلارے میاں کی چوکھٹ پر کچھ دیر رُکے وہیں بملا دیوی نے اپنا ایک ایک زیور اور صندوقچے میں پس انداز کی گئی ساری نقدی مہاتما کے حوالے کر دی تھی سنا ہے

گاندھی جی نے کہا تھا۔

''بیٹی تم نے تو سب کچھ مجھے دے دیا۔''

''آپ کو نہیں دیا ہے'' بملا نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا'' یہ تو میں اپنے بچوں کے بھوشے کو دے رہی ہوں۔ اُن امیدوں کو دے رہی ہوں جو آپ کے اور میرے سپنے بن چکی ہیں۔''

''سوچ لو، یہ بہت ہے۔'' مہاتما یہ کہہ کر مسکرائے تو بملا دیوی نے جواب دیا تھا

''پر میری پیاس ابھی بھی نہیں بجھی ہے۔ پرمیشور سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ یہ پیاس مرتے دم تک بنی رہے۔'' پاس ہی دلارے میاں بھی کھڑے تھے۔ دھیرے سے بولے 'آمین'

بملا دیوی کی آنکھ بند ہونے کے بعد انکے ناتی پاتوں میں جائیداد کولیکر بندربانٹ ہوئی تو کوٹھی کو ڈھا دیا گیا، جب وہاں نیچے دکانیں اور اوپر رہائشی فلیٹ بنائے گئے اور اس کا کشادہ احاطہ موٹر مکینکوں کو کرائے پر اُٹھایا گیا جو املی کے پیڑوں کے نیچے گاڑیاں دھویا کرتے تھے تو وہ منظر دیکھ کر دل سے ایک ہوک اُٹھا کرتی لیکن مجھ میں آرتی کے باپ سے بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی جو ایک پارٹی کے ایم ایل اے تھے، بڑی سی رعب دار گاڑی پر ایک باڈی گارڈ کے ساتھ چلتے تھے، کمر میں ریوالور باندھتے تھے اور جن کی تنی ہوئی نوکیلی مونچھوں کے پیچھے اور گال کے نیچے خوشبودار تمباکو کا دس روپے والا بیڑا دبا رہا کرتا تھا اور جو زمیدوز کی گئی اُس محراب دار عالی شان عمارت کے حصہ داروں میں سے ایک تھے۔ ان کا نام تو رگھوبردیال تھا مگر ساری بستی انھیں پیار سے رگھو بھیا کہہ کر پکارتی تھی۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کچھ تو سب کو دکھائی دیتے تھے اور کچھ پردے کے پیچھے بھی تھے۔ دراصل رگھوبردیال ہی اپنی بیٹی آرتی کو لیکر میرے پاس آئے تھے، وہ تاریخ کے موضوع پر ڈی فل کرانے کے لئے اسے ولایت بھیجنا چاہتے تھے تاکہ انڈیا آفس کی لائبریری کی دستاویزوں سے اپنی ضرورت کے حقائق جمع کر سکے۔ آرتی ہمارے علاقے کے کلونیل عہد کی تاریخ کو اپنا موضوع بنا چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آرتی کی روزمرّہ کی پوشاک جینس وغیرہ تھی مگر یہ اس کی شرافت تھی کہ وہ میرے پاس شلوار قمیص میں آتی اور سر دوپٹہ سے ڈھکا ہوتا۔

ایک دن آرتی دلارے میاں کی اس مشہور پیشین گوئی کی تفصیل جاننے کے لئے آ گئی

جوانھوں نے کبھی پرانی باولی کے لئے کی تھی اور وہ سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ معاملہ آرتی کو سمجھانا میرے لئے اتنا آسان تو نہ تھا مگر پھر بھی میں نے اسے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کلونیل ہندوستان کے دور میں آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے ہندو اور مسلمان لیڈروں نے آزمائش کے بڑے سخت دن دیکھے ہیں۔ میں نے آرتی کو بتایا کہ میرے باپ نے اپنے روزنامچے میں اپنے علاقے کے بعض ایام کا جو حال بیان کیا ہے وہ بڑا اعبرت ناک ہے کیونکہ بعض زمانے میں یہاں قحط کی سی کیفیت ہوجایا کرتی تھی۔ جب ضلع افسر کا کیمپ لگتا تو غریب کسانوں کے غول کیمپ کے باہر کسم پرسی کی حالت میں کھڑے نظر آتے، ان کی مٹھیوں میں قدرت کی ماری ہوئی مردہ فصل کے کھوکھلے اور سوکھے ہوئے دانے دبے ہوتے جنھیں وہ افسر کے قدموں میں ڈال دیتے اور ہاتھ جوڑ کر منت کرتے کہ ان کا لگان معاف کردیا جائے، اس تباہ حالی پر انھیں سرکاری ٹکٹ لگا کر درخواستیں دینا پڑتیں اور محرروں کو اجرت بھی اپنی جیب سے ادا کرنی پڑتی۔ میرے باپ کے مسلمان دوستوں کا کہنا تھا کہ ہمارا تعلقیدار تو زمینداری کے خلاف تھا مگر ایسے چاپلوس مسلمان اور ہندو زمیداروں کی کمی نہ تھی جو انگریز افسروں کی خدمت میں دن رات لگے رہتے تھے۔ میرے باپ نے لکھا تھا کہ ہمارے ایک پڑوسی مسلمان زمیندار کی ایسی حرکتوں پر پاسی قوم کے آسامیوں نے اسے ٹھٹھرتی جاڑوں کی رات میں جب وہ جلتے الاؤ کے پاس بیٹھا شراب پی رہا تھا جان سے مار کر آگ میں جھونک دیا تھا۔ پھر میں نے آرتی کو دلارے میاں کے بارے میں جو کچھ معلوم تھا بتایا، وہ ترکیبیں بتائیں جنھیں استعمال کرکے وہ روپوش ہونے والے لیڈروں کو چھپاتے تھے انکے گھروں پر اپنے کھیت کھلیان سے جنس پہنچاتے تھے، کس طرح گنے کی گاڑیوں میں حکومت کے خلاف چھاپے جانے والے پوسٹر چُھپا کر شہر پہنچاتے تھے، یہ بھی بتایا کہ کس طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھوں نے میرے باپ کے سامنے ایک بہت بڑے انگریز حاکم سے کہا تھا۔

"تم ہمیشہ ہی ضلع ہیڈکوارٹر آکر اور شکار کیئے ہوئے ہرنوں کے کباب کھا کر اور ولائتی شرابیں پی کر چلے جاتے ہو، یہاں کے مفلسوں اور ناداروں کی خوشیوں اور غموں کو تمہارے دل کب چھوئیں گے۔ آخر تم کس منھ سے ان مظلوموں سے یہ توقع کرتے ہو کہ وہ راج سے

وفاداری برتیں گے"۔

میرے باپ نے دلارے میاں کی سیاسی سوجھ بوجھ کا ایک واقعہ "کھیر پارٹی" کے عنوان سے لکھا تھا جو غالباً سن چونتیس یا پینتیس کی ایک برسات کی رات کا تھا جب ہمارے علاقے کے ندی نالے اُبل پڑے تھے اور دلارے میاں کے نیم پختہ مکان پر شہر کے کچھ بڑے سیاسی لیڈر ٹٹوؤں کی پیٹھ پر بیٹھ کر اور پورے جسم سے شرابور ہو کر پہنچے تھے اور دیر رات تک وہاں ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک کی سیاست کو بڑے بے دردی سے صرف مذہب اور ذات پات کے راستے ہانکا جا رہا تھا اور لندن کی گول میز کانفرنس ناکام ہو چکی تھی، انھیں دنوں برطانوی وزیر اعظم رامسے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تھا۔ برسات کی اس رات دلارے میاں کے گھر پر انکی اکلوتی بھینس کے تین سیر دودھ اور تھوڑی سی شکر کے علاوہ کچھ نہ تھا، یہ دیکھ کر کوئی کسی پڑوسی سے چاول مانگ لایا اور دلارے میاں نے اپنے مہمانوں کی ضیافت کھیر پکا کر کی تھی۔ اس موقع پر زیر بحث کمیونل ایوارڈ کو دلارے میاں نے قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا تھا۔ "ہمیں یہ ایوارڈ قبول نہیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خطرناک رویہ ایسے دو عناصر کی پرورش کرے گا جو ہمیں مضبوط اور پائیدار قوم بننے سے روکیں گے۔ ملازمتوں کے لئے مسلم جماعت یا ہندو جماعت کی طرف سے آئے دن جھگڑے ہوا کریں گے، پھر ایک قوم کے اندر مختلف قومیں بننا شروع ہو جائیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ پھر آپ کیا چاہتے ہیں تو ان کا جواب تھا۔ "ہم فرقوں کا کارخانہ نہیں کھولنا چاہتے مسلمان کو ایسے بہترین ہندو اور ہندو کو اقلیت کے ایسے بہترین مسلمان کو ووٹ دینے دیجئے جو سب کے فائدے کے لئے کام کرے"۔ مجھے حیرت تھی کہ آرتی میری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ آرتی کو دلارے میاں کے کردار کی ایک جھلک انکی پیشین گوئی بتانے سے پہلے دکھانا ضروری تھی۔ اس لئے میں نے آرتی کو بتایا کہ میرے باپ کی روائت کے مطابق دلارے میاں اپنی پیٹھ پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دیتے تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ وہ کسان سبھاؤں میں کام کرنے کے لئے کبھی کبھی دور دراز کے دوروں پر نکل جایا کرتے تھے۔ ایک بار پنجاب میں قصور اور امرتسر ان حالات میں پہنچ گئے جب جنرل ڈائر جلیاں والا باغ کے

قتل عام کے فوراً بعد شہر میں کرفیو لگا کر بکتر بند گاڑیاں سڑکوں پر دوڑا رہا تھا اور شہر کی رنڈیوں اور فاحشاؤں کی نظروں کے سامنے اُسی سڑک پر شرفاء کو زمین پر گھٹنوں کے بل چلوا کر پیٹھ پر کوڑے لگوا رہا تھا جس سڑک پر آزادی کے متوالے ہندوستانیوں نے ایک انگریز خاتون مس شیروڈ پر حملہ کیا تھا۔ دلارے میاں کی پیٹھ پر پڑے کوڑوں کے وہ نشان جنم داغ بن چکے تھے۔ آزادی کی تاریخ کے بارے میں ہماری نئی پود کم ہی جانتی تھی لہٰذا آرتی کی دلچسپی دیکھ کر میں نے کچھ خاص خاص واقعات بیان کیے اور سمجھایا کہ جب بعض مسلمانوں نے عام مسلمانوں کو سرسید کے حوالے سے یہ سمجھانا شروع کیا کہ تعداد میں ہندو زیادہ ہے اس لئے اس کے ہاتھ میں ووٹوں کی طاقت بھی زیادہ ہوگی یعنی تم ایک پانسہ پھینک کر قسمت آزماؤ گے تو اسکی قسمت کا فیصلہ ایک کی جگہ چار پھینکے ہوئے پانسوں سے ہوگا پھر بتاؤ کس کی قسمت کے چمکنے کا امکان زیادہ ہے۔ ایسی ہی اور بھی باتیں تھیں جنھیں سُن کر دلارے میاں غمگین رہنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے دلارے میاں کے سارے خواب چکنا چور ہونے لگے۔ ملک میں دو فرقوں کے درمیان نفرت اور خون خرابے سے آئے دن بگڑتے حالات کو دیکھ کر انھیں لگتا کہ انھیں اس بار بھی عالم ضعیفی میں ماہ اپریل کی گرم سڑکوں پر گھٹنوں کے بل چلا کر کوڑے مارے جا رہے ہیں دلارے میاں دل شکستہ اور مایوس انسان کی طرح رہنے لگے، انھیں چُپ لگ گئی۔

ایک سال گرمی بہت پڑی، لو کی تمازت سے مویشی مرنے لگے، دلارے میاں بھی لو کی چپیٹ میں آگئے۔ پیاس کی شدت نے انھیں ہلکان کر دیا تھا۔ ان کی بیماری کی خبر سن کر ایک جٹا دھاری جوگی انکے سرہانے پہنچ گیا۔ کندھے پر لٹکے جھولے سے کسی پودے کی ایک ہری پتی نکال کر دلارے میاں کو آواز دی۔

"مہاراج" دلارے میاں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جوگی نے پتی ان کی طرف بڑھائی۔

"اسے زبان پر رکھ لیں۔ پیاس مٹے گی کلیجہ تر ہوگا۔" دلارے میاں نے اشارے سے منع کر دیا تو جوگی نے سمجھایا "مہاراج" بڑی کراماتی بُوٹی ہے" دلارے میاں نے پھر آنکھیں کھولیں تو جوگی بولا۔

"اسکے پودے کو آدی واسی کنواری کنیائیں اُگاتی ہیں۔ وہ سارا دن خود پیاسی رہ کر منھ سے

بوند بوند پانی ٹپکا کر اسے سینچتی ہیں، سادھارن طریقے سے سینچنے پر وہ پودا سوکھ جایا کرتا ہے، یہ بوٹا دُرلبھ ہے مشکل سے اگتا ہے۔" دلارے میاں نے تب بھی وہ پتی زبان پر نہ رکھی تو جوگی نے پوچھا۔

"کیا آپ اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہتے۔"

"چاہتا ہوں۔" انھوں نے جواب دیا "مگر میری پیاس ایک لمبی لڑائی کا نام ہے۔ ہر پیاس کراماتی پتے سے نہیں بجھائی جا سکتی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے، جوگی چلا گیا تو دلارے میاں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں پاس کھڑے تیمارداروں سے تب انھوں نے وہ پیشین گوئی کی۔

"یاد رکھنا، ایک دن ہماری بستی کی بڑی باولی میں کنواریاں اور نو بیاہتائیں سوئیں گی اور باولی کا سارا پانی لوگوں کی آنکھوں کے راستے بہہ جائے گا اور باولی ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائے گی۔"

پھر دلارے میاں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ دلارے میاں کے مرنے کے کئی برس بعد ملک کی تقسیم میں قتل عام شروع ہوا تو ایک رات انتقام کے پیاسے بلوائیوں نے ہماری بستی کو چاروں طرف سے گھیر لیا، انھیں راضی کرنے کے لئے ہر گھر نے اپنا نقد زر و مال جمع کر کے چند بزرگوں کے ہاتھوں محاصرہ کیے بلوائیوں کو پہنچایا، ایک رات خاموشی سے گزری لیکن دوسرے دن بلوائیوں میں کچھ اور پتھر دل شامل ہو گئے اور ان کی نیت بدل گئی، بچاؤ کی کوئی صورت نہ پا کر بستی کی کنواریوں اور نو بیاہتاؤں نے باولی میں چھلانگ لگا دی، جب ان کی لاشیں نکالی گئیں تو باولی جس میں ایک ہاتھی پانی کا ڈباؤ تھا بالکل خشک ہو چکی تھی۔ پھر اس میں کبھی پانی نہ آیا۔

پوری داستان کو آرتی نے دلچسپی سے سنا مگر جوگی کی اُس پتی کی کہانی اسے عجیب سی لگی، کسی پودے کو خود پیاسے رہ کر قبیلے کی کنواریوں کا سینچنا اسے ایسا لگا جیسے کہانی اُسے پودے میں ایک طرح کا تقدس اور پاکیزگی بھی شامل کر رہی تھی، تھوڑی دیر تو وہ چپ رہی پھر بولی۔

"پتا نہیں آپ ہماری جنریشن کو کتنا جانتے ہیں۔ ہم خود پیاسے رہ کر دوسروں کی پیاس بجھانے کو بیوقوفی سمجھتے ہیں۔" اس کی اس بات سے مجھے دھچکہ لگا، میں غور سے اسے دیکھنے لگا اسکی تیوریاں چڑھ گئی تھیں وہ کڑوا سا منہ بنا کر بولی

"پھر کنوارے پن کا پاکیزگی سے بھلا کیا رشتہ ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لڑکی

کنواری بھی نہ ہو اور بیاہتا بھی نہ ہو اسکے بعد بھی وہ پاک ہو سکتی ہے۔ یہ کنفیوژن پرانے لوگوں نے پھیلائے ہیں، خود میرے پتاجی بھی بہت سی باتوں میں کنفیوژڈ ہیں۔ ماتاجی نہ روکیں تو میں ان کے ساتھ ایک دن بھی رہنا پسند نہ کروں، ان سے کئی بار کہہ چکی ہوں تم اپنے Contradictions کے ساتھ زندہ ہی تو ہو، مرے نہیں جا رہے ہو، یہ دنیا بھی ابھی مری نہیں جا رہی ہے، ابھی بہت دنوں اسی طرح چلے گا تو مجھے بھی میرے اپنے Contradictions کے ساتھ جینے دو اس میں کونسی پر لے ہوئی جا رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا باپ جان کر انجان بن رہا ہے۔ گزرے دنوں کے مرگھٹ پر ویسی ہی کوٹھی بنانا چاہتا ہے جیسی پہلے کبھی بنی تھی۔ اسے بتانا پڑے گا کہ ہم سارے انسان گھونگھے کی طرح ہیں، ہمارا خول بدلے گا تو ہمارا وجود بھی بدلے گا۔ ابھی دیکھئے گا میرے اُس سے بہت جھگڑے ہونگے حالانکہ ہم لوگوں کی Stratigy اپنے ماں باپوں سے اس وقت تک Confruntation ٹالنے کی رہا کرتی ہے جب تک ہمارا مطلب نکل رہا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر آرتی مجھے خیالات کے ایک عجیب سے دھند لکے میں ہاتھ پیر مارتا چھوڑ کر چلی گئی۔

اب میری صحت کچھ بگڑنے لگی تھی، بڑھاپا رنگ لا رہا تھا، پیشاب کی بیماری نے تہد بند ھوا دی تھی، میں اپنے پرانے وید سے دوا لینے گیا واپسی پر جب میری موٹر اس مقام سے گزری جہاں دلارے میاں کی قبر پڑتی تھی تو میں نے موٹر رکوائی، چھڑی ٹیکتا قبر پر پہنچا، مدتوں سے ادھر نہ آیا تھا، کچی قبر کی حالت خستہ ہو چکی تھی چبوترہ جگہ جگہ سے کھل گیا تھا، کہیں کہیں گہرے گڑھے ہو گئے تھے لگتا تھا عرصے سے دلارے میاں کا اپنا یا پرایا وہاں جھانکا بھی نہیں تھا برسوں پہلے کچھ لوگوں نے چار پائپ کھڑے کر کے قبر کے تعویذ پر معمولی ٹین کی چادر کا سائبان ڈلوا دیا تھا جو بے حد زنگ آلود اور خستہ ہو چکا تھا، قبر کا سرہانہ دھنس چکا تھا ادھر اُدھر اونچی گھانس اُگ آئی تھی جس پر جانوروں نے لید کی ہوئی تھی۔ اسی وقت قبر پر اُگی ہوئی گھانس پر ایک جگہ میری نظر ٹھہر گئی اس گھانس میں اُگے ایک پودے کی پتیوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، میں نے بڑھ کر انھیں غور سے دیکھا تو میرا تجسس اور بڑھا اور میں نے اسکی دو پتیاں توڑ لیں اور گھر لے آیا۔ میرے باپ کے روزنامچے میں جوگی والے واقعے کے ساتھ پیاس بجھانے والی اس پتی کی ڈرائنگ بھی

صاف صاف بنی ہوئی تھی جس پر زبان کے کانٹوں کی طرح باریک اور ملائم سے کانٹے بنے ہوئے تھے اس ڈرائنگ اور قبر سے توڑی پتّی میں مجھے حیرت انگیز مماثلث محسوس ہوئی تو میں بے چین ہوگیا۔ یہ تو وہ پتّی تھی جسے دلارے میاں نے پیاس بجھانے کے لئے زبان پر رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آرتی کے باپ نے کچھ دنوں پہلے جنگلی جڑی بوٹیوں کا کچھ تجارتی کام بھی ولائت میں مقیم اپنے کسی دوست کے ساتھ شروع کیا تھا۔ سوچا آرتی کے باپ کو فون کر کے بلاؤں اور پتّی دکھاؤں، ممکن تھا کہ وہ اس بوٹے کی صحیح شناخت کر لیں۔ میری الجھن یہ تھی کہ جس پودے کو خاص طریقے سے بوند بوند سینچا جاتا ہو اور وہ بھی خود پیاسے رہ کر آخر وہ ایک قبر پر بے آب نمو کیسے پا گیا۔ مجھے شک ہوا کہ یا تو وہ پتّی وہ نہیں جو کہ میں سمجھ رہا تھا یا پھر اس پودے کے خاص طریقے سے سینچے جانے کی وہ روائت ہی غلط تھی۔

ابھی میں رگھو بر دیال کو اپنے گھر بلا کر دلارے میاں کی قبر سے توڑی گئی وہ پتی دکھانے کے لئے فون کرنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بروقت آ گیا۔ لیکن اس بار وہ آرتی کے ساتھ نہیں اکیلا تھا، میں نے محسوس کیا کہ وہ غیض وغضب کی حالت میں تھا اور شائد ناگیشور ناتھ مندر سے سیدھا چلا آ رہا تھا کیونکہ ماتھے پر لگے تلک میں تازگی تھی۔ اس نے آتے ہی بڑے چلتاؤ اور رسمی طور پر میرے پاؤں چھوئے پھر کسی تمہید کے بغیر طبیعت پر جبر کر کے لہجے میں نرمی لا کر بولا۔

"یہ تو پتا نہیں کہ آپ اپنے دل میں میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور آپ کے دل میں میری کتنی عزت ہے، سب تو مجھے لچا لفنگا نیتا سمجھتے ہیں، سب یہی سوچتے ہیں کہ راج نیت میں آنے کے بعد سے میری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ آج تھانیدار بھی اوپر اوپر سے دکھانے کے لئے میرا رعب کھاتے ہیں، چاہے دل میں مجھے کچا چبا جانا چاہتے ہوں۔ اب آپ یہ بھی جان لیجئے کہ اسی رگھو بر دیال کو کبھی دو کوڑی کے سڑک چھاپ بدمعاشوں نے کالر پکڑ کر چپلوں سے مارا تھا۔ پھر یہ لاٹری کیسے نکل آئی، تو یہ لاٹری یونہی نہیں کُھل گئی ہے۔ پارٹی کا ٹکٹ پانے کے لئے میں نے اپنے سینئر نیتاؤں اور لیڈروں کے لئے کیسے کیسے پاپ بھرے کام کئے ہیں آپ سنیں گے تو تھوکیں گے مجھ پر، یہ آن بان، موٹر گاڑی یہ اوپر اٹھی مونچھیں یہ سو روپئے روز کی منھ لال رکھنے والی گلوریاں میری طرح

کوئی مائی کالال ان کی قیمت چکا کر دیکھے حلق میں نہ آجائے تو کہنا۔ دیکھو بابو جی ہمارے حصے کی راج نیت میں دو دن جینا مشکل ہے ذرا نظر ہٹی کہ ننگے ہوئے، بدن سے کپڑے کہاں گئے، کس نے اُتارے کچھ پتا نہیں پھر اُس ننگے کو منھ چھپانے کی جگہ نہیں ملتی پر ہماری مانیتا یہ ہے کہ جس نے کی شرم اسکے پھوٹے کرم اس لئے ہم کو سیکھنا پڑا کہ کپڑے پہن کر ننگا کیسے رہا جاتا ہے"۔

میں نے دیکھا کہ وہ اپنا غصہ نکالنے کے لئے بولے چلا جارہا تھا لیکن بات دراصل کچھ اور تھی اور زیادہ سنجیدہ تھی کیونکہ اس نے ایک نیا قصہ چھیڑ دیا جو اسکے غصے کا اصل سبب نکلا، پہلے تو وہ مجھے کچھ دیر گھورتا رہا جیسے نظروں سے تول رہا ہو پھر بولا

"اُسے سمجھائیے۔ آرتی کو۔ شائد آپ کی بات مان لے۔ دسواں پاس کرنے کے بعد جب میں اسکی پڑھائی بند کر رہا تھا تو آپ ہی تو تھے جس نے مجھے بتایا تھا کہ اپنے زمانے کے دُھرندر کانگریسی سید محمود اپنی بیٹی کو پڑھانا نہیں چاہتے تھے اور پردہ بھی کرانا چاہتے تھے تو کملا نہرو نے انھیں ڈانٹ بتائی تھی اور کہا تھا کہ تمھاری کتھنی اور کرنی میں اتنا انتر ہو گا یہ میں سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ مجھے وہ بات یاد رہی، سوچا ٹھیک ہے آرتی کو پڑھاؤں گا۔ پڑھایا۔ اس نے کہا لو، اور پڑھاؤ! جانتے ہیں آپ! اب وہ ایک خانزادے سے بیاہ رچانا چاہتی ہے۔ رچالیا تو آج کی دھارمک راج نیت میں میرا تو انڈر ویر تک اتار لے گی وہ۔ اسے سمجھایئے، بتایئے کہ میرا ریوالور بدیسی کمپنی کا ہے، اتنے پاس سے فائر کرونگا کہ زخم کے چاروں طرف گہری بارود جم جائے چھوڑونگا نہیں دونوں کو۔" یہ کہہ کر وہ اپنے لال پیلے دیدے گھماتا ہوا اور پھنکارتا ہوا چلا گیا ایسی صورت میں مجھے اسے وہ پتی دکھانے کا موقعہ ہی نہ ملا جس کے لئے میں اسے فون کر کے بلانے والا تھا۔

آرتی کے باپ کے چلے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ شروع کی ملاقاتوں میں آرتی نے سب سے پہلے مجھ سے خان زادوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی دلچسپی دکھائی تھی جنکا ہماری بستی میں اب تو پورا ایک محلّہ آباد تھا۔ میں نے آرتی کو بتایا تھا کہ ہماری بستی میں آباد سارے خان زادے نومسلم ہیں انکے بزرگ سن اٹھارہ سو کے قریب مسلمان ہوئے تھے۔ یہ لوگ اصل النسل راجپوت تھے ان میں کوئی کنور بندے علی کوئی کنور شرافت حسین کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک انکے بزرگوں کی شیروانیاں دائیں طرف سے کھلتی تھیں اور عام

مسلمانوں کے گھروں کے بنے ہوئے شامی کبابوں سے اس لئے پرہیز کرتے تھے کہ کہیں گائے بھینس کے گوشت کے نہ ہوں۔ یہ اپنے باورچی خانے کو چوکا کہتے اور کھانا پہلے چوکے کو لیپ پوت کر پکاتے اور پیتل کے برتن استعمال کرتے۔ انھوں نے انیسویں صدی کی مردم شماری میں خود کو مسلمان صوفیوں کی پرستش کرنے والا بھی لکھوایا تھا اور بستی کے ایک پرانے ولی اللہ کے مزار پر سر جھکانے بھی آتے تھے۔ ان کے نام کی ایک تاریخی سرائے آج بھی موجود ہے۔ جس کے طاق اور دیواریں غدر میں باغی سپاہیوں نے کہیں کہیں سے اس شک میں کھود ڈالیں تھیں کہ شائد ان میں دولت چھپی مل جائے۔ اب اس میں ان کی لڑکیوں کا مدرسہ ہے۔

میں قبر پر سے توڑی گئی پتی کے سبب پہلے ہی خاصی الجھن میں تھا کہ رگھوبر دیال نے آرتی کے حوالے سے میرے سامنے ایک اور الجھن کھڑی کر دی تھی۔ آخر کو آرتی سے بات کرنے کے لئے میں نے اسے فون کر کے گھر بلایا۔ میرے سامنے آتے ہی وہ جس طرح مجھ سے مخاطب ہوئی اس نے میرے ہوش ہی اُڑا دیئے۔ وہ آتے ہی بولی۔ ”مجھے معلوم ہے میرے باپ نے آپ سے کیا کہا ہوگا۔ وہ لوک لاج کے ڈر سے مجھے خان زادوں میں شادی کرنے سے نہیں روک رہا ہے اور نہ بیٹی کی محبت میں ایسا کر رہا ہے۔ اب سیاست اصولوں پر چلتی نہیں، پرانی پارٹی چھوڑ کر جس نئی پرٹی میں اسے زیادہ دودھ ملائی دکھائی دے رہی ہے اس میں گھسنے میں میرا مسلمان لڑکے سے شادی کرنا اس کا پالیٹکل کیریر بگاڑ سکتا ہے۔ مجھے ولائت جا کر اپنا کیریر بنانے کے لئے اپنے باپ کا کوآپریشن چاہیئے اس لئے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے جھوٹ بولا ہے کہ میں نے خان زادوں کے لڑکے سے شادی کرنے کا خیال ترک کر دیا ہے۔ میں ولائت جا رہی ہوں، میرے پیچھے کچھ دنوں بعد وہ لڑکا بھی وہاں آجائے گا پھر شائد بہت جلدی ہم بھارت نہیں آئیں گے۔ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ہماری پیاس کیا ہے اور ہمیں اسے رام بھروسے نہ چھوڑ کر خود بجھانا ہے۔ میں آپ پر بھروسہ کر کے آپ سے سچ بول رہی ہوں۔ اس سچ کو اپنے تک رکھیئے گا کیونکہ ملک سے دور ودیشوں میں اسکی بیٹی کیا کر رہی ہے یہ سوچ کر اسے اپنے کارتوس نہیں خراب کرنے پڑیں گے“۔ یہ سن کر کچھ دیر میں چپ رہا اور اپنے کو سنبھالا پھر آرتی سے پوچھا۔

''تمہارا باپ کچھ سال پہلے جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتا تھا۔''

''جی ہاں۔'' وہ بولی۔

''کیا تمھیں کسی ایسے پودے کا پتا ہے جس کی پتیاں پاس بجھانے کے کام آتی ہوں اور جسے خود پیاسے رہ کر بوند بوند سینچا جاتا ہو۔''

وہ یہ سن کر ہنسی اور بولی۔ ''میرا باپ خود پیاسے رہنے والا دھندہ نہیں کرتا لیکن وہ پیاس بجھانے کی دوا بنانے والی ایک بوٹی کیاریوں میں ضرور اُگاتا تھا۔''

''وہ پودا کس طرح سینچا جاتا تھا کہتے ہیں بوند بوند پانی سے سینچتے ہیں۔''

''کیاریوں کے اوپر باریک چھید والے لوہے کے پائپ باندھے جاتے تھے ان سے پانی ٹپکایا جاتا تھا'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی ''بیچارے لوہے کے پائپ سارا پانی ٹپکا کر خود ضرور پیاسے رہ جاتے ہونگے۔''

میں نے آرتی سے یونہی پوچھ لیا۔

''تمہارے باپ نے جڑی بوٹیوں کی تجارت کیوں بند کردی۔''

''وہ جو فائدہ چاہ رہے تھے اس کی پیاس نہیں بجھی۔'' آرتی نے جواب دیا اور واپس جانے کے لئے اُٹھی دروازے پر پہونچکر پلٹی، مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے آخری بار مل رہی ہے، پھر جھک کر نمستے کیا اور چلی گئی اسکے چہرے پر کسی دُکھ کی پرچھائیں نہ تھی۔

رگھو بردیال کی خوبصورت بیٹی اپنے منصوبے کے مطابق ولائت جا چکی ہے۔ جو بھی اب جاتا ہے واپس نہیں آتا، سوچتا ہوں میری بستی نے کیسے کیسے نامی گرامی لوگ پیدا کیے، اس چھوٹی سی جگہ سے نکل کر کیسی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، وہ دنیا گھومے مگر مرنا یا دفن ہونا اپنی سرزمین اور اپنے گھر پر ہی چاہا۔ ان کی وصیتوں کے مطابق دور دور سے ان کے جنازے دفن ہونے یہاں آیا کرتے تھے اب سب یہاں اپنی سہولیت سے اپنا بُرا وقت کاٹنے کے لئے عارضی طور پر رہنا چاہتے ہیں لیکن اس معمولی سے قصبے میں مرنا یا دفن ہونا نہیں چاہتے۔ ممکن ہے کبھی اپنے بچوں کو لیکر ایک آدھ دن کے لئے اپنے پرکھوں کے گاؤں دکھانے کسی جیپ سے کسی دن آرتی بھی آئے اور شام ہونے سے پہلے واپس چلی جائے۔ مجھے یقین ہے ایسا کرتے ہوئے

اسکی آنکھیں نہیں بھیگیں گی۔ میری بہوئیں بہت دنوں سے یہاں نہیں رہنا چاہتیں۔ انکے شوہروں کے کاروبار شہر میں پھیل گئے ہیں۔ بیٹے چپکے چپکے وہاں زمین دیکھ رہے ہیں ایک دن رگھو بر دیال انھیں وہاں کوئی زمین دکھانے کے لئے لے جانے آیا تھا تو میں نے اسکو دلارے میاں کی قبر سے توڑی ہوئی پتی دکھا کر اس کے بارے میں تصدیق کرنا چاہی اس نے بتایا کہ وہ پودا بہت پیاسی مٹی میں اُگتا ہے اور پیاس بجھانے کی اکسیر دوا ہے اس نے حیرت سے پوچھا کہ اس نایاب پودے کی پتی مجھے کہاں سے ملی، میں کیا جواب دیتا، کچھ نہ بولا۔

میرا اب لکڑی پکڑ کر چلنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے، وید سے دوا لینے جانا بھی اب پہاڑ چڑھنا جیسا لگتا ہے۔ لڑکیوں کے تیور بتاتے ہیں کہ اب کبھی بھی بوریا بستر یہاں سے بندھ سکتا ہے اس لئے ایک بار پھر دلارے میاں کی اجڑی ہوئی قبر کے درشن کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب میں دلارے میاں کی قبر سے توڑی اُن پتیوں پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک عجیب سی حیرت کے عالم میں کھو جاتا ہوں۔ پھر ان سوکھی پتیوں سے سوال کرتا ہوں۔

"دلارے میاں، تم کوئی ولی اللہ تو تھے نہیں، سیدھے سادے انسان تھے پھر تمہاری قبر پر اگنے والے اس پودے کی آبیاری کس نے کی جو دوسروں کی پیاس بجھاتا تھا۔ یہ کرامات کیسے ہوئی؟ پھر میرا دل بھاری ہو جاتا ہے، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، بھاری دل سے آواز آتی ہے۔

"یہ پتیاں دلارے میاں کی قبر پر رکھ آؤ اور کہو، میاں جی نہ پیاس ایک سی رہتی ہے اور نہ پیاس بجھانے کے طریقے۔ جس منوں مٹی کے نیچے دفن ہو، لو یہ کرامات بھی ہمیشہ کے لئے اُسی میں دفن کر دو۔" مگر افسوس کہ دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ چند ماہ کی مدت کے بعد میرے بیٹوں نے شہر بسا لیا اور مجھے جیتے جی بزرگوں کی چوکھٹ اس وقت چھوڑنا پڑی جب میرے پاؤں قبر میں لٹکے تھے، کیا کہوں کہ اس وقت دل پر کیا گزری جب ہماری سواری مع ساز و سامان کے اُس راستے سے گزری جدھر دلارے میاں کی قبر تھی لیکن نہ وہاں زنگ آلود ٹین ٹپر کے سائبان کا کوئی نشان تھا اور نہ کسی قبر کا۔ دور تک تاروں کی ایک چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی جسکے میدان کو بلڈوزروں نے برابر کر دیا تھا کسی نے بتایا وہاں ہوائی اڈے کے لئے پٹرول کا ڈپو تعمیر ہو رہا تھا۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

لندن

۳۱؍ جنوری ۱۹۹۷ء

محبی و مکرمی اقبال صاحب

بہت بہت سلام، محبتیں اور دعا ہائے صحت و سلامتی قبول فرمایئے

۔۔۔۔۔۔ایک اور دلچسپ اور نا قابل فہم صورت بھی توجہ طلب ہے۔ میں ہندوستانی ہوں، پاکستان جانے میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ میری بیگم حیدر آباد کی ہیں وہ لوگ بھی پاکستان جانے سے گریزاں رہے۔ میری بیٹی حیدر آباد میں پیدا ہوئی اس نے دہلی اور لندن میں پڑھا۔ ہمارے داماد حیدر آبادی ہیں۔ وہ امریکہ یورپ میں زیر تعلیم رہے وہ بھی پاکستان نہیں گئے بلکہ اہل پاکستان کے بارے میں ناک سکوڑ کر بات کرتے ہیں تاہم ہمارا نواسہ جو یہیں پیدا ہوا سفر اس نے ہندوستان، لیبیا، جاپان، امریکہ اور یورپ کے کئے آج تیرہ برس کی عمر پر زبردست پاکستانی ہے شلوار قمیض پہنتا ہے گھر میں اردو بولتا ہے قرآن شریف ختم ہو گیا ہے مگر انگریزی میں ترجمہ پڑھا کرتا ہے یورپ اور مسیحیت سے بنیاد پرستوں والی نفرت اور حقارت ہے، صرف وہی کرکٹ میچ دیکھتا ہے جس میں پاکستانی کھیل رہے ہوں۔ اب اس پاکستانیت کی توضیح و توجیہ کیا ہو سکتی ہے آپ بھی سوچئے گا۔

تمہارا

قیصر تمکین

خلیق الزماں کی ٹم ٹم

میں اسے چھوتی ضرور تھی، لیکن اس کے تصوراتی بھاری بھر کم پن کے ایک پراسرار بوجھ کو دل ہی دل میں محسوس کر کے کچھ دہشت زدہ بھی رہ جاتی تھی حالانکہ وہ دیکھنے میں بڑی نازک اور ہلکی تھی۔ اسے اکثر غور سے دیکھنے پر کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں اس شاندار اور نفیس ٹم ٹم کے پروقار بوجھ کے معنی کو جو مجھے کسی وجہ سے بڑے وسیع محسوس ہوتے تھے دریافت کرنے کے لائق کبھی بن سکوں تو مزہ آجائے۔ اس کا وجود بلاشبہ مجھے کبھی کبھی ایک گہری سوچ میں ڈال دیتا۔ جیسے جیسے میں اپنی مصروف اور بھاگتی دوڑتی زندگی کی شکستوں سے مضمحل اور چھوٹی چھوٹی فتوحات سے مسرور ہوتی گئی اور میری آگہی کے جنگل گھنے ہوتے گئے اور صحافت کے مشغلے نے ملک کے اگلے پچھلے سیاسی منظرناموں کو میری فہم میں اتارا تو اس ٹم ٹم کے اسرار کھولنے اور اس مین سفر کرنے کا جذبہ میرے اندر تندہی سے سر اٹھاتا گیا۔

جب میں کم عمر تھی تو میری دادی ارجمند بانو کی ماضی کی اوڑھنی میں یادوں کے سیکڑوں سلمہ ستارے جڑے ہوئے جھلملایا کرتے تھے۔ انھیں کا بیان تھا کہ یہ ٹم ٹم مسلم لیگ کے لیڈر خلیق الزماں کی ٹم ٹم ہے۔ میرے باپ کا پرانا ملازم اس ٹم ٹم کا چپہ چپہ روز بلاناغہ جھاڑتا پونچھتا تھا اس کی پیتل کی لالٹین جو منقش تھیں، براسو سے رگڑ کر چمچمائی جاتی تھیں۔ کیا مجال تھی کہ ٹم ٹم کے نازک پہیوں کی نفیس تیلیوں پر معمولی سا دھبہ بھی دیکھنے کو مل جائے۔ اس کا پاودان، گدّیاں، پیچھے اردلی کے کھڑے ہونے کی جگہ، اس کے لمبے سڈول اور پالش کئے ہوئے نازک بم اور اس میں جڑی پیتل کی پھلیاں اور آرائش کا دیگر نقرئی سامان ہر چیز روزِ اول کی طرح نئی اور صاف ستھری آج بھی تھی۔ لیکن میں نے اسے کبھی سواری کے لئے استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔

جب میں اسے آنکھ بھر کر ڈیوڑھی کی مضبوط چھت کے نیچے جو موٹی موٹی دھنیوں پر ٹکی

ہوئی تھی دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ ٹم ٹم کے ایک ایک حصے سے ایک کہانی چیختی ہوئی نکل سکتی ہے۔ لیکن اپنے صحافتی پیشے میں کھائی ہوئی ٹھوکروں نے مجھے بتایا کہ ایسے وقت میں یہ کام کس قدر دشوار تھا جب قومی اور معاشرتی سطح کے سنجیدہ موضوعات وغیرہ پر لکھنے والے صحافیوں کی تعداد نہیں کے برابر تھی اور 'لیک مے انڈیا فیشن ویک' پر لکھنے والوں کے تعداد سیکڑوں تھی۔

میری نظر جب اس ٹم ٹم کی پشت پر جڑی ایک چمچماتی تختی پر پڑتی جس پر ٹم ٹم بنانے والی فرم کا نام اور تعمیر کا سال 1935 لکھا ہوا تھا تب مجھے یہ خیال ضرور آتا کہ یہ ٹم ٹم 1937 کے زمانے میں خلیق الزماں کے پاس ضرور رہی ہوگی۔ جب میں ٹم ٹم کی آرامدہ گدّی پر ہاتھ پھیرتی تو مجھے لگتا کہ میرے آبائی وطن لکھنؤ میں یہ ٹم ٹم خلیق الزماں کو راجہ محمود آباد کے پاس نہیں تو راجہ جہانگیر آباد کے پاس ضرور لے کر گئی ہوگی۔ کیوں کہ جہانگیر آباد کے چلتے پُرزے راجہ اس وقت برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر تھے اور خلیق الزماں خوب جانتے تھے کہ یہ سارے راجے مہاراجے اپنی زمیداری اور اقتدار کو بچانے کی مہم میں دن رات برٹش انڈیا کے اعلیٰ حاکموں کا اٹھنا بیٹھنا حرام کئے ہوئے تھے اور حکومت کی بے اعتنائی پر مسلم لیگ ان کی ضرورت بن سکتی تھی۔ میری دادی کو جو باتیں روزِ روشن کی طرح یاد تھیں، جب وہ انھیں سناتیں تو وہ قصے مجھے اس عہد کی عجیب وغریب داستانوں کی طرح لگتے۔ وہ کہتی تھیں کہ سنا ہے لکھنؤ میں کوئی منشی رجب علی تھے، وہ زمیداروں سے ناراض اور مشتعل کسانوں کے خفیہ طور پر مخبر تھے، رجب علی شائد ریاست نانپارہ کے رجواڑے کے معمولی ملازم تھے۔ ایک بار راتوں رات بیل گاڑی پر بیٹھ، انگوچھے سے سر اور چہرہ ڈھک لکھنؤ کے اطراف کے گاؤں میں یہ خبر دے آئے کہ فلاں فلاں دن خلیق الزماں کی تحریک پر راجہ محمود آباد اور راجہ نانپارہ دیگر راجاؤں کے ساتھ اپنی عملداریاں بچانے کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے واسطے موجود ہونگے اس لئے اس موقعے پر کسان لوگ کونسل پر دھاوا بول دیں۔ کیوں کہ کانگریس نے کسانوں کا ساتھ دے، کر اس مسئلے پر انگریزوں کو ہلکان کر رکھا ہے۔ پھر کیا تھا ہزاروں کسانوں نے دو چار دن کے اندر ہی لکھنؤ میں کونسل پر دھاوا بول دیا۔ ان غریب کسانوں کا اتنا بڑا مجمع دیکھ کر جواہر لعل آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ اتنی آگ بھری تھی ان ناداروں میں یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔

میں اس ٹم ٹم کے پائیدان کو کبھی کبھی انگلیوں سے چھوتی تو مجھے لگتا جیسے ابھی ابھی میرٹھ کے نواب اسمٰعیل خاں، خلیق الزماں کے ساتھ اس پائیدان پر پیر رکھ کر ٹم ٹم کی گدی پر بیٹھے ہیں اور کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان برائے حکومت Coalition کی بات ناکام ہو نے کے بعد مردہ مسلم لیگ میں جان ڈالنے کے لئے راجہ محمود آباد کی کوٹھی پر عشائیہ کھانے گئے ہیں۔ میری دادی کہتی تھیں کہ اپنی جوانی میں، بڑے بڑے دالانوں میں ہم لوگ چادریں باند ھ کر حجرہ سا بناتے اور اس میں چھپ کر لیٹتے اور آموں کی کچی کیریاں نمک لگا کر کھاتے تھے۔ آنگنوں میں لہریادار دوپٹے رنگ کر الگنی پر پھیلائے جاتے تھے پھر ان کو بوڑھی خادمائیں۔۔ پلنگڑی پر بیٹھ کر دیر تک چٹکیوں سے چنا کرتی تھیں، ہم انھیں اوڑھ کر شاخوں میں پڑے جھولوں پر جب جھولتے تو ہمارے ڈرائنگ روم میں یونین جیک کی محبت میں گرفتار سرخ گالوں والے بہت سے لحیم اور شحیم اور خوشحال مرد جمع ہوا کرتے اور نیشنل ہرالڈ اخبار سن کر اخبار والوں کو کوسا کرتے۔

ایک دن میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی پاکستانی دوست حمیرہ کا ایک مراسلہ اخبار میں پڑھ رہی تھی جو چند برسوں سے پاکستانی صحافت کے میدان میں بے جگری سے کام کر رہی تھیں اور کسی وفد کے ساتھ ہندوستان آنے والی تھی اور ملاقات کے امکان کی خوشخبری بھی فون پر دے چکی تھی کہ میرا ملازم گھبرایا ہوا اندر آیا اور خبر دی کہ شہر کے کسی حصّے میں ہندو مسلم تناتنی ہو گئی ہے اور بازار میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ باہر سڑک پر کچھ شور سنائی دیا تو میں کمرے سے باہر ڈیوڑھی میں آئی دیکھا میرا ڈرائیور کوٹھی کا دیو قامت وزنی پھاٹک جسے دو آدمی ڈھکیلتے تھے اکیلے بند کر نے میں لگا تھا۔ ٹم ٹم کے آگے ہی خالی جگہ پر ہماری کار کھڑی تھی میں اس کی آڑ میں زمین پر ٹکی ٹم ٹم کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور حمیرہ کے باقی بچے مراسلے کو ختم کرنے لگی۔ لیکن میرے کان سڑک کی آہٹوں کی طرف بھی لگے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میرے آس پاس کا ماحول کہیں کھو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹم ٹم کی سیٹ پر میرے پہلو میں ہی خلیق الزماں اپنی شیروانی کا دامن ٹھیک کرتے ہوئے چپکے سے بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کاغذات ہیں جن میں سے ایک کاغذ نکال کر وہ مجھے بتاتے ہیں:

''یہ یوپی کے گورنر کی پندرہ روزہ رپورٹ ہے جو وائسرائے کو اطلاع کے لئے 1938 میں بھیجی گئی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ہندومہاسبھا کے لیڈر ونائک دامودر ساورکر کی تقریریں جامے سے باہر ہوتی جارہی تھیں۔''

پھر وہ رپورٹ پڑھ کر سناتے ہیں:

''ساورکر صوبے کا دورہ کررہے ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ انھوں نے کانپور اور لکھنؤ میں جگہ جگہ مجمع لگا کر خطاب کیا ہے۔ انھیں جو حمائت ملتی ہے وہ غالباً ہندو جذبات پر مبنی ہے، وہ ہندوؤں کے مفادات کو نظرانداز کرنے کا الزام لگا کر کانگریس کی مذمت کرتے رہے ہیں اور ہندو جذبات کو بھڑکانے کی کوشش بالکل ویسی ہی ہے جیسی کوشش مسلم لیگ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے کرتی رہی ہے۔''

پھر دفعتاً کچھ ایسا ہوا جیسے ٹم ٹم چلتے چلتے ایک جھٹکے سے رک گئی ہو اور اس جھٹکے میں نہ جانے کب خلیق الزماں کی جگہ محمد علی جناح آکر بیٹھ گئے ہوں پھر یکایک اردلی کے پائیدان پر پیچھے کسی کے قدم رکھ کر کھڑے ہونے کی وجہ سے ٹم ٹم میں دھچکہ لگا جس کے سبب جناح نے گردن۔۔۔ پیچھے گھما کر پوچھا:

''کون۔۔؟''

جواب ملا۔ ''آپ کا خادم سید محمد سعادت علی خاں، بہرائچ کی ریاست نانپارہ کا راجہ۔''

یہ سن کر جناح مسکرائے راجہ کو مسلم لیگ میں اپنے حمائتیوں کے ساتھ شامل ہونے پر مبارکباد دی پھر الہٰ آباد اور بنارس کے فرقہ وارانہ فسادات کے نتائج اور مادھو سداشیو گولوالکر کی متنازعہ کتاب کا ذکر کیا اور برا سا منہ بنا کر بولے

''اس کے بعد بھی پاکستان کی ضرورت کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو حیرت ہے۔ پاکستان کا مطلب ہے، ہم مکمل آزادی اور مکمل عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہتے ہیں یا پھر مر جاتے ہیں۔''

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹم ٹم کی دائیں بائیں لگی دونوں لالٹینوں کی صاف ستھری چمنیوں کے اندر سے بے تحاشہ گاڑھا گاڑھا دھواں ابلنے لگا اور اس نے پوری ڈیوڑھی کو گہری

دھند میں ڈبو دیا اُسی دھند میں کوٹھی کے باہر ڈامر کی چوڑی سڑک پر اخبار کے ہاکروں کی کرخت آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔

کیبنٹ مشن ڈِڈلاک (Dead Lock) ختم کرنے میں ناکام

قصبات چھریاں اور تلواریں جمع کر رہے ہیں۔

جناح کے راست اقدام کا شاخسانہ، کلکتہ میں چار ہزار افراد موت کے گھاٹ اترے، لارڈ دیول چھریوں سے ذبح کئے گئے انسانوں کی لاشیں دیکھ کر توبہ بول گیا۔ گڑھ مکٹیسر کے گنگا میلے میں ایک ایک مسلمان تہہ تیغ۔

پٹیل نے کہا بے شک ہم اس الگاؤ اور فرقہ پرستی کو پسند نہیں کرتے ہیں لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں دیکھتے ہیں۔

اس خلفشار کے عالم میں یکا یک ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بجی تو میں ٹم ٹم کی سیٹ پر اپنے خیالوں سے نکل کر اچھل پڑی اور بھاگتی ہوئی اندر گئی، فون اٹھایا دوسری جانب سے حمیرہ بول رہی تھی، پاکستانی وفد انڈیا آ گیا تھا، حمیرہ کے پاس لکھنؤ کا ویزا تھا اور وہ مجھ سے ملنے آ رہی تھی وہ چالیس کے لپیٹے میں تھی۔ دو بچے بھی ہوئے لیکن زندہ نہ رہے وہ تین چار دن میرے یہاں مقیم رہی، میں اسے اکبری دروازے پر نہاری کلچے کھلانے لے گئی، ایک شام اس کے کہنے پر ٹنڈے کے کباب اور پراٹھے کھلائے اس کی دکان پر حمیرہ نے مجھے یاد دلایا کہ جوشؔ نے بھی ٹنڈے کبابوں کا ذکر کیا ہے، پھر ایک شام امین آباد میں اُسے گنگا پرشاد میموریل ہال دکھایا وہ اس ڈائس پر کچھ دیر کھڑی اسکے فرش کی پُرانی لکڑی کو گھورتی رہی جس پر کبھی سر تیج بہادر سپرو، جواہر لعل نہرو اور خاکسار پارٹی کے علامہ مشرقی وغیرہ بیٹھ چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب چیزوں سے پہلے میں ڈیوڑھی میں کھڑی خلیق الزماں کی وہ ٹم ٹم اسے دکھا چکی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ ٹم ٹم پاکستان میں ہونا چاہیے تھی۔ حمیرہ نے میرے زور دینے پر اُس ٹم ٹم کو یونہی گھوم پھر کر دیکھا ضرور مگر کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔

دیر رات تک ہم دونوں کافی کے پیالے بناتے وہ سگریٹیں پھونکتی اور ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ گزرے دنوں کی سیاست اور تقسیم کے بعد اپنے بزرگوں سے سنی ہوئی لکھنؤ کی تہذیبی

اور معاشرتی تباہی میرا خاص موضوع رہتا۔ آخری رات حمیرہ نے بڑی بے تکلفی سے یہ بات جاننا چاہی کہ ہم لوگ پاکستان کو تقسیم کا ذمہ دار سمجھنا کب بند کریں گے۔ پھر وہ بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

''وہ ایک ملک ہے جس کی تاریخ کے کئی باب لکھے جا چکے ہیں، وہاں کے عوامی لیڈروں نے سلسلہ وار ایک کے بعد ایک اپنی جانوں کی قربانیاں دی ہیں اس لئے نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جائیں، جنہیں تقسیم نے گھائل کیا تھا وہ لوگ مر چکے ہیں یا میدانِ عمل کے حاشئے سے الگ پڑے ہیں۔ میں جو کچھ لکھتی ہوں اس ملک کے استحکام کے لئے لکھتی ہوں اور اس میں ضروری تبدیلیاں چاہتی ہوں۔ تم ٹم ٹم کی کہانیوں کے بجائے اپنی کہانیوں میں سفر کیوں نہیں کرتیں''۔

صبح حمیرہ کو میں اسٹیشن چھوڑنے گئی، پاکستان آتے ہی اس نے مجھے فون پر پہنچنے کی اطلاع دی۔ میری زندگی پھر اخباروں کے چنندہ منیجروں کو بار بے کیو پر سینکے گئے چکن ملائی تکہ کھلانے میں گزرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد حمیرہ کا ایک خط آیا لکھا تھا۔

''جس صبح تم مجھے اسٹیشن چھوڑ کر آئی تھیں اسکی رات میں تمہارے کمرے میں بہت مضطرب رہی بار بار مجھے خلیق الزماں کی ٹم ٹم کا خیال آتا جو تمہاری کوٹھی کی ڈیوڑھی میں کھڑی تھی، اس لئے نہیں کہ وہ کوئی بڑی تاریخی چیز تھی بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے ایک ادھوری سی چیز لگی تھی۔ تم تو سو گئیں تھیں لیکن میں دیر رات گاؤن پہنے اور ننگے پیر چپکے سے ڈیوڑھی میں گئی۔ اندھیرے میں اس ٹم ٹم کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے کوئی اعلیٰ اور قیمتی سوٹ پہنے ننگے پیر کھڑا ہے۔ لگا کہ اس ٹم ٹم سے کوئی بڑی خاص چیز Missing ہے یا نکال لی گئی ہے، اور وہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہماری اجتماعی یادداشت سے محو نہیں ہو پا رہی ہے، نہ یہاں اور نہ ہندوستان میں۔ جتنا میں اس غائب چیز کو یاد کرنے کی کوشش کرتی میری جھنجھلاہٹ، غصہ اور تلملاہٹ بڑھتی جاتی۔ یہ کتنی حیرت کی بات تھی کہ جس درد اور زہر بھری پشیمانی کی چبھن ہوش سنبھالنے سے لیکر آج تک میری شہہ رگ کے قریب گڑتی رہی وہ اسی شے کے سبب ہی تو تھی جو خلیق الزماں کی ٹم ٹم سے یکسر غائب تھی اور مجھے یاد نہیں آ رہی تھی کہ وہ کونسی شے تھی۔ تب میں نے پاکستان کے قیام کی

تاریخ کے صفحات لائبریریوں میں الٹنا شروع کئے تو مجھے معلوم ہوا کہ جب کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کی حکمت عملی ناکام ہوگئی تو جناح نے مسلم لیگ کے سارے لیڈروں کو احساس دلایا کہ جس حکمت عملی کے پہیوں پر چودھری صاحب کی ٹم ٹم کو چلایا جارہا تھا ان پہیوں کو تبدیل کردیا جائے اور نئے پہیے لگا کر ایک پاکستان کی مانگ تیز کردی جائے تاکہ کانگریس اور برٹش حکومت پر وزنی دباؤ پڑسکے۔ بس اُسی وقت یہ بات میرے دل پر نقش ہوکر رہ گئی کہ یہ ٹم ٹم دراصل ٹم ٹم نہیں ہے اقتدار کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور اسے سیاسی حکمت عملی کے پہیے چلاتے ہیں۔ پھر اس ٹم ٹم کو لیکر مجھے یہ فکر ہوئی کہ اگر اس ٹم ٹم کے کواچوان کی سیٹ پر جناح بیٹھے تھے اور اردلی کے پائیدان پر چودھری صاحب مع اپنے دیگر ساتھیوں کے کھڑے تھے اور اسکی چال سیاسی حکمت عملی کے پہیوں پر منحصر تھی تو پھر اس ٹم ٹم کو کھینچ کون رہا تھا، کون تھا جسکے مُنہ میں لگام ڈال کر راس اس کے کوچوان کو پکڑا دی گئی تھی۔ شاید وہی لمحہ تھا جب مجھے زندہ در گور اپنی بوڑھی ماں یاد آئی وہ باپ یاد آیا جس کا گلا بلوائیوں نے کاٹ دیا تھا اور وہ گاؤں یاد آئے جن کی کنواریوں نے اپنی عصمت بچانے کے لئے کنویں میں چھلانگیں لگائی تھیں وہ ریل گاڑیاں یاد آئیں جن کے ڈبے لاشوں سے پٹے اور خون سے رنگے ہوئے تھے۔ پھر میں نے اپنے ملک کی آزادی کے دن نمائش کے لئے اُس ٹم ٹم کی ایک شبیہ تیار کی اور اس میں دو خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو گھوڑی کی کھال پہنا کر اور گھوڑی کے تام جھام سے آراستہ کرکے گھوڑی کی ہی طرح ٹم ٹم کو کھنچوایا اور اس جھانکی کا نام رکھا ''خلیق الزماں کی ٹم ٹم کی گھوڑیاں''۔ جب ان لڑکیوں نے ٹم ٹم روک کر اپنے اوپر سے گھوڑی کا لبادہ اتارا اور اپنے اصلی روپ میں مسکراتی ہوئی سامنے آئیں اور سامعین کے سامنے تعظیم سے جھکیں تو اگلی صفوں پر بیٹھے علاقے کے وڈیرے اپنی بھوکی آنکھوں سے ان لڑکیوں کو دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے لیکن میں اپنے خیالوں میں اپنی بوڑھی ماں کے زخم سہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ہندو خاندان میں پیدا ہونے والی میری بہتر سالہ ہندو ماں جسے مسلمان کرلیا گیا پندرہ برس کی عمر میں لوٹ مار کے موقعے پر اپنی کشش اور خوبصورتی کی ماری انھیں وڈیروں کے ہاتھوں اغوا ہوئی تھی اور اپنی عزتِ نفس اور وقار کے سارے لباس اور اپنے مذہب اور ضمیر کے سارے قیمتی زیورات اتار کر

اسی ٹم ٹم میں الف ننگی جوت دی گئی تھی۔ یہ بھی جان لو کہ خوبصورت گھوڑیوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے والے اُن وڈیروں میں سے ایک نے جو حکومت میں خاص بااثر جگہ پر تھا مجھے کھانے پر بلایا تھا اسکے گھر میں سونے کے فریموں میں جڑے آئینے تھے، موٹے موٹے قالین تھے، الیکٹرانک تھیٹر تھا۔ لذیذ کھانوں سے بجی عالیشان ڈائننگ ٹیبل تھی مشروبات کے دوران اس نے اپنی چبھتی ہوئی نوکدار نظروں سے دیکھ کر سوال کیا تھا۔

''آپ اخباروں میں لکھتی ہیں تو ایک بات ضرور جانتی ہوں گی''؟

''کیا''۔؟

''یہی کہ ہم نے روح افزا کا شربت بیچ بیچ کر ایک یونیورسٹی تو کھڑی کر لی ہے لیکن ہم ہندوستانیوں کی اسکالرشپ پر بے حد رشک کرتے ہیں'' میں نے بھی اس کی بات کا اعتراف کیا تو وہ بولا۔

''ان لوگوں نے ہم سے پہلے یہ جان لیا ہے کہ انسانوں کی زندگی میں حقیقت سے زیادہ حقیقت کا تصوّر اہمیت رکھتا ہے، ہٹلر کے تصوّر میں یہودی وہ نہیں تھے جو جارج بُش کے لئے ہیں، آج عورت اپنی کارکردگی اور خود آگہی کے سبب ایک فرد نہیں رہ گئی ہے اس کی حیثیت ایک ایجنسی میں تبدیل ہو چکی ہے''۔

''کچھ بھی ہو'' میں جل کر بولی۔ ''عورت کو اپنی کھوئی ہوئی طاقت کی تلاش ہے''۔ وہ مجھے ایک پل گھورتا رہا پھر اپنا سگار جلاتے ہوئے بولا۔ ''طاقت صرف جسمانی یا فوجی ہی نہیں ہوتی، حکمت عملی بھی ایک طاقت ہے یہ سیاسی بھی ہو سکتی ہے اور جنسی بھی اور دیکھا گیا ہے کہ جنسی حکمت عملی اختیار کر کے طاقت کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ میں کچھ بدمزہ ہو کر کھانا کھائے بغیر اسکے یہاں سے کوئی بہانہ کر کے چلی آئی۔ باقی باتیں پھر لکھوں گی۔ اللہ حافظ''۔

میں حمیرہ کا خط ایک طرف ڈال کر بھاری قدموں سے ڈیوڑھی میں آئی۔ سامنے ٹم ٹم کھڑی تھی اپنی وکٹورین شان وشوکت کے ساتھ۔ میں اسکی سیٹ پر اداسی سے بیٹھ گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا، یکا یک ڈرائنگ روم میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں دوڑی ہوئی گئی، فون اُٹھایا، آواز آئی

''حمیرہ بول رہی ہوں۔ میرا خط مل گیا؟''

''ہاں آج ہی ملا ہے''۔ میں مری سی آواز میں بولی

''اب تم جو سیکڑوں میل دور ایک ٹم ٹم کا تصور لئے بیٹھی ہو مجھے ایمانداری سے ایک بات بتاؤ''

وہ چہک کر بولی۔ میں نے ویسی ہی کھوئی ہوئی سی آواز میں جواب دیا۔ ''پوچھو''۔

''ہوسکتا ہے وہ ٹم ٹم بنگال کے کسی مسلم لیگی کی نہ ہوکر بنارس کے کسی ہندو تاجر کی ہو جو لوٹ مار میں ہاتھ آئی ہو اور پھر کسی مسلمان کباڑی کے ہاتھوں تمہارے امیر خاندان میں فروخت کردی گئی ہو اور اس کباڑی کا نام ہی خلیق الزماں رہا ہو۔ اُس وڈیرے کی اس بات پر بھی غور کرو کہ چیزیں اپنی اصل حیثیت کو چھوڑ کر اجنبیوں کا روپ اختیار کررہی ہیں اور وہ ٹم ٹم حصولِ اقتدار کا بس ایک پُرزہ ہی بن کر رہ گئی ہو۔ اک بار پھر اس ٹم ٹم کو غور سے دیکھو اور اسکے ادھورے پن کو مکمل کر کے مجھے فون کردو۔ اللہ حافظ۔'' حمیرہ نے فون رکھ دیا۔

اُس رات میں اپنے بستر پر اپنی تصویروں کے البم کے صفحات دیر تک اُلٹتی رہی۔ دلت گاؤوں میں اجتماعی ریپ کی گئی عورتوں کا انٹرویو لیتے ہوئے تصویریں، اسپتال کے بستر پر پڑی سسرال میں جلائی گئی عورتوں سے بات کرتی تصویریں، الیکشنوں میں عورتوں کے لئے جھوٹے وعدے کرتی عورتوں کی تصویریں تانیثیت کی اُن علمبردار عورتوں سے بات چیت کے دوران کی تصویریں جنھیں خود بھی نہیں معلوم کہ عورت نئے حالات میں کس طرح بسر کرے۔ گجرات کی بیکری میں جلنے سے بچ جانے والی خانماں برباد عورت کی پچھلی گواہی سے پلٹ جانے پر کھینچی گئی تصویریں اور خدا سے بے آسرا ہوکر اور لال مسجد سے نکل کر گولیوں کی چھاؤں میں گرتی پڑتی اور بھاگتی برقعہ پوش لڑکیوں کی تصویریں جو حمیرہ نے بھیجی تھیں۔

میں اداس تو تھی ہی اور بھی اداس ہوگئی۔ اس البم کو نوچ کر پھینک دینے کو جی چاہا۔ پہلی بار مجھے خود پر شرم آنے لگی۔ مجھے لگا کہ میں جہاں بھی ہوں بس ایک گھوڑی ہوں اور ساری گھوڑیوں کے گھاؤ اور ان سے رسنے والا خون اور اس پر بیٹھنے اور بھنبھنانے والی مکھیاں ایک سی ہوتی ہیں چاہے وہ کوئی بھی زبان بولیں اور کوئی بھی کپڑے پہنیں۔ میرے آس پاس سناٹا گہرا ہوتا گیا۔۔۔۔ میں نے بھاری دل سے حمیرہ کو فون کیا اور کہا کہ مجھے خود پر شرم آنے لگی ہے۔

طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ کچھ دیر وہ چپ رہی پھر بولی۔

''میں ابھی ابھی پولس چوکی سے آ رہی ہوں۔ اتنا یاد رکھو کہ جو کچھ جیسا ہے اس پر کُڑھنے اور چڑچڑانے کا اس کے خلاف احتجاج کرنے اور فریاد کرنے کا بھی ایک مزہ ہے اور اس سے حاصل ہونے والی سرشاری اور طمانیت ایک اندر رہی اندر چلتے رہنے والا Movement ہے۔ ایک خاموش Continuity ہے۔ اپنے کو خود سے نفرت کرنے والوں میں شامل نہ کرو، تم سے نفرت کرنے والے بہت ہیں، مجھے اسی نفرت کے سبب بار بار یہاں تھانے پر بلایا جاتا ہے۔ بیٹھنے کو کرسی بھی نہیں دی جاتی۔ پوچھا جاتا ہے میں گالیاں دینا کب بند کروں گی۔

تو میں جواب دیتی ہوں۔

''جب تک دوسرے اپنے کندھے پر ان گالیوں کے بوجھ کو محسوس نہیں کریں گے۔''

پھر تھانیدار آنکھیں نکال کر کہتا ہے:

''ان گالیوں کا انجام معلوم ہے۔'' تو میں مسکرا کر جواب دیتی ہوں۔

''گالیوں کا انجام دیکھنے کے لئے نہ خلیق الزماں زندہ رہے اور نہ میں زندہ رہوں گی۔''

لگتا تھا کہ حمیرہ بہت تھکی ہوئی تھی، اس کا حلق بھی شائد خشک ہو رہا تھا میں نے اس سے بجھے دل سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا اقتدار کی لگام تھامنے والے کو جوان کی ٹم ٹم میں ہی ہمیں جتے رہنا ہے۔ میں نے فون رکھ دیا۔ دوسرے دن میں نے اپنی تصویر کا قدِ آدم (Cut out) ہارڈ بورڈ پر بنوایا اور ٹم ٹم کے دونوں بموں کے درمیان گھوڑی کے کھڑے ہونے کی جگہ پر اس کو کھڑا کر دیا اور اپنی اس تصویر کے منہ میں ٹم ٹم کی لگام پھنسا دی۔ پھر اسی حالت میں اس یادگار ٹم ٹم کی ایک تصویر کھنچوائی اور ٹم ٹم کو وزیر حسن روڈ پر کوٹھی تعمیر کرنے والے ایک مالدار ہندو جویلر کو دے دیا۔ لیکن ایک دن میں نے ٹم ٹم کی وہ بڑی سی یادگار تصویر جو ڈرائنگ روم کی دیوار پر سجی ہوئی تھی کمرے سے نکال کر کباڑ میں ڈال دی کیوں کہ میرا یہ گمان بڑی حد تک یقین میں بدل چکا تھا کہ وہ ٹم ٹم ہمارے خانداد میں کسی کباڑی نے بیچی تھی۔ جس کا نام خلیق الزماں تھا۔

☆☆☆

یادِ بزرگاں و دوستاں

الٰہ آباد
۲۶/اگست ۱۹۹۸ء

برادرم آداب

--------۔ ہماری زبان میں تبصرہ آگیا ہے، نیا دور، آجکل میں کتابیں اور دے دونگا۔ لیکن آپ اور آپ کا فکشن اب اس منزل پر ہے جہاں ایسے تبصروں کی کوئی اہمیت نہیں بس میرے بھائی کچھ چیزیں ایسی ادب کو دے دیجئے جو انقلابی ہوں۔ یہی وقت ہے، قلم پر دھار لگی ہے۔ تاریخ پر ایسی مُہر لگا دیجئے کہ مٹائے نہ بنے باقی جو آج کی دنیا ہے اس پر وارث کا مضمون تو پڑھا ہوگا میں اسی لئے اپنے رسالے کو اس طرح کی چیزوں سے پاک رکھتے ہوئے تخلیقی ادب پر زیادہ دھیان دیتا ہوں۔ اس بار تقریباً ۲۰ افسانے چھاپ رہا ہوں، ملاحظہ کیجئے گا۔

آپ کا
علی احمد فاطمی

کھنڈر قندیلیں اور خاموشی

عجیب پُر اسرار اور بھید بھرا علاقہ تھا وہ۔ ایک طرف پہاڑیاں اور دوسری جانب گھنا طویل جنگل۔ پہاڑوں کی وادی میں کچھ تاریخی اجڑے ہوئے خاندانوں کے تقریباً ایک ہزار گھروں کی ایک عجیب وغریب بستی تھی۔ اُس بستی تک پہنچنے سے شائد آدھا کلومیٹر پہلے ہی وہ خیراتی اسپتال تھا جو پرانی ریاست نے کبھی قائم کیا تھا اور جس میں بس یکا یک بہ طور سرجن میری تقرری شائد غیر معمولی حالات میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جس کی حیرت خیزی میں، میں گلے گلے ڈوبتا گیا، چاہتا ہوں کہ اس کا بیان بھی کچھ ایسے انداز میں ہو کہ اس حیرت خیزی کا رنگ نہ دھندلانے پائے۔

یہ تو مجھے شروع میں ہی وہاں معلوم ہو گیا کہ اسپتال کے پچھواڑے کچھ فاصلے پر جو کھنڈر تھا وہ کبھی ایک مشہور سرائے ہوا کرتی تھی۔ جس کو وہاں کے پرانے عملداروں یا راجاؤں نے کسی زمانے میں بنوایا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس زمانے میں سرائے کی بہت شہرت تھی کیونکہ اس راستے سے دکن کی طرف جانے والے تاجروں کی لگاتار آمد و رفت سے وہ کبھی خالی نہیں رہا کرتی تھی۔ میں اپنی قیام گاہ سے جو اسپتال کی پرانی مگر کشادہ عمارت کا ایک حصہ تھی، رات کے اندھیروں میں اس کھنڈر کو دیکھتا تو اس کے ٹوٹے پھوٹے دو بڑے سے در مجھے اپنی قیام گاہ کی کھڑکی سے ایسے دکھائی دیتے جیسے اپنا چہرہ چھپائے دو پھٹی پھٹی ڈراونی آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے اس ویرانے میں لگاتار گھورے جارہی ہیں۔ میرے کمپاؤنڈر طغرل بیگ کے کہنے کے مطابق اس کھنڈر کے کسی حصے میں خفیہ تہہ خانہ ہونے کی بھی افواہ تھی۔ کبھی کبھی راتوں میں جب آسمان پر چاند کا کہیں گزر نہ ہوتا تو مجھے اس کھنڈر کی جانب سے عجیب وغریب آہٹیں اس لئے محسوس ہوتیں کہ میرا گھر ادھر سے قریب تھا۔ ایک آدھ بار میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر جھانکا بھی تو مجھے ایسا وہم بھی ہوا جیسے کھنڈر کے آخری کنارے پر کچھ اونچے قد والے سیاہ سائے کچھ پلوں کے

لیے متحرک ہو کر اندھیروں میں کہیں سما گئے ہیں۔ میں پورے یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے ان ہیلوں کے آس پاس ایک آدھ قندیلیں بھی جگنو کی طرح ٹمٹماتی محسوس ہوئیں۔

ایک لق و دق ویرانہ، گہرا اندھیرا، کھنڈر، سیاہ ہیولے اور قندیلوں کی ٹمٹماہٹ، یہ سب دیکھ کر دل میں ایک بے نام سے خوف کی جھرجھری سی پیدا ہوتی۔ ایک بار ہمت کر کے طغرل بیگ سے اسکی وضاحت بھی چاہی تو نہ تو اس نے اسے میرا وہم ہی قرار دیا اور نہ کوئی تشفی بخش جواب ہی دیا۔ طغرل بیگ ہمیشہ سے ہی میری الجھن کا سبب اس لئے بھی تھا کہ مجھے وہاں کے بارے میں اس سے کچھ بھی معلوم کرنے میں کبھی کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر چہ وہ اپنے روزمرّہ کے رویئے میں میرا وفادار اور خیر خواہ ہی ثابت ہوا۔ وہ مجھے صرف ان باتوں سے ہی باخبر رکھتا جن کو وہ میرے لئے اور شائد اپنے لئے بھی ضروری سمجھتا۔ وہ زیادہ تر بے آواز خاموشی کے ساتھ صرف اشاروں کی کارگر زبان استعمال کر کے دوسروں سے اور خاص طور پر بستی کے کچھ خاص لوگوں سے میری ہونے والی گفتگو کے دوران کچھ ایسی احتیاط کے لئے مجھے مجبور کر دیتا کہ میرا منہ اتنا ہی کھلتا جتنا طغرل کھلوانا چاہتا تھا۔ جب مجھے یہ لگا کہ میں اسکا غلام ہوتا جا رہا ہوں تو اسکے ایسے برتاؤ پر ایک بار سختی سے ٹوک بھی دیا تو اس نے اپنے بارے میں ایک عجیب بات یہ بتائی کہ وہ ایک مجسٹریٹ باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہے۔ انٹر پاس کر کے وہ ایسی صحبت میں پڑا کہ اس کا پڑھنا لکھنا چھوٹ گیا۔ وہ گھر سے دوبار بھاگ کر بمبئی چلا گیا، بہت ٹھوکریں کھائیں، ایک نامی ڈاکٹر کے یہاں کمپاؤنڈری سیکھی۔ طغرل کے مطابق اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ سچ کیا ہے یہ آدمی کی سوچ طے کرتی ہے پھر اسکے اندر ان باتوں کا خوف پیدا ہوتا ہے جو اسکے سوچے ہوئے سچ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ اس بستی والوں کے خوف کیا ہیں؟ ’’آپ کے منھ سے کچھ غلط نہ نکل جائے اس لئے آپ کو کم بولنے دیتا ہوں۔‘‘

دھیرے دھیرے بعض ایسے ذرائع سے جن کو میں افشا نہیں کرنا چاہتا مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ بستی والے ملٹری کے ایک بہت بڑے خطۂ زمین پر قابض ہیں۔ قبضہ کرنے والے قدیم زمانے کے راجوں مہاراجوں کی رعایا سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے باپ دادا کاشتکار تھے۔ لیکن پھر لگان اور مالگزاری نہ دے پانے کے عیوض ان کے مالکان نے ان پر بہت ظلم ڈھائے

تھے اور انھیں ان کے پرکھوں کی زمینوں سے بے دخل کر کے ان کے خاندان کو جنگلوں میں کھدیڑ دیا تھا۔ سنا تھا کہ یہی لوگ اب ملٹری کی شہ پا کر جنگلوں سے نکل کر ملٹری کی زمینوں پر بس گئے تھے اور انکی بوئی ہوئی فصلوں تک فوجی سپاہیوں کے علاوہ عام آدمی کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایک بار طغرل کے منہ سے یہ بات نکل گئی تھی کہ یہ کسان اپنی کمائی بینکوں میں نہ رکھنے کے بجائے زمینوں میں دبا کر رکھتے تھے اور ان میں سے بعض انتہائی پوشیدہ طور پر شہر میں جا کر کبھی کبھی عیاشی بھی کرتے تھے اور جو نامعلوم خوف ان کے دلوں میں پل بڑھ رہے تھے ان کے تدارک کے لئے سب سے چھپا کر چپکے چپکے کچھ تدبیریں بھی کیا کرتے تھے۔ وہ خوف کیا تھے یہ مجھے طغرل نے کبھی نہ بتایا حالانکہ مجھے لگتا تھا کہ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ ایک بار کچھ ایسا بھی دبی زبان سے سننے میں آیا کہ بستی میں ایک آدھ بار کسی سزا کے تحت آنکھوں پر پٹی باندھ کر سب کے سامنے فوج کے ذریعہ کسی مجرم کو گولی بھی ماری جا چکی تھی۔

وہ پہلا دن جب اسپتال میں چارج لینے کے لئے میں نے قدم رکھا تو اسپتال کی حالت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے اور دوسروں کی طرح میں بھی وہاں سے الٹے پیروں واپس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے طغرل بیگ نے دھیرے سے کہا تھا۔

"آپ کو اپنی تنخواہ کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، چار مہینے میں ہی آپ کے پاس اپنی گاڑی ہوگی، جب لڑکی جوان ہوگی تو آپ کے پاس قیمتی سے قیمتی دولہا خریدنے کے لئے پیسہ ہوگا، جھوٹ بولوں تو کتّے کی تھالی میں کھلائیے گا"۔ یہ سوچ کر عجیب سا لگتا ہے کہ طغرل کو کتّے کی تھالی میں مجھے کھلانے کی ضرورت کبھی نہ پڑی۔ لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس علاقے کی پراسراریت بھی گہری ہوتی گئی اور میرے وسوسے بڑھنے لگے۔

طغرل مجھے چوری چھپے میرے آر پار دیکھنے کی کوشش کرتا، یہ شبہ بھی ہوتا کہ وہ میرے پرائیویٹ خطوط بھی پڑھ لیتا ہوگا۔ دیر رات کسی آہٹ کے سبب اگر میں باہر آتا اور کسی تجسس کے تحت چہل قدمی کر کے طغرل کے کوارٹر کی طرف جاتا جس کی باہری دیوار پر لگی ٹیوب لائٹ پر پتنگے منڈلایا کرتے تو مجھے کوارٹر کے دروازے پر پرانی وضع کا تالا لٹکا دکھائی دیتا۔ طغرل دیر

رات تک کہاں غائب رہا کرتا تھا یہ جاننے کے لئے میری چھٹی حس مجھے اس بات کے لئے آمادہ نہ کرتی تھی کہ میں اُس سے باز پرس کروں۔ کیونکہ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ کسی فرض منصبی کے مانند میری ہر آتی جاتی سانس کی نگہداشت پر وہ ایک ایسے غلام کی طرح مسلّط تھا جس کی نکیل کسی انتہائی پر اسرار غیبی ہاتھ میں تھی۔ کیسا عجیب معاملہ تھا ایک ماہر سرجن کی ساری اخلاقی قوت ایک معمولی کمپاؤنڈر نے سلب کر رکھی تھی۔ مجھے تو تنخواہ کے علاوہ فالتو روپے کا بند بنڈل بھی اسی کے ہاتھ سے ملتا تھا۔

ایک سہ پہر میں کھنڈر کے اس جانب جدھر بیروں کی جنگلی جھاڑیوں کا سلسلہ تھا، بے گیاہ میدان میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک زنگ خوردہ لوہے کا پھکنی جیسا ٹکڑا زمین سے تھوڑا سا سر نکالے دکھائی دیا۔ میں نے اس کے آس پاس کی مٹی ہٹائی تو اندازہ ہوا کہ وہ بندوق کی نال ہے۔ میں نے اس کو مٹھی میں لیکر کھینچا تو وہ اتنی خستہ تھی کہ ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں اسے گھر لے آیا۔ طغرل کی جب اس پر نظر پڑی تو مجھ سے اسکے بارے میں تفتیش کی پھر بتایا کہ اس میدان میں جہاں سے پھکنی بندوق کی نال کا وہ ٹکڑا ملا تھا وہاں کبھی سرائے کے مسافروں کے گھوڑے باندھے جاتے تھے اور جب کبھی جنگلوں میں چھپے ان مظلوم کسانوں کو جنھیں ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے جنگلوں میں کھدیڑ دیا گیا تھا مخبری کے ذریعے یہ پتہ لگتا کہ سرائے میں مالدار تاجر ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ سرائے پر حملہ کر دیتے اور ریاست کے محافظ دستوں سے ان کی جنگ ہو جایا کرتی، جنگلوں میں چھپے یہ غریب اور بے گھر کسان مارے جاتے تو انھیں اس میدان میں گاڑ دیا جاتا۔ مجھے بستی کے ایک بوڑھے مریض کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنگ میں زیادہ جانی نقصان ہونے کے سبب جنگل میں چھپے ان کسانوں نے اپنی لوٹ مار کا طریقہ دھیرے دھیرے بدل دیا، پھر سرائے میں مسافروں کے ایسے پر اسرار قتل ہونے لگے کہ مع سازوسامان کے مسافر کا پتہ نہ چلتا۔ اسی زمانے میں ایک حیرت انگیز بات اور ہوئی جو کسی عجیب وغریب کہانی کی طرح اب بھی وہاں مشہور تھی۔ اس کے مطابق میدان میں جہاں مقتولوں کو گاڑ دیا جاتا تھا وہاں سرنگیں سی بن گئی تھیں جن سے رات کے اندھیرے میں موٹے موٹے درندہ صفت جنگلی بلّے نکلتے اور سرائے کی دیواروں اور چھتوں پر گھومنے لگتے۔ وہ ایسی

وحشیانہ آوازیں نکالتے کہ بستر پر سوتے ہوئے مسافر کی آنکھ کھل جاتی اور وہ خوف سے کانپنے لگتے۔ رات کے اندھیرے میں سرنگوں سے نکلے ان بلّوں کی آنکھیں یوں چمکتیں جیسے صدقے کے ماش کے دانوں پر رکھ کر جلائے گئے ٹوٹکے کے دو منحوس چراغ ٹھہری ہوا میں اپنی کھڑی لو کے ساتھ جلتے ہیں۔ اس بوڑھے کا کہنا تھا کہ وہ ان مظلوم اور خانماں برباد کسانوں کی روحیں تھیں جو جنگلوں میں بھوکے مرا کرتے تھے اور لڑتے ہوئے محافظ فوج کے ہاتھوں قتل ہوا کرتے تھے اور جن کی لاشیں بھی ان کے وارثوں تک نہیں پہنچائی جاتی تھیں۔

دھیرے دھیرے مجھے محسوس ہوا کہ تھوڑے تھوڑے وقفے میں اسپتال میں نئی نئی تبدیلیاں ہونا شروع ہوگئیں۔ سب سے زیادہ جس شعبے کی ترقی پر زور دیا گیا تھا وہ سرجری کا ہی شعبہ تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ تبدیلیاں اندر ہی اندر ہو رہی تھیں اور باہر سے عمارت کی خستہ حالی ویسی ہی رکھی گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے باہر سے دیکھنے والوں کے لئے ذرا بھی لائق توجہ نہ بنانے کے لئے احتیاط کی جا رہی تھی۔ کچھ دنوں میں وہاں چند جوان لڑکیاں آنے لگیں جو نرس کے کاموں کی ٹریننگ پا رہی تھیں۔ جب میں نے طغرل سے ان لڑکیوں کے بارے میں پتا کرنا چاہا تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

''میری ذمہ داریوں میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ میں آپ کو یہ بتاتا رہوں کہ اسپتال میں کیا ہو رہا ہے، کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے''۔ اتنے روکھے پن سے مجھے متنبہ کر کے طغرل نے اپنے اور میرے درمیان کا رشتہ خاصہ واضح کر دیا تھا۔ اسپتال میں آنے والی لڑکیوں میں عمر میں سب سے بڑی اور اداس چہرے والی لڑکی جس کی گہری سوچ میں ڈوبی متانت سے بھری آنکھیں اور ماتھے پر کسی پُر اسرار عزم اور ارادے کی دمک تھی اس کی عمر سے میل نہ کھاتی تھی۔ وہ جو جو کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو جو خاصی پڑھی لکھی لڑکی تھی جب میں اس سے ملا تو مجھے اس کی پوری شخصیت میں ایک ایسی غمگینی کا گداز ملا جس میں بڑی کشش تھی۔ یہ احساس بھی ہوا کہ اسکے اندر کوئی پراسرار خفگی چھپی ہوئی ہے جو اندر ہی اندر اسے برافروختہ کئے رہتی تھی۔ وہ کس سے ناراض تھی میں نہ جان سکا، البتہ جو جو سے باتیں کرنے پر ایک بات ضرور معلوم ہوئی کہ وہ اسپتال در پردہ طور پر ملٹری کی نگرانی میں آچکا تھا۔ یہ

جان کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسپتال کے معمولی ملازم کی بھی اب فائل بن چکی ہے جنھیں خفیہ طور پر کہیں بھیجا اور واپس لایا جاتا ہے۔ یہ تو میرے تجربے میں آ ہی چکا تھا کہ اسپتال میں جو نیا عملہ مقرر کیا گیا تھا ہماری طرح ان کے بھی بال بچے وہاں نہیں تھے اور وہ لوگ اپنے برتاؤ سے گونگے اور بہرے لگتے تھے۔

ایک رات اچانک اور خلافِ توقع طغرل میرے پاس آیا۔ کچھ دیر یونہی چپ بیٹھا کچھ کہنے کے لئے اپنے کو تولتا رہا پھر بولا۔

''لڑکپن میں بمبئی بھاگا تھا میں، وہاں بے خوف گھومتا تھا، دو آدمی چھری سے کاٹ کر معمولی سپاری کے بدلے گٹر میں ڈالے تھے میں نے۔ مجھے کیسے مرنا چاہئے میں جانتا ہوں، آپ کیسے مرنا چاہتے ہیں یہ آپ کو طے کرنا ہے۔ چار دن میں لاکھوں کمانے کا شوق بہتوں کو ہوتا ہے۔ پر مشکل طرح سے مرنا ہر کوئی پسند نہیں کرتا۔ آپ کو یہاں رکنے پر پچھتاوا ہو رہا ہے، نکلنا ہے تو نکل جائیے ٹائم شائد تھوڑا رہ گیا ہے''۔

طغرل یہ کہکر چلا گیا میرے روکنے پر بھی نہ رکا۔ میری فکر بڑھنے لگی۔ انھیں دنوں اسپتال میں کچھ زخمی نوجوان لائے گئے، بعض اسطرح سے زخمی تھے کہ ان کے اعضاء کاٹنے پڑے۔ ان کے جسموں پر گولیاں لگی تھیں۔ دوسرے دن میں اسپتال نہیں گیا رات کسی وقت آنکھ کھلی تو کھڑکی پر آ کر کھڑا ہو گیا اور وہاں سے نکل جانے کے ارادے کو اپنے دل میں ٹٹولنے لگا، باہر دور تک اندھیرا تھا، اندھیرے میں پرانی سرائے کا کھنڈر بدستور کھڑا تھا اور اسکے دو وسیع در مجھے اسطرح ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے جسے چہرہ چھپائے دو آنکھیں گھور رہی ہوں۔ اسی وقت کھنڈر کے ویرانے میں مجھے اسی طرح کچھ سائے حرکت کرتے اور کچھ قندیلیں جھلملاتی محسوس ہوئیں جیسی پہلے کسی رات میں محسوس ہوئی تھیں۔ میں بے چین نیند سویا، مجھے لگا کوارٹر کی دیواروں پر کچھ موٹی موٹی جنگلی بلّیاں اپنی خونخوار آنکھوں کی ہیبت ناک مشعلیں جلائے دبے دبے بے آواز قدموں سے چل رہی ہیں اور جلتی ہوئی مقناطیسی آنکھوں کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور گردن موڑ موڑ کر بار بار میری خوابگاہ کو یوں گھور رہی ہیں جیسے اپنے شکار کو گھورتی ہیں۔

صبح ہوتے ہی میں نے طے کیا کہ مجھے وہ جگہ چھوڑ دینا چاہئے۔ تھوڑی ہی دیر میں میں

دو کلومیٹر کا وہ فاصلہ طے کر چکا تھا جہاں سے شہر جانے کے لئے پرائیویٹ ٹیکسی مل جایا کرتی تھی۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس جگہ کو تاروں سے گھرا ہوا پایا اور دیکھا کہ باہر نکلنے والے راستے پر فوجی تعینات تھے جنھوں نے مجھ سے باہر جانے کا اجازت نامہ طلب کیا۔ اس وقت یہ راز کھلا کہ دو دن میرے اسپتال سے غائب رہنے کے دوران وہاں ایک سپرنٹنڈنٹ آفس قائم ہو چکا تھا جس کے اجازت نامے کے بغیر عملے کا وہاں کے نکلنا ممکن نہ تھا، میں نے ایک مونچھوں والے فوجی سے پوچھا کہ پلک جھپکتے ہی اتنا بڑا علاقہ ملٹری کے کنٹرول میں کیسے آ گیا تو وہ ہنسا اور بولا۔

''ملٹری کی ضرورت پر علاقے اس کے کنٹرول میں آتے ہیں اور ملٹری کی ضرورتیں ساری ضرورتیوں سے اوپر ہیں۔'' میں الٹے پیروں اپنے ٹھکانے پر واپس آ گیا۔ اس وقت میرا یہ شک یقین میں بدل چکا تھا کہ طفرل استپال اور اسپتال کے چلانے والوں کے درمیان ایک پراسرار کڑی ضرور تھی۔ پھر مجھے عارضی Work permit پکڑا دیا گیا جس کی رو سے میں کبھی بھی نکالا جا سکتا تھا۔

انھیں دنوں رات کے اندھیروں میں کسی ہیولے کو میں نے کھنڈر کی جانب سے اسپتال کی طرف آتے ہوئے اپنی کھڑکی سے دیکھا، میں کوارٹر سے نکل کر اس ہیولے کے پیچھے پیچھے اسپتال تک گیا، دیکھا تو وہ جوجو تھی۔ وہ مجھے بہت دنوں بعد نظر آئی تھی۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ جوجو کی شادی ہو چکی تھی۔ اسی دن اپنے مخصوص اداس لہجہ میں اس نے کہا تھا: ''مجھے اندازہ ہے کہ آپ لوگ کن بھاری رقموں کے معاوضوں پر اسپتال میں کس کام کے لئے رکھے گئے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں میں بارود سے جھلسے ہوئے اور گولیوں سے چھلنی نوجوان یہاں لائے جائیں گے۔ ایک دن ان میں میرا شوہر بھی ہوگا۔ ہم ایک زمانے سے بے گھری اور بے سرو سامانی کا شکار تھے، فوج نے ہمیں اپنی زمینوں پر بسایا اور لاکھوں کی قیمت دلانے والی کاشت کا بندوبست بھی اپنی دیکھ ریکھ میں کیا۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم اپنی زمینوں پر پھر سے بس گئے ہیں اور ہمارے گھر اب نہیں اجڑیں گے۔ لیکن اب وہی فوج ہمارے نوجوانوں کو سرحد سے جڑے کسی خطے پر وہاں کی مقامی ملیشیا کی مدد کر کے اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے ہمارے مردوں سے

گوریلا لڑائی لڑ وا رہی ہے۔''

جوجو کی دی ہوئی خبر غلط نہ تھی۔ کئی مہینوں تک اسپتال میں زخمیوں کا آنا جانا لگا رہا، عملے پر طرح طرح کی سختیاں ہونے لگیں۔ کبھی گولیاں کھائے زخمیوں کی تعداد اتنی ہو جاتی کہ انھیں فرش پر لٹانا پڑتا۔ تقریباً دو سال تک یہی ہوتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ فوج کو دوسری طرف سے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ یہ انہیں دنوں کی بات ہے جب جوجو کا شوہر بھی مارا گیا تھا۔

پھر دھیرے دھیرے اسپتال کے حالات بدلنے لگے اور اس زخم خوردہ بستی سے بھی عجیب عجیب خبریں آنے لگیں جہاں کے ہر تیسرے اور چوتھے گھر میں کسی نوجوان کی تصویر دیوار پر ٹنگی ہوتی اور اس پر پھولوں کا ہار پڑا ہوتا۔ کچھ ماہ ایک پُر اسرار سے سناٹے میں گزر گئے، ایسا سننے کو ملا کہ ملٹری کی ضرورتیں بدل گئیں ہیں اور بدلے ہوئے حالات میں جن لوگوں کو ملٹری نے اپنی زمینوں پر بسایا تھا اور جنھیں وہ کہیں لڑنے کے لئے بھیجتی تھی انھیں سے وہ زمینیں خالی کروا رہی ہے۔ کیوں کہ وہاں جدید طرز کے ٹینکوں کا کارخانہ قائم کئے جانے کا منصوبہ تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ بستی کے لوگوں کا ایک وفد اپنی فریاد لے کر حکام سے جب جب ملتا ہے تو انھیں جواب دیا جاتا ہے کہ جدید جنگی ٹکنالوجی کو فروغ دینے کے راستے میں کسی بھی رکاوٹ کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

پھر میں نے دیکھا کہ اسپتال کے کئی پرانے لوگ نکال دیئے گئے۔ میرے سامنے بھی نوکری کی نئی شرطیں رکھی جانے کی افواہیں اُڑ رہی تھیں، اسپتال میں اب زخمی آنا بند ہو چکے تھے۔ پھر یہ خبریں آنے لگیں کہ فوج نے بستی کے کاشتکاروں کو وہ کاشت بند کرنے کا نوٹس دے دیا ہے جو غیر قانونی طور پر ملٹری ہی ان سے کرا رہی تھی۔ یہ بھی خبر آئی کہ فوج نے ان کی کھڑی فصلوں کو کٹوا کر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ کچھ دنوں بعد ایسے لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر کسی بہانے گولی مار دیئے جانے کی افسوس ناک اطلاع ملی۔ جنھوں نے اپنا پیسہ زمینوں میں گاڑ رکھا تھا اور وہ اسے چوری چھپے نکال رہے تھے۔ پھر آئے دن یہاں وہاں بستی کے گھروں میں چھاپے پڑنے لگے۔ اسی اثناء میں ایک دن اسپتال میں ایک بکتر بند گاڑی میں کچھ اجنبی لوگ آئے اور چپ چاپ طغرل بیگ کو اپنے ساتھ لیتے گئے اور پھر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اسے زمین

کھا گئی یا آسمان۔ پورے اسپتال پر ایک خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہر دن میری الجھن بڑھ رہی تھی، ایک رات بستی سے ایک جوان بیوہ کو نیم مردہ حالت میں اسپتال لایا گیا۔ جس کو کچھ انجان لوگوں نے اغوا کر کے ریپ کیا تھا، ایک نرس جس کا تعلق بستی سے تھا پچھاڑیں مار کر روتی ہوئی اس کے ساتھ آئی تھی جو اس کی چھوٹی بہن تھی۔ اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں ڈرتے ڈرتے یہ بتایا کہ اس کے گھر کے سامنے کچی زمین پر فوجی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشان صبح صبح دیکھے گئے تھے۔

جس بات کی مجھے سُن گُن لگ گئی تھی آخر کو وہی ہوئی، وہ دن آ گیا جب مجھے خاموشی سے برخاست کر دیا گیا، اس وقت بیوہ جو جو میرے سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی اس کے پیٹ میں چار ماہ کا حمل تھا۔ یکا یک وہ پوچھ بیٹھی۔

''اتنے دنوں میں تو آپ نے کافی کما لیا ہوگا۔'' میں کچھ نہ بولا۔ تو وہ اداسی سے بولی۔

''لیکن ہمارے گھروں میں کھانے کو نہیں ہے''۔ میں نے پھر کوئی جواب نہ دیا تو اس نے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کیوں ہوا۔ ہمیں بسا کر کیوں اجاڑا گیا۔ ہماری جوان عورتیں کیوں بیوہ ہوئیں۔ ہمارے مرد اجنبی دشمنوں سے کیوں لڑے، کیوں اجنبی زمینوں پر مارے گئے۔؟''

''سچ کہتا ہوں مجھے نہیں معلوم'' میں آہستہ سے بڑبڑایا اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ سیدھی میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''اور آپ نے کبھی جاننا بھی نہ چاہا صرف زخمیوں کی ٹانگیں اور ہاتھ کاٹتے رہے۔ کیا کسی دن سرجن ہی نہیں ایک انسان بھی بن کر آپ یہ سوچیں گے کہ آپ کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔'' میں کیا کہتا۔ بولا: ''میری کبھی ضرورت ہو تو یاد کر سکتی ہو۔''

میں وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلا آیا۔ کچھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہاں کے بارے میں عجیب سی خبریں چھپنے لگیں۔ جن میں وہاں کے جنگلوں میں روپوش کچھ باغیوں کا ذکر ہوتا جو چوری چھپے فوجی چھاؤنی پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔ شاید وہ فوج سے انتقام لے رہے تھے۔ ان چھٹ پٹ حملوں کا سلسلہ کئی برس چلتا رہا۔ ایک بار انگریزی کے ایک قومی اخبار میں ایک ایسی خبر بھی چھپی۔ جس کے دو نامہ نگاروں میں ایک نام جو جو کا بھی تھا۔ اس خبر کی رو سے پرانی

تاریخی سرائے کا وہ پُر اسرار کھنڈر جہاں سے رات میں مجھے کچھ ہیولے قندیلوں کے ساتھ حرکت میں نظر آیا کرتے تھے۔ وہاں فوجیوں نے ایک خفیہ تہہ خانے کا پتہ لگا لیا تھا۔ جس کو باغی اپنی سازشی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ اخبار میں جوجو کا نام دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ معلوم کرنا چاہا کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جو دس پندرہ سال پہلے حاملہ ہونے کے دوران بیوہ ہو گئی تھی۔ کوشش کے بعد اخبار کے مقامی دفتر میں جوجو سے میرا رابطہ قائم ہو گیا۔ پتہ لگا اپنا گھر اجڑنے کے بعد جوجو کسی طرح وہاں سے نکل آئی تھی اور کالج کے زمانے کے کسی پروفیسر کے زیرِ سایہ صحافت کے پیشے میں جدوجہد کر رہی تھی۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس کے ماضی کا کسی سے کبھی ذکر نہ کروں۔

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ اخباروں میں باغیوں کی فوج سے جھڑپوں کی خبریں آنا بند ہو گئیں۔ کبھی کبھی اخبارات لکھتے تو بس اتنا کہ باغی اپنی بکھری ہوئی طاقت کو پھر سے منظم کر رہے ہیں۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ چند برسوں کی وہ خاموشی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ ایک دن خبر آئی کہ سرائے کا وہ کھنڈر جس کے تہہ خانے کو فوج نے اپنے قبضے میں لینے کے بعد گولا بارود کا گودام بنا دیا تھا، بم سے اڑا دیا گیا اور اسپتال کی وہ عمارت جس میں فوجی پولس کے گھوڑے باندھے جا رہے تھے بارود کی آتش زنی سے متاثر ہوئی تھی۔ ان خبروں میں سے زیادہ تر خبریں جوجو لکھ رہی تھی۔ ایک تبصرے میں جوجو نے لکھا تھا کہ کچھ پرانے شرپسند قبائل نے تین دہائی پہلے ملٹری کی زمین پر ناجائز قبضہ کیا تھا اور وہاں غیر قانونی طور پر بس گئے تھے۔ لیکن جب انھیں وہاں سے بھگایا گیا تو وہ پڑوس کے جنگلوں میں گھس گئے اب بعض ملک دشمن سیاسی حلقے ان کی مدد کر رہے ہیں اور وہ جنگلوں سے نکل کر گوریلا لڑائی لڑ رہے ہیں۔ یہ تبصرہ پڑھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ میں نے جوجو کو فون کیا اور کہا:

''اگر میں تم کو اور وہاں کے حالات کو سرسری طور پر نہ جانتا تو مجھے تمہارے تبصرے کو پڑھ کر حیرت نہ ہوتی۔''

جواب میں ایک پل کو رُک کر وہ بولی: ''کیا آپ کو اس اسپتال میں کام کرنے والے وہ دن یاد ہیں؟''۔ ''ہاں۔ خوب یاد ہیں۔'' میں نے جواب دیا تو اس نے پوچھا۔

''کیا آپ وہاں اس لئے چپ تھے کہ آپ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ یا پھر سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ چپ تھے۔'' یہ سن کر میں کچھ دیر کے لئے سناٹے میں آ گیا۔ آج میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں وہاں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ اس لئے وہاں سے نکل جانے کی راہ ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے خاموش پا کر جوجو درد بھری آواز میں بولی۔

''جہاں بولنا ضروری ہو اور آدمی خاموش رہے ایسا آدمی خود اپنے وجود سے غدّاری کرتا ہے، اخبار کیا لکھ رہا ہے اس کی آپ کو فکر ہے۔ لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے پر آپ کچھ نہ بولے تو اخبار کے لکھے ہوئے پر کیا بولیں گے۔'' یہ سن کر میرے منہ سے کوئی آواز جب نہ نکلی تو جوجو دھیرے سے بولی: ''جو زندگی لکھتی ہے کیا اخبار اسے کبھی لکھ پاتے ہیں۔'' میرے منہ سے نکل گیا: ''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔''

ایک دن اچانک جوجو کا فون آیا۔ اسے میری پیشہ وارانہ امداد کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی ہدایت کے مطابق مجھے وقت ضائع کئے بغیر شہر کی مرکزی مارکیٹ کے کافی ہاؤس پر پہنچنا تھا، جب میں دن بھر کی تھکن کے باوجود وہاں پہنچا تو جوجو میرا انتظار کر رہی تھی۔ اب اس کے کافی بال سفید ہو چکے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ایک منٹ بھی ضائع کئے بغیر وہ مجھے ایک جیپ میں بٹھا کر چل پڑی۔ کچھ دیر تو سفر خاموشی سے گزرا پھر یہ سوچے بغیر کہ وہ مجھے کہاں لئے جا رہی تھی میں نے بات شروع کی۔

''شائد بیس برس بعد میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ اس عرصے میں کتنا کچھ گزر چکا ہے، ہماری زندگی میں۔''

''ہاں'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میری بیوگی کے بعد میرے یاں جب بچہ پیدا ہوا تو ہماری رسم کے مطابق بچے کو سب سے پہلے پروہت کی گود میں دیا گیا۔ ہمارے گھروں پر آئے دن تباہی آ رہی تھی۔ ہم بے سروسامان ہو چکے تھے اور ہمارا مستقبل اندھیرے میں تھا۔ جب بچے کو پروہت نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے مجھے اس بات پر مبارک

بادی کہ بچے کے ہاتھوں کے ناخن جنگلی بلّوں کے طرح نوکیلے اور آگے سے نیچے کی طرف گھومے ہوئے تھے۔ لیکن میں بچے کو اپنا دودھ نہیں پلا سکی کیوں کہ میرا دودھ خشک ہو گیا تھا اسکے بعد میری چھاتی مرجھا کر پچکنے لگیں، بوڑھوں نے کہا میں پروہت کے پاس جا کر چھاتی پر منتر پڑھواؤں، وہاں جا کر دیکھا تو اور بھی عورتیں موجود تھیں جنکے دودھ خشک ہو گئے تھے اور چھاتیاں پچک گئی تھیں۔ ہم دودھ خشک ہونے والی عورتوں کو کمر تک ننگا کر دیا گیا اور ہمیں دوسری عورتوں کو دکھایا گیا۔ پھر پروہت اُن عورتوں سے بولا۔

''انھیں غور سے دیکھو، پہلے ان ماؤں کے دودھ خشک ہوئے پھر چھاتیاں سکڑ کر اندر چلی گئیں اور ان کے سینے مردوں کی طرح سپاٹ ہو گئے''۔ پھر پروہت میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا اور آنکھوں میں گھور کر بولا۔ ''جب گھر بار اجڑتا ہے تو ماؤں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ دودھ خشک ہوتا ہے تو بھوک بچے کے ضمیر کو اسکی عمر سے پہلے جگا دیتی ہے۔ پھر جوجو رندھی ہوئی آواز میں بولی'' اس دن مجھے بتایا گیا کہ ہمارے بچوں کے جاگے ہوئے ضمیر انکے ہاتھوں کے ناخنوں میں بس گئے تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آج کہاں کہاں اور کتنی ماؤں کے دودھ خشک ہو چکے ہیں''۔ جوجو کی عجیب سی باتیں سن کر میں نے اس کے سینے پر نظر کی جو مردوں کی طرح سپاٹ تھا۔ پھر میرا دماغ ان واقعات کی کڑیاں جوڑنے لگا جو برسوں پہلے اسپتال میں قیام کے دوران رونما ہوا کرتے تھے۔ وہ کھنڈر، وہ پراسرار قندیلیں میرا دل کہتا تھا کہ ان ہیولوں میں جوجو کا بھی ایک ہیولا رہا ہو گا جنھیں میں اندھیروں میں محسوس کرتا تھا۔ یکا یک ہماری جیپ اوبڑ کھابڑ راستوں کو پار کرتی درختوں کے جھنڈ کے درمیان کھڑی ایک پرانی عمارت کے سامنے رک گئی۔ وہاں چند اجنبی چہرے ہمارے پہلے سے منتظر تھے اور ایک آپریشن ٹیبل پر ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا اور اسکے سرہانے ادھیڑ عمر کی ایک نرس کسی جونیر سرجن کے احکامات جلدی جلدی ادا کر رہی تھی، اسکا چہرہ دیکھا ہوا سا لگا، شاید وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کبھی نرس کی ٹریننگ لینے ہمارے اسپتال آیا کرتی تھی جو بعد میں فوج کا اصطبل بن گیا تھا، نوجوان کے زخموں کی نوعیت اور خاص طور پر سینہ میں ایک گولی کی جو کیفیت رپورٹ بتا رہی تھی وہ تشویش کن تھی، وسائل کے اعتبار سے آپریشن تھیٹر بس برائے نام تھا، اپنی پوری کوشش کے بعد بھی میں زخمی کو

نہیں بچا سکا۔ جوجو مجھے واپس بھیج کر وہیں رک گئی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ٹینک کارخانے کے اطراف میں ہونے والے حملوں پر کچھ سیاسی حلقوں کی سرگرمیاں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ بیس برس پہلے کے ہزار گھروں کی وہ اجاڑی اور بے گھر کی گئی بستی دوسرے اجڑے ہوئے حلقوں سے ساز باز کر کے ملتی جارہی تھی اور ان کی تعداد اب ہزاروں میں ہو چکی تھی، جوجو کا انگریزی اخبار جہاں وہ ملازم تھی اس سلسلے میں شہرت یافتہ موقف کی پُرزور حمایت کر رہا تھا اور اس مہم میں جوجو کا قلم پیش پیش تھا۔

ایک دن بس اتفاقاً جوجو مجھے کافی ہاؤس میں مل گئی، اسکے بال اب کچھ زیادہ ہی سفید ہوگئے تھے، چہرے پر بھی اداسی کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ میں نے اسکے حیرت انگیز اخباری بیانات کا ذکر چھیڑتے ہوئے پوچھ لیا۔

''تمہارا اخبار اس لڑائی کو لیکر مہذب سماج سے اسکو مشکل میں ڈالنے والے سوالات کیوں نہیں پوچھتا جو سچائی کی حقیقت تک پہنچ سکیں''۔ جواب میں وہ خاموش رہی تو میں نے پھر سوال پوچھکر اسے جواب دینے کے لئے مجبور کیا تو وہ بولی ''آپکو ہر ماہ فالتو روپئوں کے بنڈل راز داری سے جب طغرل بیگ دیا کرتا تھا تو آپ مشکل میں ڈالنے والا یہ سوال کیا پوچھتے تھے کہ یہ پیسہ کہاں سے آیا؟۔ آپ خاموش رہتے تھے اور اب یہ خاموشی خوفناک سے خوفناک واقعات کو پُر اسرار اور چٹپٹی کہانی بنا کر ان کا مزہ لینے کی عادی ہو چکی ہے۔ میں اخبار میں نہیں ایک Openion Mafia کی چھت کے نیچے کام کر رہی ہوں جو فوجی چھاونی سے کم دہشت ناک چھاؤنی نہیں ہے۔'' وہ میری جوجو سے آخری ملاقات تھی۔

اب ایسا بھی نہ تھا کہ مجھے جوجو کے آنسوؤں کی قیمت کا اندازہ نہ تھا۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ کسی وقت اس کے ساتھ بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کروں۔ لیکن عرصہ تک مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ ایک بار میں فرصت میں تھا، اخبار کے دفتر میں جوجو کو فون کر کے اپنے پاس بلانا چاہا تو وہ فون پر نہ ملی معلوم ہوا وہ چند ماہ پہلے نوکری چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کہاں گئی یہ کسی کو اندازہ نہ تھا کیوں کہ پھر اس کو کسی نے نہ دیکھا۔ میں دیر تک اس بات کا تأسف کرتا رہا کہ جوجو نے بھی مجھے کچھ نہ بتایا۔ پھر مجھے اس سے آخری ملاقات کے موقعے پر اس کی آنکھوں کے وہ موٹے

موٹے آنسو یاد آئے جنھیں وہ مجھ سے چھپانا چاہ رہی تھی۔ جو جو نے تو مجھ سے آپریشن کی میز پر مرنے والے نوجوان کا اس سے رشتہ بھی چھپایا تھا۔ حالانکہ میری نظر مرنے والے کے ہاتھوں کے ناخنوں پر پہلے ہی پڑ چکی تھی جو عام لوگوں کے ناخنوں جیسے ہرگز نہیں تھے۔ وہ ناخن کچھ ویسے ہی تھے جیسے کہ اس کے بچے کو گود میں لے کر پروہت نے بتائے تھے۔ کبھی کبھی جو جو کی آنکھوں کے وہ جھلملاتے آنسو یاد آجاتے اور دل یہ سوچ کر بوجھل ہو جاتا کہ میں اس کا اتنا اعتبار بھی نہ حاصل کر سکا کہ وہ میرے سامنے جی کھول کر رو سکے۔

ایک دن خبر آئی کہ جنگلوں میں چھپے کچھ چھاپہ ماروں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ جن میں ایک عورت بھی ہے۔ جو ایک انگریزی اخبار کی نامہ نگار بھی رہ چکی ہے اور اسکا نام جو جو ہے۔ یہ خبر پا کر میں بے چین سا ہو گیا۔ جو جو سے ملنے کی کوشش میں میری ملاقات اس کے وکیل سے ہوئی جو اسکی ضمانت کی عرضی تیار کر رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے جو جو سے ملوا دے گا لیکن بعد میں وکیل نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور بتایا کہ جو جو نے کہلوایا ہے کہ وہ قبروں میں سوئے ہوئے گونگے لوگوں سے نہیں زندہ لوگوں سے مل سکتی ہے جنھیں محسوس کرنا اور بولنا آتا ہو۔

یادِ بزرگاں و دوستاں

نیو جرسی (امریکہ)

۱۵ار جون ۱۹۹۹ء

اقبال مجید　　　　میرے دوست میری جان دعائیں اور پیار

حسن عابد سے اُدھار مانگ کر تمہارا ناولٹ **"کسی دن"** پڑھا، تمہاری کتاب **"دو بھیگے ہوئے لوگ"** تلاش کر رہا ہوں مگر کوئی بھی حامی نہیں بھر رہا ہے۔ حسن عابد، محمد علی صدیقی، راحت سعید کسی کے پاس نہیں یا پھر یہ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کر رہے۔ میں اپنی کوشش میں لگا ہوں۔ جوش صدی سیمنار میں شارب اور علی احمد فاطمی سے ملاقات رہی۔ شارب سے دو ایک بار امریکہ میں بھی ملاقات ہو چکی تھی، قمر رئیس اسمیں شریک نہیں ہوئے افسوس رہا۔

میرا بڑا لڑکا حسن ناصر نیویارک میں British Airways میں ملازم ہے، چھوٹا لڑکا یاسر اختر (عارف) ایک کمپوٹر کمپنی میں ملازم ہے اس سے چھوٹی لڑکی صحیفہ آجکل برمنگھم انگلینڈ میں صحافت میں M.S کر رہی ہے اور ستمبر میں ہمارے پاس آجائے گی۔ اپنے خاندان کی تفصیلات (ممکن ہو سکے تو باتصویر ضرور رکھنا۔) بھتو کو میری اور دردانہ (سبط کی اہلیہ) کی طرف سے بہت بہت دعائیں۔

تمہارا

سبط اختر

نئی مشقّت

ایک مکان تھا۔ خوبصورت آراستہ اور مضبوط، وہ مکان کئی بار آتش زدگی کا شکار ہوا یہاں تک کہ اس کے مکیں اس میں خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے۔ آخر کو ایک دن انہوں نے اس غیر محفوظ چھت کو جو انہیں بہت عزیز تھی تج دیا۔

مگر یہ دردناک انجام ایک دو دن میں نہیں ہوا کیوں کہ ان کی رہائش گاہ کی بربادی قسطوں میں ہوئی تھی۔

ہوا یہ کہ ایک دن بہت بڑی سڑک پر، بہت بڑے بازار کے درمیان، بہت سے لوگوں کے سامنے ایک بہت بوڑھے آدمی کو ایک موٹر نے ٹکر ماری اور نکل بھاگی۔ بوڑھا زخمی ہوا، کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں مگر غیر محفوظ مکان کے مالک مکان نے دیکھا، رُکا اور اپنی محبوبہ کو ایک دکان پر جا کر فون کیا کہ یہ اُس زمانے کی بات تھی جب لوگوں کے پاس موبائل نہیں ہوا کرتے تھے۔ جب اس کی محبوبہ نے فون اُٹھایا تو وہ بولا۔

''ڈرائیور کے ہاتھ اپنی گاڑی فوراً یہاں بھیج دو۔ میں بڑے بازار کے تیراہے پر کھڑا ہوں۔''

''کیوں؟''

''ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، میں زخمی کو ہسپتال پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''تم تو ٹھیک ہونا.....؟ سوال ہوا۔

''ہاں.....میں ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر کیوں بور کر رہے ہو؟'' اس کے بعد فون کاٹ دیا گیا۔ غیر محفوظ مکان کے مالک مکان کو فون کٹ جانے کا دُکھ ہوا، نہ جانے کیوں اسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر ٹیلی فون پر رابطہ جڑا رہے تو انسانیت پر بہت سے احسانات ممکن ہیں۔

مالک مکان نے جیسے تیسے زخمی کو ہسپتال پہنچایا۔ ایمر جنسی والے کمرے میں کوئی طالب

علم ڈاکٹر ٹیلی فون کا ریسیور ہاتھ میں لیے مایوسی کے عالم میں زخمی کے ساتھ آنے والے مالک مکان کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کا بھی فون کٹ گیا تھا۔ مالک مکان نے ڈاکٹر کے چہرے ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر پوچھا۔

''آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔''

''ہاں.....کئی بار ڈائل کیا مگر ہر بار انگیج۔ جب لائن ملی تو اس نے فون ہی کاٹ دیا۔''

''کس نے.....؟''

''شیلا نے''

''کون شیلا؟'' مالک مکان ٹپٹا سا گیا۔ جواب ملا۔

''ایک نرس ہے، اتنی خوبصورت، اتنی جان لیوا جتنی احمد شاہ ابدالی کی آرام گاہ کی کنیز۔''

''اس زخمی بوڑھے کے لئے جلدی کچھ کیجئے.....پلیز۔'' مالک مکان گھگھیایا۔

ایک وارڈ بوائے بلوایا گیا، ایک کال بک نکالی گئی۔ کال بک کے کالم بھر کر ایک ہاؤس سرجن کی طلبی کے لیے اُس وارڈ بوائے کو مقرر کیا گیا۔ وارڈ بوائے چلا گیا زخمی کو بھرتی کر کے ڈاکٹر طالب علم پھر غمگین ہو گیا۔

چار گھنٹے بعد قسطوں میں جلے گھر کے مالک مکان نے بوڑھے کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے ہسپتال فون کیا تو پتہ چلا کہ وارڈ بوائے ہاؤس سرجن کو لے کر ابھی نہیں آیا ہے۔ مالک مکان نے طالب علم ڈاکٹر سے جھنجھلا کر پوچھا۔

''کیا بروقت طبی امداد نہ ملنے پر بوڑھا مر نہیں جائے گا.....؟''

''ہاں مر بھی سکتا ہے۔'' جواب ملا

''کیا ہسپتال میں بھی مریض لاپرواہی کے سبب مر جایا کرتا ہے۔''

"Sorry" جواب ملا " Wrong Number "

مالک مکان مارے غصے کے وارڈ بوائے کے کوارٹر پر گیا، وہاں تالا لگا تھا، وارڈ میں کام کرنے والی ایک نوجوان دائی کو لیکر وہ میٹنی شو دیکھ رہا تھا۔ سینما ہال میں گھس کر اس نے وارڈ بوائے کا نام زور زور سے پکارا، وہ ملا تو گریبان پکڑ کر باہر لایا، اسکوٹر رکشہ پر بٹھا کر ہاؤس

سرجن کے گھر بھیجا۔ سرجن نے ضروری علاج کیا۔ چار دن بعد مالک مکان کے گھر میں فون کی گھنٹی بجی۔

''میں زیڈ بول رہا ہوں....'' آواز آئی۔

''فرمائیے.....''

''میرے زخمی باپ کو آپ نے ہی ہسپتال میں بھرتی کیا ہے۔''

''جی.....''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایکسیڈینٹ کیسے ہوا، کس سے ہوا؟''

''جی ہاں.....''

''میں آپ سے ملنے آؤں گا۔''

اتنے دنوں میں مالک مکان کو زخمی آدمی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں، زخمی آدمی سونے چاندی کا بیوپاری تھا اس کے پاس ہر طرح کے مکان تھے جن میں وہ حفاظت سے رہ سکتا تھا، اس کا ایک ہی لڑکا تھا اور گھر میں بہت سے ٹیلی فون لگے تھے۔ مالک مکان کے لئے کئی دن سے ایک بات بڑی تشویش کُن تھی جس کا ذکر خاص طور پر وہ زخمی کے لڑکے سے کرنا چاہتا تھا، ہوا یہ تھا کہ زخمی کو ہسپتال پہنچا کر اس نے اسی وقت پولیس کو فون بھی کیا تھا لیکن جواب میں اس سے کسی نے کہا۔

''ہم نے فون کے ریسیو کو کریڈل پر سے ہٹا کر الگ رکھ دیا ہے اس میں سے اب تم کو انگیج ہونے کی منحوس کوں کوں کی آواز سنائی دے گی اور یہ بالکل ویسا ہی گناہ ہے جیسے IN ہوتے ہوئے بھی OUT کا بورڈ باہر لگا دیا جائے۔ مالک مکان نے سوچ رکھا تھا کہ پولیس کو فون لگ جانے پر وہ انہیں تین باتیں ضرور بتائے گا، پہلی یہ کہ بوڑھے کو ٹکر کالے رنگ کی گاڑی نے دی تھی دوسرے یہ کہ گاڑی کے نمبر پورے نہیں پڑھے جا سکے MR کے بعد صرف ۲ کا ہندسہ پڑھا جا سکا اور تیسرے یہ کہ گاڑی چلانے والا سنہری فریم کا چشمہ لگائے تھا اور اس کی گردن موٹی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ فون سے کوں کوں کی ہی آواز آتی رہی آخر وہ متعلقہ تھانیدار سے ملنے بھی گیا تو تھانیدار نے اسے بتایا کہ اس طرح کی رپورٹوں میں کوئی دم نہیں ہے کیوں کہ جب

آپ زخمی بوڑھے کے لڑکے سے ملیں گے تو دیکھیں گے اس کے پورٹکو میں ایک کالی گاڑی کھڑی ہے جس کی نمبر پلیٹ پر MR کے بعد پہلا ہندسہ ۲ کا ہے اور لڑکے کی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ ہے اور اس کی گردن موٹی ہے پھر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ لڑکا باپ کی جائیداد کی لالچ میں اسے ختم کر دینا چاہتا تھا اور کیوں کہ اس طرح کے کیس ہمارے پاس آئے دن آیا کرتے ہیں اس لیے اب ہم ان کے لئے فون ہمیشہ انگیج رکھتے ہیں اس لیے آپ بھی نیند کی گولی کھا کر سو جائیے۔

پولیس کی اس بات سے پریشان ہو کر مالک مکان نے ایک وکیل کو جو اس کا پرانا دوست تھا ٹرنک کال کیا اور چیخ چیخ کر فون پر ساری روداد بتائی اور اپنی الجھن بھی بیان کی اور یہ بھی کہا کہ آخر پولیس سنجیدہ کیوں نہیں ہو رہی۔ ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ درمیان میں ہی ایکسچینج سے آپریٹر کی آواز آئی۔

''آپ کا ٹائم ختم ہو گیا'' مالک مکان نے جلدی سے چلا کر کہا۔

''لیکن پولیس سنجیدہ کیوں نہیں ہو رہی۔''

''اس لیے کہ ہمیشہ ایک ہی طرح سے سنجیدہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کے سنجیدہ رہنے کا ٹائم بھی ختم ہو گیا ہے'' یہ دوست کی نہیں آپریٹر کی آواز تھی۔

''کیوں؟'' مالک مکان پھر چیخا 'ایسا کیوں ہے.....؟''

''ہر بات اپنے وقت کے ساتھ جیتی ہے اور مرتی ہے، آپ کی باتوں کا وقت ختم ہو چکا ہے۔''

مالک مکان کو یاد آیا کہ اسی زمانے میں اس کے گھر کے ایک حصے میں آگ لگی تھی۔ کچھ آتش زدگیاں ایسی ہوتی ہیں جو فائر بریگیڈ کی مدد لیے بغیر جیسے تیسے بجھائی جا سکتی ہیں وہ بھی انہیں میں سے ایک تھی۔

پھر اسی دن مالک مکان نے ایک کام کیا۔ اس نے حادثہ کے وقت جو کچھ دیکھا تھا ایک کاغذ پر تحریر کیا اور اس کی دو کاپیاں بنا کر ایک بڑے روزنامے کے دفتر گیا اور کہا کہ جو اس نے دیکھا ہے اسے اخباروں میں چھپوانا چاہتا ہے۔ انہیں دنوں مالک مکان کو معلوم ہوا کہ زخمی کو پرائیویٹ وارڈ میں بھرتی کر دیا گیا ہے۔ مالک مکان بڑے اشتیاق سے زخمی کے لڑکے سے

ملنے اس کے گھر گیا تو دیکھا کہ پورٹیکو میں ایک کالی گاڑی کھڑی تھی اور اس کی نمبر پلیٹ پر MR کے بعد پہلا ہندسہ ۲ کا تھا اور جب زخمی کے بیٹے نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کی آنکھوں میں سنہرے فریم کا چشمہ تھا اور گردن بھی موٹی تھی۔ لیکن مالک مکان کو دیکھ کر یہ خوشی ہوئی کہ زخمی کے پاس وارڈ میں ہر وقت اچھے ڈاکٹر اور عمدہ نرسیں موجود رہتی ہیں۔ مالک مکان نے ڈائریکٹری میں ڈاکٹر آر کا نمبر تلاش کیا جس کی دیکھ ریکھ میں بوڑھے کا علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر فون پر مل گیا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کے وارڈ نمبر ۳ کا بوڑھا مریض اب کیسا ہے۔''

''اچھا ہے، آپ کون بول رہے ہیں.....؟''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اب تک مرا کیوں نہیں۔'' کسی دوسرے کی آواز تھی، دوسری طرف سے کوئی تیسری آواز آئی جو ڈاکٹر آر کی آواز ہرگز نہ تھی..... ''یہ تو اپنے مقدر کی بات ہے، میرا بھائی کئی روز ہسپتال میں پڑا رہا کسی نے پلٹ کر خبر نہ لی کیوں کہ وہ غریب تھا۔''

''سنئے آپ کس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں'' یہ آواز ڈاکٹر آر کی تھی جو مالک مکان سے مخاطب تھا۔

''اس بوڑھے کو ڈاکٹر اپنے لیے زندہ رکھنا چاہ رہے ہیں'' دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا'' وہ جانتے ہیں کہ اس کے پاس مال ہے دنیا کے تمام دولت مندوں کو ڈاکٹر اپنے لیے زندہ رکھنا چاہتے ہیں''۔

''یہ کون بیچ میں بول رہا ہے۔'' مالک مکان کو پھر ڈاکٹر آر کی آواز سنائی دی لیکن جواب میں کوئی کسی اور سے کہہ رہا تھا'' تم کس کس سے لڑو گے وہ پورا مافیا ہے وارڈ بوائے، نرسیں، ڈاکٹر، ٹیکنیشین سب ایک منظم گروہ کے مانند ایک ہی سازش میں بندھے ہوئے ہیں۔''

دوسرے دن کے اخبار میں ایک خبر چھپی۔ بوڑھے جوہری کے حادثے کی خبر، لیکن اس میں نہ تو اس کالی موٹر کا ذکر تھا اور نہ ان نمبروں کا اور نہ اس سنہری کمانی والی عینک کا جس کو مالک مکان نے اپنی تحریر میں لکھ کر دیا تھا۔ خبر میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھاری ٹرک شہر کے متمول تاجر کو زخمی کر کے بھاگ گیا۔ اس دن مالک مکان نے اپنے اس مکان کا تفصیلی جائزہ لیا جس میں کسی

زمانے میں پوری طرح خود کو محفوظ سمجھتا تھا۔ اس کے مکان کے مختلف حصوں میں اور بھی کئی مکین رہتے تھے جنہوں نے آئے دن کی آتش زدگی سے اسے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ مالک مکان نے ان لوگوں سے کچھ نہ کہا کیوں کہ وہ آتش زدگی جو پہلے کسی مکین کو اندر سے جلادے اور پھر کھڑکیاں اور دروازے جلائے اس کا مداوا مالک مکان ہی نہیں بلکہ کسی کے بس میں نہ تھا۔ مالک مکان اکیلا رہ گیا تھا اور تنہائی کا احساس اب اسے خاصہ پریشان کرنے لگا تھا۔ وہ مکان کو پھر سے بنوانا چاہتا تھا نئے نقشے اور جدید آسائشوں کو ذہن میں رکھ کر وہ اس کی تعمیر چاہتا تھا....

دوسرے دن مالک مکان کے فون کی گھنٹی بجی۔

''میں بول رہا ہوں.....'' مالک مکان نے آواز پہچان لی اور بولا۔

''کہئے اب آپ کے باپ کی طبیعت کیسی ہے....؟''

''ٹھیک نہیں ہے۔ خیر، آپ اخبار میں کیا لکھ کر دے آئے تھے، داروغہ جی بھی بہت غصہ کر رہے تھے۔''

''جو لکھ کر دیا وہ چھپا ہی نہیں'' مالک مکان بولا۔

''وہ چھپ نہیں سکتا تھا۔''

''کیوں......؟''

''اس اخبار کی پالیسی ہمارے ہاتھ میں ہے۔''

''اوہ.....'' ریسیور ہاتھ میں کانپ گیا۔

''سنئے'' ادھر سے آواز آئی ''کیا آپ اپنے مکان کا کوئی حصہ کرائے پر اٹھا سکتے ہیں؟''

''جی نہیں.....'' پھر اس نے بتایا کہ اس کے مکان کی جب تک تعمیر نو نہ ہو جائے کوئی اس میں رہنے کو تیار نہ ہوگا لیکن اس کے جواب میں بوڑھے کے جوہری بیٹے نے مالک مکان سے صاف بتا دیا کہ اس کے پاس ایسی ترکیب ہے کہ مکان کی نئی تعمیر بھی ہو جائے اور اس میں بہت سے کرائے داروں کو تحفظ کے پورے احساس کے ساتھ رکھا بھی جا سکے۔ مالک مکان خوش ہو گیا اور وہ ترکیب معلوم کرنا چاہی تو جواب ملا۔

''ہر بات فون پر نہیں کہی جا سکتی مجھ سے میرے مکان پر ملئے''۔

دوسرے دن مالک مکان کو معلوم ہوا کہ زخمی بوڑھا دنیا سے چل بسا۔ اینٹی بایوٹک کیپ سولوں نے کام نہیں کیا کیوں کہ ان میں دوا کے بجائے ریت بھری ہوئی تھی اور اس سے پہلے کہ پولیس متعلقہ کیمسٹ کی دکان پر چھاپہ مارتی کیمسٹ نے متعلقہ ڈاکٹر سے بات کرلی تھی۔ مالک مکان کو اس روز ایک بار فون کی عظمت کا بڑی شدّت سے احساس ہوا اور اس نے طے کیا کہ وہ اپنے نئے گھر کے ہر کمرے میں فون ضرور لگوائے گا اسی وقت متعلقہ کیمسٹ کو فون بھی کیا۔

''ہلو کیا آپ ہی نے وہ کیپ سول بوڑھے مریض کے لیے سپلائی کیے تھے۔''

''ہمارے پاس بہت سے مکان ہیں اور بہت سے کرائے دار....'' مالک مکان کو جواب ملا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ کے دیئے ہوئے کیپ سول سے کھریا مٹی نکلی تھی'' مالک مکان نے زور دے کر پوچھا۔

''جی بات یہ ہے کہ ہم اس کرائے دار کو رکھتے ہیں جو ہمیں اچھا کرایہ دیتا ہے'' جواب ملا۔

''کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ ڈاکٹر سے فون پر آپ کی کیا بات ہوئی تھی''۔ مالک مکان نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

''ہمارے یہاں بہت سے ٹیلی فون ہیں آپ کس فون کی بات کر رہے ہیں؟''

''میں اس کیپ سول کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جس میں.....''

''ٹھہریئے.....'' دوسری طرف سے آواز آئی ''یہ ریزیڈنشیل لائن ہے آپ دکان کا نمبر ملا کر بات کیجئے، یہ خیال رکھئے گا کہ دکان پر بھی کئی فون ہیں.....''

مالک مکان کی گردن یہ جواب سن کر لٹک گئی، بڑی شدت سے اسے نئے مکان کی ایک بار پھر ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ پہلی فرصت میں بوڑھے آدمی کے لڑکے سے ملنے گیا، لڑکے سے مل کر خوشی ہوئی۔ مکان کی تعمیر کی ترکیب سن کر وہ باغ باغ ہوگیا مگر لڑکے نے ایک کڑی شرط بھی اس کے سامنے رکھ دی۔

''تمہارے گھر میں نئے فون بھی لگیں گے مگر تم کو اپنے پرانے نمبر کے فون ریسیور ہمیشہ کریڈل پر سے ہٹا کر الگ رکھ دینا ہوگا تاکہ اس فون پر تم سے رابطہ قائم کرنے والے کو ہمیشہ کوں کوں کی آواز سنائی دے۔ جب مالک مکان کے نئے مکان کا بندوبست ہوگیا اور اس کے

یہاں نئے فون بھی لگ گئے تو کچھ دن اس کا پرانا فون ہی کھڑ کھڑاتا رہا۔ پرانی عادت سے مجبور ہو کر وہ فون اُٹھالیا کرتا۔ ایک دن پرانے فون کی گھنٹی بجی۔ بے خیالی میں مالک مکان نے ریسیور اُٹھالیا۔

''ہلو'' یہ اُس کے پرانے دوست کی آواز تھی۔ ''تو تمہارے خیال میں اس بوڑھے آدمی کو کسی ٹرک نے کچلا تھا کالی موٹر نے نہیں'' مالک مکان کو لڑکے سے کی ہوئی شرط یاد آئی، اس نے جھٹ سے فون رکھ دیا۔ دوبارہ پھر گھنٹی بجی.... اس نے پھر غلطی سے اُٹھیالیا اس بار اس کی پرانی محبوبہ بول رہی تھی۔

''یار بہت شاندار مکان بناڈالا.....''

''لیکن اس میں جگہ نہیں ہے سارے فلیٹ کرائے پر اُٹھ چکے ہیں'' اس نے سٹپٹا کر فون جلدی سے رکھ دیا لیکن گھنٹی پھر بجی مالک مکان کو غصہ آ گیا۔ فون پر اکڑ کر بولا۔

''اب کیا بات ہے.....'' دوسری طرف سے کیمسٹ بول رہا تھا۔ ''کیا آپ جاننا چاہیں گے کہ میں نے کیپ سول والے معاملے میں ڈاکٹر سے کیا بات کی تھی.....؟''

مالک مکان نے جھنجھلا کر فون پٹک دیا، جب تک اس کا نیا نمبر مشہور نہیں ہو گیا بہت دنوں تک مالک مکان کو اسی طرح کی نئی مشقت سے گزرنا پڑا۔
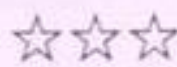
یادبزرگاں ودوستاں

حیدرآباد

۲۴رجولائی ۱۹۹۸ء

اقبال صاحب آداب عرض

۔۔۔۔۔۔۔آپ نے انعام کی مبارکباد دی۔آپ کے خلوص کا شکریہ کیا ادا کروں۔آپ نے لکھا ہے یہ انعام ڈاک میں ہونے والے خرچ سے کم ہے۔لیکن اخراجات تو اور بھی ہیں۔ میں اگر ایک ویمن کالج کا آفر قبول کرلیتی تو پروفیسر شپ سے رٹائر ہوتی۔مگر بقول انور کے ایک پاگل پن سر پر سوار ہے کہ اپنی سُدھ بُدھ کھوکر سارا دن سر جھکائے لکھتی رہتی ہوں۔ نہ تو کبھی اپنے آپ کو کیش کروانے کا خیال آیا نہ دہلی کی ادبی سیاست کی طرف دیکھا۔آپ کی نئی کہانی کہاں آرہی ہے اسے منتظر ہوں پڑھنے کے لئے۔

مخلص

جیلانی بانو

آگ کے پاس بیٹھی عورت

سور پالنے والوں کی بستی کی روزمرہ کی زندگی، ان کی گندگی، ان کی عورتوں کی برہنگی اور ننگے دھڑ نگے کیچڑ میں لتھڑے اور گرد سے اٹے بالوں والے ناک بہاتے اور غلاظت میں لوٹتے بچوں پر فلم بنا کر بڑے انعامات کی دوڑ میں شامل ہونے والے فلم ساز بڑے کہانی کاروں کو پانچ ستارہ ہوٹل کے عالیشان کمروں میں ٹھہرا کر ان ناداروں پر لکھی جانے والی فلمی کہانیوں کے امکانات پر بحث کرتے اور اس موضوع پر ماضی میں بنائی گئی بعض فلموں کے کیسٹ ری پلے کر کے ان کی بخیہ ادھیڑتے۔ ہوٹل کے انھیں کمروں کی صاف ستھری میزوں پر ان مظلوموں پر ہونے والے مظالم کی پرانے اخباروں کی چھپی تصویریں بکھری ہوتیں اور دل دہلا دینے والی ٹاپ اسٹوریز چائے کافی کی چمچماتی پیالیوں اور ایش ٹرے میں جلتی قیمتی سگریٹوں کے آس پاس چکنے کاغذ پر چھپے انگریزی رسالوں سے کاٹے گئے تراشے بھی پڑے ہوتے جن کی خوبصورت سطروں کے نیچے لال قلم سے جگہ جگہ خط بھی کھنچا ہوتا۔

ایسے ہی ایک کمرے کی میز پر دو چار گھنٹے گزارنے کا موقع مجھے بھی ملا تھا۔ ایک پروڈیوسر نے دلت سبجیکٹ کو لیکر کام کرنے کے لیے اپنی منشاء بتا کر مجھے ہوٹل میں مدعو کیا تھا اور ٹیکسی کے کرائے کے نام سے کچھ رقم ملنے کی مجھے امید تھی۔

اس شہر میں جہاں روشنیوں کی چکا چوندھ تھی اور اس چکا چوندھ میں ہماری تمنا اور خواہش کے پورے ہونے کی کمزور سی امید کے درمیان بڑے جان لیوا فاصلے تھے۔ وہاں کی بھیڑ بھاڑ میں ہر طرح کی مخلوق آباد تھی۔ مزدور، کاریگر، اسکالر، اسمگلر، جرائم پیشہ، مہذب اور غیر مہذب، متمول اور غریب فاحشائیں پیروں اور ولیوں کے مزار سب ہی کچھ تو وہاں تھا اور میں ان کے درمیان ہزاروں غریب الوطن نوجوانوں کی طرح کبھی ادھر تو کبھی ادھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے اس بیٹھک میں یونہی نہیں بلا لیا گیا تھا۔ دعوت نامہ ملنے سے پہلے میری سفارش

کرنے والے دوست کے ساتھ جس کی اُس پروڈیوسر تک پہنچ تھی ایک شام مے نوشی کے وقت مجھے بھی بلالیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس شام میں صبح سے بھوکا تھا اس لیے پروڈیوسر کی عمدہ شراب کے پہلے ہی گھونٹ نے میرے بھوکے پیٹ پر کچھ ایسی لات ماری کہ میں نے دیر تک گلاس کو ہاتھ نہ لگایا اور میز پر سجے کھانے کے سامان پر بار بار ہاتھ مارتا رہا۔ اس موقع پر سخت انٹرویو لیا گیا، مجھ سے پوچھا گیا کہ میں نے فکشن میں کیا پڑھا ہے۔ میں نے بالزاک، داستاؤسکی، ٹالسٹائی، ہیمنگوے اور ایمیلی ژولا وغیرہ کا نام لیا۔ پوچھا گیا ہندوستانی ادب کے بارے میں کچھ بتاؤں، پھر دلت ادب کے بارے میں بات ہوئی، میں نے اسے مہاراشٹر کے ایک شاعر کی نظم سنائی جو اس طرح تھی۔

میرے پاس ہے / دلت کی زبان / اونچی ذات کی خاطر
میرے پاس ہے / سورن کی بھاشا / دلت کی خاطر
میرے پاس ہے / اپنی زبان / خود کی خاطر

پروڈیوسر نے تب مجھ سے کھل کر بات کی، کہا اس میں دلتوں کی دوسروں کے لیے کھلی اور ننگی نفرت نہیں ہے۔ ہماری فلم دلت کی ایک ایسی خاموش چیخ ہوگی جس کو ہم Cash کر سکیں۔ تھوڑی دیر میں وہاں ایک خوبصورت لڑکی آ گئی۔ وہ پکی عمر میں آ چکی تھی، گلے میں چھوٹے رودراکش کی مالا، ذرا لمبے قد کی، ہونٹوں پر لپ اسٹک، چہرے پر غازہ، بھویں خوبصورتی سے ترشی ہوئی کمانیں، آنکھیں بڑی بڑی بے تکلف اور بلند قہقہوں کے ساتھ ہنسنے والی۔ انگریزی اچھی بول رہی تھی، معلوم ہوا کسی انگریزی میگزین میں باتصویر مضامین لکھتی تھی۔ اس کے لیے خاص بوتل اور گلاس کا شاید پہلے سے انتظام تھا۔ پہلے کچھ دیر چپ چاپ ہماری باتیں سنتی رہی اور سگریٹ پیتی رہی۔ ایک ایک لفظ کو توجہ سے سنتی رہی، پروڈیوسر نے اپنے پروجیکٹ کا جو کاروباری پہلو سمجھایا غالباً اس سے وہ مطمئن نہیں تھی۔ یکا یک سگریٹ بے دردی سے کچل کر وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر پروڈیوسر نے اپنی بات جاری رکھی۔ وہ کہتا رہا:

''ہر معنی کے اندر ایک روشنی ہوتی ہے، اس روشنی کی طاقت کتنی دور تک اُجالا کر سکتی ہے اور اس اجالے میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے۔ بس ہمیں ایسی Situations چاہئے اس فلم میں۔''

اس بار لڑکی نے پروڈیوسر کو آگے موقع نہیں دیا اور بے صبری سے اپنی بات شروع کرتے ہوئے مجھ پر سیدھا ایک سوال داغ دیا'' آپ وائلنس کو کیا سمجھتے ہیں؟'' میں یکا یک پوچھے سوال پر چکرا گیا ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ دوسری سگریٹ جلا کر مجھے گھورتے ہوئے بولی۔'' آپ یہ جان لیجئے کہ ہم فلم بنانے کے بہانے ایک طرح کے تشدد کے پیشے میں داخل ہو رہے ہیں۔''

"Exactly" پروڈیوسر نے اپنا ایک ہاتھ اپنے ہی گھٹنے پر زور سے مارا اور بولا۔'' دیکھئے پیشہ وارانہ تشدد کا نظریہ یہ ہے کہ جس حقیقت کو آپ بیان کر رہے ہیں وہ سیدھی سیدھی ایک گھماسان جنگ کے علاوہ اور کچھ نہیں، ایسی جنگ جس میں کچھ سوچنے سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی بھی مہلت نہیں ہے۔ یہ آپ اچھی طرح سے جان لیجئے کہ ہمیں کسی پر تشدد عمل کے پیچھے اس کی سماجی پیچیدگیوں کو فوکس نہیں کرنا ہے۔ ہم کوئی سماجی ذمہ داری نبھانے کے لیے فلم نہیں بنا رہے ہیں، ہم کچھ ٹھیک کرنے یا کسی پرابلم کا حل بتانے کے لئے کام نہیں کر رہے ہیں۔'' یہ سن کر پروڈیوسر کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے فوراً لڑکی بول پڑی'' کیونکہ ہمارے جینیٹک انجینئر یہ بتا رہے ہیں کہ انسان Genetically اور Neurologically ازل سے ہی ناقص پیدا ہوا ہے، اس لیے اس کے سماج میں شیکسپیئر ہمیشہ پیدا ہونگے اور ٹریجڈی لکھی جاتی رہے گی۔ پھر پروڈیوسر نے بات آگے بڑھائی۔'' جب سے دنیا بنی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ادھر کچھ ٹھیک ہوتا ہے تو ادھر کچھ بگڑ جاتا ہے، ادھر کوئی ہنستا ہے تو ادھر کوئی رونے لگتا ہے، ہمیں ان ان چکروں میں نہیں پڑنا، سب کما رہے ہیں، جیبیں بھر رہے ہیں ہمیں بھی بھرنا ہے۔ تماشائی کے لیے تشدد کو چرس کی سگریٹ کا ایک کش بنانا ہے ہمیں۔ اس اتنے بڑے شہر میں لوگ چھریوں اور پستولوں سے ہی نہیں مر رہے ہیں، جیو اور جینے دو صرف کتابوں کے لئے ہے، سب اسکائی اسکریپر میں نہیں رہتے۔ بہتوں کو فٹ پاتھ پر رہنا پڑتا ہے۔''

میں ان دنوں بہت پریشان تھا، دو چھوٹے چھوٹے بچے میری بیوی کے ساتھ ہمارے آبائی قصبے میں اپنی نانی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ یہاں قسمت آزمانے آیا تھا، مجھے کام چاہئے تھا جو اس پروڈیوسر کے لیے اس کی مطلوبہ چرس فراہم کرنے پر ہی ممکن تھا، میں اس موقع کو ہاتھ

سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میری خدمات سے انھیں مایوسی نہیں ہوگی۔ بہر حال کہانی تیار کی جانے والی بیٹھکوں میں مجھے بلایا جانے لگا۔ کہانی تو ایک وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ معاملہ اسے مزید طاقت ور اور موثر بنانے کا تھا۔ انھیں دنوں مجھے یہ فکر رہنے لگی کہ زیادہ بولڈ موضوع اور اس کی تیکھی پیش کش سنسر کے چکر میں پڑ جاتی ہے۔ ایک دن ریتا سالومن سے میں نے یہ سوال اُٹھا ہی دیا۔ ریتا سالومن اس لڑکی کا نام تھا جس کی باتوں نے میرے انٹرویو کے موقع پر کچھ پریشان کر دیا تھا۔ اس نے میری ہمت بندھائی، بتایا کہ جنسی مناظر کے مقابلے میں تشدد کے مناظر دکھانے کی کھلی چھوٹ ہے اگر آپ سرکاری اداروں پر براہ راست کھلی چوٹ نہ کریں تو آپ کی دلیری کی تشہیر کی جائے گی اور دوسرے نیم جمہوری ملکوں کو فخر کے ساتھ یہ سب دکھا کر اپنی پیٹھ ٹھکوائی جائے گی کہ دیکھو ہمارے یہاں اظہار رائے کی کس قدر آزادی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں اور بدنما داغوں کو بھی نہیں چھپاتے کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ میڈیا کتنی ہی سفاکی اور دلیری سے سسٹم اور اس کے ذمہ داروں کو کتنی ہی گھناونی اور موٹی گالی کیوں نہ دیں اسے اظہار کی آزادی کہہ کر گالی کھانے اور دینے والا چائے کے کپ میں ڈبو کر پی جاتا ہے۔ ہمارا کام اس گالی کے گرم رہنے کی چھوٹی سی مدت میں جتنا کچھ کما سکنا ہے کما لینا ہے۔ لیکن اس موضوع کو لیکر میرے دل میں ایک وسوسہ بار بار کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا، دل یہ کہتا کہ ان دلتوں کی بستیاں اب پچاس برس پرانی بستیاں نہیں ہیں، وہاں مختلف محکموں کی گاڑیاں اب گھومنے لگی ہیں۔ سرکاری کیمپ بھی لگتے رہتے ہیں، لیڈر ووٹ مانگنے پہنچتے رہتے ہیں، ایک آدھ پرائمری اسکول ماسٹر نیم کے پیڑ کے نیچے سوکھے موسم میں کچھ بچوں کے ساتھ اپنی قسمت بھی پھوڑتے دیکھے جا سکتے ہیں، بینک والے لون دیتے گھومتے پائے جاتے ہیں۔ نیلی ساڑیاں پہن کر اور ریڈ کراس کا تمغہ لگا کر کالی عورتیں بچوں کو پولیو ڈراپس پلانے بھی آجایا کرتی ہیں، اخبارات پہنچنے لگے ہیں، دور دراز علاقوں کے فوٹو گرافر وہاں کی زبوں حالی کی تصویریں نئے نئے زاویوں سے کھینچتے رہتے ہیں۔ پھر یہ بھی میں پڑھتا رہتا تھا کہ یہ دلت اب اتنے بے خبر نہیں ہیں، زمانہ انھیں ہماری ناولوں میں لکھے جا رہے بیانات سنا تا رہتا ہے۔ ''سکھ کا سمبندھ اندریوں سے ہے، اندریاں جو دیوتا اندر سے زیادہ گنی

اور گیانی ہیں .... گیان/ دھیان/ یوگ/ پریوگ/ سادھنا/ کلپنا/ اندریوں کے آدھین ہوتے ہیں۔ (اس لئے) اندریوں کو ہمیشہ جگائے رکھنا/ اونگھنے بھی نہیں دینا۔ (دو یہ بانی، غضنفر)

ایک دن کافی ہاؤس میں ریتا سالومن مجھے اکیلی مل گئی۔ اس کے بیگ میں کچھ انگریزی فلموں کے اسکرین پلے تھے، مجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر اکیلے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہم نے ایک بلیک کافی منگائی، دراصل اس پروجیکٹ میں شامل ہونے کے بعد مجھے اکثر بے خوابی کی راتیں کاٹنا پڑ رہی تھیں۔ میرے اندر سوالات اُٹھتے تھے، ریتا کو اکیلا پا کر میں نے اس سے پوچھ ہی لیا ''کیا دلت سماج ایک سسٹم کا حصہ نہیں؟ اپنے تمام Phinomina سے جڑا ہوا ایک دوسرے سے مربوط۔''

''تمہیں اس سے مطلب!'' ریتا نے تیوریاں چڑھا کر مجھے دیکھا، شاید وہ بات کو ٹال رہی تھی مگر میں چپ نہیں رہا۔

''میں تمہیں سنجیدگی سے کچھ سمجھانا چاہتا ہوں۔''

''OK'' وہ بولی تو میں نے بات شروع کی۔

''ہم فلم بنا کر جس غلیظ گالی کا تشدد اپنے تماشائی کے منہ پر مارنا چاہ رہے ہیں اور اس کے بدلے خود اپنے اندر پل رہے وائلنس کی تسکین چاہ رہے ہیں تو ایسی مقابلہ آرائی کے میدان جنگ میں صرف جارحانہ رویہ کو ہی (Cash) کرنا کیا ہماری زندگی کو اور مشکل نہیں بنا دے گا؟''

''So What'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

''کیا ہمارا پروڈیوسر، کیمرہ مین اور اسکرین پلے رائٹر جو تشدد کی اس جنگ میں برسرپیکار ہیں گھر میں بیٹھی اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے اپنے لیے ہمدردانہ اور سکون بخش تعاون کی امید نہیں کرتے؟''

''کرتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''تو کیا خاندان کی عورتوں اور ان سماجی رشتوں سے جن میں دفتروں میں کام کرنے والی خواتین، جہاز کی ہوسٹس اور نرسیں وغیرہ بھی شامل ہیں کیا ان سب سکون پسندوں کی

خدمات ہمیں ایسے آرام کے لمحات نہیں مہیا کرتیں جس میں ہم اپنی پرتشدد گالی کو اور زیادہ پُر اثر اور دھاردار بنا سکیں۔''

''ہاں ان کے تعاون سے ہمیں آرام کے لمحات ملتے ہیں، آگے بولو۔'' وہ بولی تو میں نے کہا۔

''تو کیا ہم اپنے ان مہربانوں کو اپنی اس لوٹ کھسوٹ کا وہ حصہ دیتے ہیں جس سے ان کے تعاون کا صلہ چکایا جا سکے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اس ناانصافی اور حق تلفی کی صورت حال میں انہیں گھسیٹ کر اس سے بھی بڑے تشدد پر اترنے کے لئے ہم انھیں آمادہ نہیں کر رہے ہیں؟''

ریتا سالومن پڑھی لکھی لڑکی تھی، ایک کامیاب جرنلسٹ تھی، اپنی عمر سے زیادہ دنیا دیکھے ہوئی ایک عورت جس کی آنکھوں کے گرد اس کی شب بیداریوں نے سیاہ حلقے ڈال دیئے تھے۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں احتیاط برتتی۔ میری باتیں سن کر اس کے کشادہ ماتھے پر ایک کھڑا بل پڑ گیا۔ دھیرے سے بولی'' لگتا ہے تم بھی غلط کو ٹھیک کرنے کی بیماری پال رہے ہو۔ فلمیں یا فلم بنانے والے غلط کو ٹھیک نہیں کرتے، ٹھیک یا غلط زندگی کرتی ہے۔ فخر کرنا یا پچھتانا فلموں یا فلم بنانے والوں کا نہیں زندگی کا کام ہے۔ ہم زندگی سے اپنی ضرورت کا سامان تو لے رہے ہیں خود زندگی پر فلم نہیں بنا رہے ہیں۔''

ریتا سالومن سے اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد مجھے جیسے چپ سی لگ گئی۔ اب میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایسی جارحیت کی تلاش ہے جو ان لوگوں کی زندگی کے اندر سے نکل کر آئے جو ہماری فلم کا موضوع ہیں۔ اس پروجکٹ کی شب و روز کی بحثوں کو الگ رکھتے ہوئے میں نے اتنا سیکھ لیا تھا کہ اہمیت اس بات کی نہیں کہ آپ کیا دیکھ رہے ہیں بلکہ کہاں سے کھڑے ہو کر اور کس زاویئے سے دیکھ رہے ہیں اور پھر یہ بھی کہ اپنے اس دیکھے ہوئے میں سے دوسروں کو کیا اور کتنا دکھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جتنا فریم کے اندر ہے وہی کام کا ہے باقی سب بے معنی۔

انھیں دنوں مجھے فلم مینجر نے بتایا کہ پروڈیوسر کے ساتھ دلتوں کی بستی میں مجھے بھی جانا ہے۔ وہاں اسپاٹ پر آرٹ ڈائرکٹر معائنہ کرنا چاہتا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ ریتا سالومن بھی ساتھ جا رہی ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سالومن جس سے ریتا کی طلاق ہو چکی تھی دلت بستی کی ہی پیداوار تھا جہاں تیس برس پہلے عیسائی مشنری نے اسے گود لے کر پڑھایا لکھایا تھا

اور سالومن نام رکھا تھا۔

جب ہماری جماعت گاڑیوں سے اس مقام پر پہنچی تو ہمیں لگا کہ ہمارے کسی کارندے نے ہماری آمد سے وہاں کے مکھیا کو مطلع کر دیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے دو چار پائیاں اور نرکل کے دو چار پرانے مونڈھے وہاں کے چودھری نے ڈال رکھے تھے۔ ایک طرف ایک بیل گاڑی کھڑی تھی۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑی سے باہر زمین پر لکڑی کا چولہا جلائے ایک عورت اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف تھی۔ اس دن ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ موسم پر ایک عجیب طرح کی الکسی اور تھکن سی طاری تھی، کچھ فاصلے پر ان لوگوں کی پالی ہوئی غلاظت میں لتھڑی سورنیاں اپنے بچوں کو پیچھے پیچھے لئے اس جھاڑ جھنکاڑ میدان کی طرف سے واپس آ رہی تھیں جسے وہ لوگ رفع حاجت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ کیچڑ زدہ راستے کے کنارے جھاڑیوں کی جانب ایک کشادہ گڑھا تھا جس میں برساتی پانی لبالب بھرا تھا۔ اس کے کنارے پڑے پتھروں پر دو تین کم سن لڑکیاں کپڑے دھو رہی تھیں۔ میں نے کھلے اور شفاف آسمان پر کچھ گدھوں کو منڈلاتے دیکھا شاید بستی کے کسی چمار نے گاؤں کی سرحد پر کسی مردہ جانور کی کھال کچھ ہی دیر پہلے اتاری ہوگی، کبھی کبھی اگر ذرا بھی ہوا چلتی تو شمال کی جانب سرنگوں قدیم بون مل (Bone Mill) کے اوبڑ کھابڑ کمپاؤنڈ میں جانوروں کی ہڈیوں کے ڈھیر سے مل کی ادھڑی دیواروں کو پھاند کر شدید بو کا ایک تیز جھونکا آتا۔ لیکن ہم سب نے طے کر لیا تھا کہ ہم اپنی ناکوں پر رومال نہیں رکھیں گے اور ان لوگوں میں اس طرح گھلنے ملنے کی کوشش کریں گے جیسے ہم بھی ان میں سے ایک ہوں۔ ہم میں سے کوئی بھی کار میں نہیں بیٹھا تھا۔ ہم نے چارپائیاں اور مونڈھے سنبھال لیے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہماری آمد پر وہاں کے مردوں اور عورتوں میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ بچے بھی ایک بار موٹروں کو گھیر کر اپنی راہ ہو لیے تھے۔ گاؤں کا مکھیا اوپر کے بدن سے ننگا تھا، سر پر انگوچھا باندھے ایک کان میں پیلی دھات کی بالی پھنسی ہوئی۔ ابھی وہ ہمیں سلام کر کے کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس کی دھوتی کی گانٹھ سے موسیقی پھوٹنے لگی، اس نے گانٹھ سے ایک موبائل نکالا۔ غالباً بون مل سے کال تھی، مجھے لگا وہاں کے کئی لوگ بون مل میں کام کرتے ہوں گے۔ مکھیا موبائل پر بات کر رہا تھا اس کے سینے کی ننگی پسلیاں

جنھیں گنا جا سکتا تھا اور کھلے پیٹ پر پڑے ہوئے بل جنھیں شمار کرنا آسان تھا بات کرنے میں اوپر نیچے ہو رہے تھے۔ اس کی پنڈلیوں کا سوکھا ہوا چمڑا اپنے بالوں سے زیادہ سیاہ پڑ چکا تھا اور ہاتھوں کی نسوں کا ابھرا ہوا جال اس کی جانگ میں متواتر ہونے والی کھجلی کو مٹانے کے کام میں مصروف ہو کر مرتعش رہتا تھا۔ ڈائرکٹر نے سگریٹ نکالی، ڈبیا سے ایک سگریٹ تھوڑی باہر نکال کر مکھیا کی طرف بڑھائی۔ اس نے کسی تشکر کے اظہار کے بغیر ایک سگریٹ گھسیٹ لی۔ اسے گھما پھرا کر دیکھا پھر اپنے داہنے کان اور کنپٹی کے درمیان رکھ کر پھنسا لی۔ جب تک ہمارا آرٹ ڈائرکٹر بستی کے اندرونی حصے میں جا چکا تھا۔ وہ عورت جو آگ کے پاس مصروف تھی اور جس کے قریب ہی زمین پر ایک بچہ سو رہا تھا بار بار میری توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی رہی ہوگی آدھے سے زیادہ بدن اس نے کالی اوڑھنی سے چھپایا ہوا تھا جس کی اوٹ سے اس کی تھرکتی اور بولتی آنکھیں اس کے پل پل کے متغیر محسوسات کو آن کی آن میں ایسے واضح اشاروں میں بیان کر رہی تھیں جن کے لیے مزید کسی بولی ہوئی زبان کی ضرورت نہ تھی۔ ڈائرکٹر جب مکھیا سے کچھ ضروری باتیں کر چکا تو میں نے مکھیا سے کہا۔

''یار کچھ پانی وانی تو پلا دو۔'' مکھیا نے چہرے پر بڑھے ہوئے شیو کو پہلے تو کھجایا پھر ادھر دیکھنے لگا جدھر برگد کے پیڑ کے نیچے ہماری گاڑیوں کے پاس مع بیلوں کے ایک مختصر سی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ مکھیا نے ہاتھ کے اشارے سے بلا کر پکارا۔

''دڈا جل لے آؤ۔'' بیل گاڑی والا ایک سینی میں اسٹیل کا جگ اور کچھ شیشے کے گلاس لیکر ہماری طرف بڑھا تو مکھیا بولا ''پانی برتن سب ٹھاکر گاؤں کا ہے۔'' ہم سمجھ گئے کہ پڑوسی گاؤں سے یہ انتظام کیا گیا ہے۔ جب بیل گاڑی والا گلاسوں میں پانی انڈیلنے لگا تو ڈائرکٹر نے اسے روک دیا۔ گاڑی والا منھ کھولے ہمیں دیکھنے لگا۔ تب گاؤں کا ایک لڑکا جو سوکھی شاخوں کا گٹھر اپنے کندھے پر لادے آ رہا تھا، زمین پر پٹک کر مکھیا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ اس کا لڑکا تھا۔ چولہے کے قریب بیٹھی عورت کے پاس کوئی عورت سوپ میں کچھ آلو لے کر آ گئی تھی اور اپنا چہرہ چھپائے بغیر ہم کو تیکھی نظروں سے مسلسل گھور رہی تھی۔ اس کی گود میں بچہ تھا اور بے بندھی چھاتیوں سے لپٹی دھوتی پر بائیں چھاتی کی طرف تازہ گیلا داغ تھا جیسے دودھ بہہ کر

کپڑے سے چپک گیا ہو۔

ڈائرکٹر خندہ پیشانی سے مکھیا کو دیکھ رہا تھا۔ اسے آنے والے دنوں میں ان لوگوں کا خاصہ عملی اشتراک درکار تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

''ہم تمہارے برتن میں پانی پئیں گے۔ اُٹھاؤ وہ گلاس۔'' اس نے چولہے کے قریب زمین پر لڑھکے ہوئے المونیم کے گلاس کی طرف اشارہ کیا جدھر آگ کے پاس وہ عورت بیٹھی تھی جو صرف آنکھیں کھولے سہا دینے والی بجلیاں چمکا کر ہمیں دیکھ لیا کرتی تھی۔ وہ آنکھیں اپنے مقابل کی نظریں جھکا دینے والی آنکھیں تھیں، لگتا تھا زندگی کے حوادث نے کوٹ کوٹ کر ان میں بصیرت بھر دی تھی۔ اس بصیرت میں ایک مقناطیسی زور اور کشش تھی۔ وہ آنکھیں اپنی دونوں بھوؤں کے زاویئے کو ایک پل میں ایسے بدل کر اور پھر ہمارے وجود کو مسترد کرتے ہوئے لپلپاتی تلوار کی طرح پورے منظر کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی تھیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ ان نظروں کے انداز میں کہیں شکایتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں لوہے کی طرح سب کچھ ٹھنڈا پڑ چکا تھا، سخت ہو چکا تھا۔ ڈائرکٹر کے گلاس مانگنے پر میں نے محسوس کیا کہ مکھیا اپنی جگہ سے نہیں ہلا، لکڑی کا گٹھر لانے والا لڑکا بھی زمین پر بیٹھا رہا۔ اتنے میں پانچ سات برس کی ایک لڑکی ایک جھونپڑی سے نکل کر چولہے کے پاس بیٹھی عورت کی طرف بڑھی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی ایک تختی تھی جس پر ملتانی مٹی پوتی ہوئی تھی۔ لڑکی نے تختی عورت کے چہرے کے سامنے کر دی۔ عورت نے پڑھا ''کا، کھا، گھا'' پھر بولی ''اور لکھ'' لڑکی جانے لگی تو عورت کی نظر اس کے ننگے پاؤں پر پڑی تو چولہے سے جلتی لکڑی لڑکی کے پاؤں پر ماری اور چلائی ''چپل ڈال'' لڑکی لنگڑاتی ہوئی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔

ڈائرکٹر نے پھر مکھیا سے کہا ''وہ گلاس اُٹھاؤ نا۔ ہم تمہارے گلاس میں پانی پئیں گے'' مکھیا دو پل گردن جھکائے چپ رہا پھر بولا ''نہیں صاحب، وہ آپ کے لئے نہیں ہے۔''

''بھئی ہمارا نام رام کمار شرما ضرور ہے لیکن ہم تمہارے بھائی ہیں۔ اُٹھاؤ گلاس'' مگر مکھیا یونہی گردن جھکائے کھڑا رہا پھر دھیرے سے بولا ''آپ پھوٹو کب بناؤ گے؟''

''جلدی ہی'' ڈائرکٹر نے جواب دیا۔

''پھر ٹکٹ لگاؤ گے تب پھوٹو دکھاؤ گے۔''

''ہاں۔تمہارے لیئے ٹکٹ نہیں ہوگا۔''

''ایک بار جھاڑ اپھرتے ہمرا پھوٹو بنا تھا، چوتڑ ہمارا پورا کھلا تھا۔''

''اچھا اچھا'' پھر اس نے اُٹھ کر چولہے کے پاس بیٹھی عورت کو مخاطب کیا۔''ارے وہ گلاس تو دینا۔'' عورت فوراً اُٹھ کر وہ گلاس ڈائرکٹر کو دے گئی اور اپنی جگہ پہنچ کر سانس روکے بے چینی سے یہ بھی دیکھتی رہی کہ ڈائرکٹر کیا کرتا ہے۔ ڈائرکٹر نے گلاس کو تھوڑے سے پانی سے اندر باہر دھویا اور پانی انڈیل کر پی لیا اور گلاس لڑکے کو دے دیا جو اسے عورت کو واپس دے آیا۔ عورت گلاس لے کر اپنے چہرے کو چھپائے بغیر پورے جسم سے تنی ہوئی ایک فاتح کی طرح ڈائرکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

ڈائرکٹر پانی پی کر مونڈھے پر بیٹھ گیا تھا اور دلتوں سے اپنی بھائی چارگی کے جذبے کی نمائش کر کے دل ہی دل میں خوش ہو کر مکھیا کے چہرے کو اس کے تاثرات جاننے کے لئے اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ آخر کو رومال سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے مکھیا سے بولا۔

''ہم شرما ہیں، پنڈت! تم اتنا سنکوچ کیوں کر رہے تھے گلاس دینے میں؟''

''وہ آپ کے پانی پینے کے لیے نہیں تھا صاحب۔''

''کیوں؟ تم پی سکتے ہو، تو ہم کیوں نہیں پی سکتے؟'' ڈائرکٹر نے پوچھا۔

''اس سے ہماری عورت سور کے بیمار بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے۔''

یہ سن کر ڈائرکٹر سناٹے میں آگیا، ہم نے چور نظروں سے ڈائرکٹر سے نظریں ملائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر یکایک میری نظر اس عورت کی طرف اُٹھ گئی جس نے ڈائرکٹر کو گلاس اُٹھا کر دینے کی پیش قدمی کی تھی۔ مجھے لگا جیسے اس پیش قدمی سے ڈائرکٹر کی جانب سے ہونے والے خاطر خواہ عمل کے سبب وہ عورت کچھ ایسی مسرور اور مطمئن تھی جیسے اس کا پورا وجود کسی لمبی اذیت، اندوہنا کی اور درد و داغ کو سہتے سہتے یکایک نکلنے والی ایک ایسی سسکی بن گیا تھا جس سسکی کے نکل جانے سے روح کو کچھ ایسا آرام مل جاتا ہے جیسا دیر سے ٹھہرے ہوئے پیشاب کے نکل جانے سے ملتا ہے۔ وہ عورت آگ کے پاس بیٹھ چکی تھی، اس کے چہرے کو

اس بار میں آنکھیں گڑا کر دیکھتا رہا تو مجھے احساس ہوا جیسے پڑوس میں جلتی اور شعلے لپکتی لکڑیوں کی وہ آگ چپکے چپکے نہ جانے کب سے اس کے خون کی گردش اور سانسوں کے زیر و بم میں بھی جل رہی تھی، اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں بھی وہی آگ سیال بن کر رواں تھی اور اسی سیال میں ہزیمتوں، شکستوں، محرومیوں اور دل آزاریوں کا کیسا کیسا زہریلا اور فاسد خون کسی زخم خوردہ سانپ کے مانند بے قابو ہو کر دوڑتا صاف نظر آرہا تھا۔ پھر یہ دیکھ کر تو ہم سب ہی دم بہ خود رہ گئے کہ آگ کے پاس بیٹھی وہ عورت ڈائرکٹر کے جھوٹے کیے ہوئے المونیم کے گلاس کو لوہے کے چمٹے سے پکڑے لپکتے ہوئے شعلوں پر رکھ کر گرم کر رہی تھی اور وہ اس گلاس میں پانی پینے والے کو یوں دیکھ رہی تھی جس کے بے رحم تشدد کو دنیا کی کسی زبان کے بھی الفاظ نہیں صرف کیمرہ ہی بیان کر سکتا تھا۔ کیا کبھی وہ ڈائرکٹر کسی موقع پر اس عورت سے ملا تھا۔ اگر ہاں تو وہ کیمرے کے فوکس سے باہر تھا۔

اس رات ہم اپنے ٹھکانے پر آ کر شراب کے گلاسوں کے ساتھ خود کو بہت مسرور محسوس کر رہے تھے۔ زندگی نے ہمیں فلم کا ایک ایسا منظر بنانے کا سامان دے دیا تھا جس کا تشدد دور تک اپنے معنی کی روشنی دے سکے۔ ڈائرکٹر کا خیال تھا کہ یہ واقعہ اس کی فلم کا سب سے پہلا سین ہوگا جو عورت کی آنکھوں سے پھوٹتی نفرت کی چنگاریوں پر ڈزالو (Disolve) ہوگا۔ فلم کے انجام کے لیے اب ہمیں اپنے پیشہ کو دی گئی اس سے بڑی گالی کی تلاش تھی۔

☆☆☆

یہ صفحہ رتن سنگھ کے نام

رتن سنگھ کم سے کم نصف صدی کے عرصے سے میرا یار جانی ہے۔ ادبی سفر کے آغاز میں شائد ہی کوئی افسانہ ایسا رہا ہو جس کو لکھ کر سنانے کے لئے مجھے تلاش نہ کیا ہو۔

حیرت ہے کہ اس کا ایک بھی قابلِ ذکر خط میرے پاس محفوظ نہیں، برسوں سے ہم فون پر بات کر کے کام چلا لیتے ہیں۔

ا۔م

رمنہ

اپنی زندگی کے نامراد دور میں اس فلکِ ناانصاف کے ہاتھوں کئی بادشاہوں کو تہہِ خاک ہوتے ہوئے دیکھنے والا میں وہ بدنصیب ہوں جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔ شاید قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ جب توپ کے گولوں سے شہر کا آسمان کالا ہو رہا تھا تو زمین پر موت اپنا بے درد ناچ ناچ رہی تھی مگر تب میں زندہ رہا اس لئے کہ گھر کو لٹتے دیکھوں مری ہوئی اولادوں کو روؤں اور برسوں خانمابرباد رہوں۔ اب تو اس بوڑھے اور ناتواں دل کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہمارے سروں پر مسلّط فرنگی وہ منگول نہیں ہیں جو چین، روس اور فارس جیسے عظیم تہذیبی علاقوں کو پامال تو کر ڈالتے تھے مگر کسی ایک جگہ ٹھہرتے نہ تھے۔ جب کہ یہ فرنگی تو خدا کا وہ قہر ہیں جو اب نسلاً درنسلاً ہماری چھاتیوں پر مونگ دلتے رہیں گے۔ غدر میں لکھنؤ کے اجڑنے کی داستانیں خوب لکھی جا چکی ہیں اُن حالات کو بیان کرنے کا نہ اب مجھ میں یارا ہے اور نہ قوت، ہاں جب میری جوانی کا زمانہ تھا، بدن میں جان تھی، فکر میں اُڑان تھی تو قلم پکڑنے کو جی چاہتا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے حضرت غالبؔ جنگ مرحوم کے خلف نے جو فرنگیوں کا خیر خواہ ہے، میرا برسوں پُرانا بھولا بسرا سامان جوان کے خاندانی کتب خانے میں غدر کی لوٹ مار اور آگ زنی سے بچ کر کتب کانے کی باقیات میں اتنے عرصے سے کہیں دبا رہ گیا تھا مجھے بھیجا ہے۔ خدا رکھے کیسے بامروّت وضع دار اور بااخلاق لوگ ہیں یہ خیال کر کے کہ میں نے ان کے پدرِ بزرگوار راجہ بختاور سنگھ کا نمک کھایا ہے اور برسہا برس ان کے کتب خانے میں اپنی خدمات انجام دی ہیں سارا خاندان آج بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہی میری تعظیم کرتا ہے۔

جب سامان لانے والے ملازم نے میرے سامنے لوہے کا ایک چھوٹا سا کالا صندوق رکھا جس کے کنڈے میں ایک مختصر سا تالا لٹک رہا تھا تو اسے پہچان کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ صندوق کی چھت پر بیضوی طرز پر کٹا ہوا ایک کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر خطِ نستعلیق میں منشی

شباہت علی اصفہانی کے ہاتھ کا لکھا میرا نام اس وقت بھی موجود تھا۔ مجھے یاد آیا کہ وہ چھوٹا سا صندوق ہمیشہ کتب خانے میں اپنے تخت پر ہی رکھتا تھا صندوق کو پا کر میں نے صندوق رساں کے نام ممنونیت کے اظہار کا رُقعہ کمزور ہاتھوں سے لکھا اور ملازم کے چلے جانے پر بصد اشتیاق اُس لٹکے ہوئے تالے کو کھولنے کی جستجو میں کُنجی کو تلاش کیا۔ ظاہر ہے کہ کُنجی دستیاب نہ ہوئی تو بڑی شتابی سے اس کنڈے کو ہی توڑ دیا جس میں تالا لٹکا ہوا تھا۔ اگر میری یادداشت غلط نہیں تو وہ صندوق غالباً پچھلے بیس برس سے میری ملکیت میں شامل نہ تھا اور انقلابِ روزگار نے جب مجھے اسے تلاش کرنے کا موقع دیا تو وہ نہ جانے کیسے اپنی جگہ سے ادھر اُدھر ہو گیا اس کے بعد پھر میں بھی جیسے اسے بھول ہی گیا۔ یہ تو مجھے یاد تھا کہ صندوق میں کوئی ایسی چیز تو نہ تھی جس کی مجھے شدید جستجو ہو۔ پھر بھی صندوق کھلنے پر میں نے بڑے انہماک کے سے اسکی تلاشی لی تو میری توقع کے مطابق مختلف نوعیت کے کاغذات کے کچھ پلندوں اور لکھنے کے چند قلموں کے سوا اس میں کچھ خاص نہ تھا، ہاں دو چار ایسے خطوط بھی تھے جو میرے وطن چھوڑنے کے بعد میرے باپ نے شروع شروع میں مجھے لکھے تھے جس میں سے ایک پر ۱۹ر ربیع الاول ۱۲۳۵ھ کی تاریخ درج تھی۔ ممکن ہے وہ دھندلی لکھی ہوئی تاریخ میری بوڑھی آنکھوں نے غلط پڑھی ہو لیکن مجھے اتنا تو خوب ہی یاد ہے کہ بغیر کسی شک وشبہ کے وہ بادشاہِ اودھ حضرت نصیرالدین حیدر کی تاجپوشی کے بعد کا زمانہ تھا۔ صندوق کے دیگر چھوٹے متفرق سامان میں ایک سُرمہ دانی تھی جو اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے اپنی خالہ بڑی خانم کے لئے خریدی تھی۔ نیچے کے تہہ خانے میں ایک رومال خاکِ شفاء کے ایک ڈلے کے ساتھ تہہ کیا ہوا بھی نکلا جو حج اکبر سے واپسی پر منشی شباہت علی اصفہانی (مرحوم) نے تبرکاً مجھے دیا تھا۔ کاغذات میں چھوٹے پلندے تو بس یونہی سے تھے لیکن ایک ذرا موٹا پلندہ جو دبیز رنگین کاغذ کے گردپوش کے ساتھ قرینے سے کاغذوں کو برابر کر کے باندھا گیا تھا اُس نے میری توجہ فوری طور پر اپنی طرف کھینچ لی، میں نے پلندے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس کے صفحات پر بکھری ہوئی عبارت کو پڑھنے کی کوشش میں کھو گیا۔ چند ہی سطروں کو ادھر اُدھر سے پڑھنے کے بعد میری پچھلی یادوں کے ٹھہرے ہوئے دریا میں جیسے اُبال سا آ گیا کچھ خوشی اور کچھ حیرت کے عالم میں مجھے یاد آیا کہ دراصل وہ تحریر

میری زندگی کی اُس حقیقی سرگزشت کو قلم بند کرنے کی ایک کوشش تھی۔ جس کا خیال میرے دل میں ہوش سنبھالنے کے بعد آیا تھا وہ بھی بیشتر طور پر میری خالہ بڑی خانم کی زندگی کے المیہ کے حوالے سے جنھوں نے میری ماں کے سائے سے مجھے محروم پا کر، ماں سے زیادہ محبت دیکر پالا پوسا اور میری تربیت کی تھی۔ اُس دور کے واقعات جو قلم بند شکل میں صندوق سے نکلے اور جن کے تحریر کئے جانے کی تحریک بڑی خانم تھیں لیکن آگے چل کر انھوں نے کچھ اور ہی شکل اختیار کرلی وہ حادثات اور واقعات بیس سال کے عرصے کے بعد دوبارہ تحریری شکل میں میری آنکھوں کے سامنے ان لفظوں میں موجود تھے۔

(۲)

جب میں نے اپنے باپ کے کھیتوں کی کھڑی فصل کے اوپر سے گھوڑوں، ہاتھیوں، بیل گاڑیوں اور پالکیوں پر سوار سلطنت کے حاکموں، فوج کے سپاہیوں، غلاموں، پیش خدمتوں اور لونڈیوں کو شاہ کی سواری کے ساتھ شکار گاہ کی جانب خیمہ زن ہونے کے لئے گزرتے دیکھا تب میں اٹھارہ برس کا تھا۔ کچی عمر کی اُن آنکھوں نے دیکھا کہ آن کی آن میں انسانوں کا ایک دریا جو سیلاب کے مانند دار السلطنت کی سمت سے لگاتار امنڈتا چلا آرہا تھا اور ہمارے کھیت کی روندی گئی فصل کبھی سر نہ اُٹھانے کے لئے زمین پر لیٹ چکی تھی اور میرا باپ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے دہلیز پر بیٹھا فصل کو مسمار ہوتے آنسوؤں سے بھیگی داڑھی کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور شاہی جلوس کی جانب سے ڈھولوں، تاشوں اور نقاروں کی دھما دھم گھر کی کچی دیوروں کو پھاند کر صحن میں کھڑی خوفزدہ عورتوں کے دلوں کو دہلا رہی تھی۔ انھیں عورتوں میں میری خالہ بڑی خانم بھی تھی۔ اگر میں اپنی ماں سے محروم تھا تو بڑی خانم اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی شوہر کی محبت اور قربت سے محروم تھیں، خاندان کی عورتوں کا کہنا تھا کہ شروع سے ہی خالو کا بڑی خانم سے دل نہ ملا حالانکہ وہ ناک نقشے کے اعتبار سے قبول صورتوں میں شمار تو ہوتی ہی تھیں، تندرست بھی خوب تھیں، ایک ہاتھ سے موسل چلا کر پکی پسیری دھان آرام سے کوٹ لیتی تھیں۔ مگر عجیب اجاڑ قسمت لیکر دنیا میں آئی تھیں کیونکہ مشہور تھا کہ ایک نوخیز اور چنچل لونڈیا نے جس کے چہرے پر غضب کا نمک تھا اور جوانی لباس کو مسکا کر پھٹی پڑتی تھی

خالو کا دل اپنی زلف گرہ گیر میں ایسا اٹکا کہ خالو ساری سُدھ بُدھ بھول کر اسی کے ہو رہے، خاندان کے لوگ منھ سے تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن جانتے تھے کہ بڑی خانم اپنی زندگی کی وہ بازی ہمیشہ کے لئے ہار چکی ہیں، کیونکہ وہ لڑکی جس کا بستی میں دور دور تک چرچا تھا اور باپ جس کا حضرت کی سواری کے ہاتھی کا فیلوان تھا میرے چھ فٹے خالو بہرام خان کو جس کا کام شیروں کو اپنے اشاروں پر چلانا تھا اپنی چولی کے تکمے میں ایسا باندھے ہوئے تھی کہ لاکھ کھینچا تانی کے باوجود تکمہ ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ لیکن میری خالہ بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی عورت تھی، اسے لاکھ سمجھایا گیا کہ منصفی میں عرضی لگائے، وزارت عظمیٰ میں فریاد کرے، حضرت کی سواری کے سامنے آہ و بکا کرے لیکن بڑی خانم ٹس سے مس نہ ہوئیں، شوہر کو اس کے حال پر چھوڑ کر اس کی سلامتی کے لئے چپکے چپکے مصلے پر دعائیں مانگتی رہیں۔ جب خبر آئی کہ بہرام خان کو شیر نے پنجہ مار دیا ہے۔ زخم نہیں بھر رہا تو سر کے بال کھول کر حیران پریشان گرتی پڑتی بہرائچ پہنچیں اور بہرائچ سے سورج کنڈ جہاں حضرت سالار مسعود غازی شہید ہوئے تھے اور بالے میاں سے اپنے شوہر کی سلامتی کی دعا کی۔ تین دن تک ایک نیم کے پیڑ کے نیچے صرف پانی پی پی کر وظیفے پڑھتی رہیں آخری رات خواب میں دیکھا کہ کوئی تلوار پیڑ کی شاخ سے لٹکی ہوئی ہے اس سے خون ٹپک رہا ہے کہ اتنے میں ایک آواز آئی کہ بی بی جاؤ تمہاری مراد بر آئی ہے۔ واپس گھر آئیں چند روز بعد لکھنؤ سے خبر آئی کہ بہرام خان ٹھیک ٹھاک ہیں۔

میں نے تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن میری بڑی بہن کا کہنا تھا کہ جس رات ہمارے کھیتوں پر حضرت کے لشکر کا قہر ٹوٹا اس کہر آلود جاڑے کی رات میں جلوس میں چل رہے شاہی خدمت گاروں کی صف سے پندرہ سولہ برس کے ایک لڑکے نے ایک ٹٹو کی پیٹھ پر نکل کر بڑی خانم کے کمرے کی پرانی کھڑکی کے بند پٹوں پر جو کھیتوں کی جانب کھلتے تھے چوروں کی طرح دستک دی تھی اور خالہ اس دستک کو پہچان کر دیوانہ وار اپنی سیاہ چھینٹ کی دلائی میں بدن لپیٹ کر اور گھر سے باہر نکل اندھیری رات میں کھڑکی کی طرف بھاگی تھیں اور ٹٹو پر سوار اس کمسن لڑکے کو جو کمر میں کٹار باندھے کھڑا تھا اپنی چھاتی سے لگا کر خوب بلائیں لی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے صافے میں لپٹا اس کا سر پکڑ کر بوسوں کی بوچھار بھی کر دی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ہی

مجھے اس لڑکے کی پوری حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ دراصل میرا خالہ زاد بھائی تھا، نام یوسف خاں اور پانچ برس کی عمر میں ہی باپ کی زورزبردستی کے سبب بڑی خانم کی آغوش سے چھینا جا چکا تھا اور بے کس عورت کی چھاتی پر سوت بٹھانے والے بے رحم شوہر کی نگرانی میں پچھلے کئی برسوں سے دارالخلافہ میں حضرت کی غلام ڈیوڑھی میں پل رہا تھا۔ لیکن بیٹا جیسے جیسے بڑا ہوتا جارہا تھا اس کے دل میں ماں کی محبت بڑھتی جارہی تھی اور باپ کی ناپسندیدگی کے باوجود ہر سال کسی نہ کسی بہانے دو تین بار شہر سے چلا آتا اور ماں کو اپنا چہرہ دکھا کر اس کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا کرتا تھا اور اب جبکہ بیٹے کے مضبوط ہاتھ پیر نکل آئے تھے اور ماں کے بارے میں وہ بہرام خاں سے کبھی کبھی تیوریوں پر بل ڈال کر الٹے سیدھے سوالات کرنے لگا تھا اور اپنی ماں کے ہونٹوں سے کھوئی گئی مسکراہٹوں کو واپس لانے کے لئے عاملوں اور فقیروں کے اڈوں پر جا کر چپکے چپکے گنڈے تعویز لانے لگا تھا تو سخت دل باپ نے بھی ماں بیٹے کے معاملات کے درمیان دخل اندازی کم کر دی تھی لیکن اس کہر آلود رات کھڑکی کی دیوار کے نیچے دارالامارت سے آئے میرے خالہ زاد بھائی یوسف خاں نے اپنی ماں کی چھاتی سے لگتے وقت اس کے کان میں جانے کونسا ایسا مژدہ سنایا کہ ماں خوشی اور حیرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بیٹے سے لپٹ کر رونے لگی یہاں تک کہ اپنے کمرے میں ماتھے پر دوپٹہ باندھ کر جو وہ اکثر سر درد کی حالت میں کرتی تھی چارپائی پر لیٹ کر روتی رہی اور کسی سے اس کا سبب لاکھ پوچھنے پر بھی نہ بتایا۔

میں نے اپنی ماں یعنی بڑی خانم کی چھوٹی بہن کو بالے پن میں ہی کھو دیا تھا مجھے اتنا یاد ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اچھی خاصی تندرست اور چاق و چوبند تھی اور اس نے میرے لئے ماش کی کھچڑی پکائی تھی اور مٹی کی چھوٹی سی رکابی میں پھیلا دی تھی تاکہ اس کی بھاپ نکل جائے، اس کھچڑی پر اس نے اپنے ہاتھ سے نکالا ہوا تازہ تازہ مکھن کا ایک موٹا سا لوندہ رکھ دیا تھا اور میرے ہر کھانے کی چیز میں اس مکھن کی آمیزش ضرور کرتی تھی میری عادت تھی کہ کچی انگنائی میں جاڑوں کی سوندھی سوندھی دھوپ میں مرغیوں کے ڈربے کے پاس اناج کی خالی بوریوں پر کھانے کی رکابی لے جاتا اور زمین پر بچھی انھیں بوریوں پر بیٹھ کر کھاتا اور ایک بڑی کلغی کے مردمار مرغے کو ستایا کرتا، بہرحال اس دن کھچڑی کا پہلا نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ماں کے کمرے سے اس کے زور

سے کراہنے کی آواز آئی، باپ کا کہنا تھا کہ درد سے ماں کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ جب میں کمرے میں اندر گیا تو ماں پھٹے دیدوں سے مجھے برابر گھورے جا رہی تھیں۔ آخر کو میرے باپ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں موند دیا۔ جب میری تربیت بڑی خانم کی تحویل میں ہونے لگی تو وہ روز باداموں اور منقوں کی چٹنی بنا کر مجھے چٹاتی اس کا خیال تھا کہ ایک شاہ جی کی پیشین گوئی کے مطابق میرے ہاتھ میں خوب علم تھا جس کے لئے مضبوط دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل اس کی محبت کے جذبات کتنے ہی دھندلے کیوں نہ رہے ہوں وہ ہمیشہ میری پہچان میں آجاتے تھے، جب وہ میرے بدن پر مالش کرتی، نہلاتی، کپڑے پہناتی، کنگھی کرتی، کاجل لگاتی اور پھر ایک پھانس بھی چبھ جانے پر تلملا اُٹھتی اور مصلے پر تسبیح کے دانے سر جھکائے گھمانے لگتی تو میں نظریں چرا کر اسے انہماک سے دیکھتا رہتا۔

جب سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ بڑی خانم اکثر بستر پر جاگ کر چپکے چپکے اپنے آنسو دوپٹے سے پوچھتی رہتی تھیں تب سے مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کا سبب شوہر کی فرقت اور بیٹے کی جدائی کے علاوہ کچھ نہیں یہ سوچ کر کہ وہ اس مسلسل غم کو چھاتی پر رکھے کسی وزنی پتھر کی طرح دن رات ڈھو رہی تھیں اور اپنی نامراد زندگی کی کسک کے ساتھ ہر موسم میں بے ماں کے ایک بیٹے کی نگہداشت کے فرائض ادا کر رہی تھیں میرے دل میں ان کی محبت اور وقعت اور بڑھ گئی۔ ایک بات جو بار بار مجھے محسوس ہو رہی تھی کہ میری تعلیم کی تکمیل میں جتنی دلچسپی بڑی خانم کو تھی میرے باپ کو نہ تھی وہ جب بھی مجھے پڑھنے لکھنے سے جان چراتے دیکھتی تو غصے سے کہتی۔

''دیکھ۔ میں یوسف کو تعلیم نہ دلوا سکی، اگر تو بھی کودن نکل گیا تو قبر میں میری پیٹھ نہ لگے گی'' میری تعلیم میں کسی موسم میں رخنہ نہ پڑے اس کے لئے وہ پالکی کے کہاروں کو کبھی گڑ، کبھی باجرہ اور کبھی چنا سوغات میں دیتیں، دیوالی میں نئے جوڑے بنواتیں۔ عربی فارسی علم الاخلاق کے ساتھ ساتھ ریاضی میں مہارت حاصل کرنے کے لئے درس گاہ اور مولویوں کی ڈیوڑھیوں تک ایک دریا اور دو نالے کئی بار بڑی خانم نے میرا ہاتھ پکڑ کر پار کرائے تھے ناؤ کے مانجھی کا کہنا تھا کہ دریا میں گھڑیال بھی تھا۔ کئی بار میرے دل نے مجھ سے کہا کہ میں بلند آواز میں انھیں ماں کہہ کر پکاروں لیکن زبان پر خالہ ایسا چڑھا تھا کہ اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔

بڑی خانم نے جس رات اپنے بیٹے یوسف سے کمرے کی کھڑکی کے نیچے ملاقات کی تھی سچ تو یہ ہے کہ اس کی ویران زندگی میں بھی بس اچانک ہی اورانجانے میں ہی یکا یک ایک ہلکا سا جھونکا بھی آ گیا تھا، یہ جھونکا اس لئے نہ تھا کہ ان کا بیٹا ان سے ملنے آیا تھا، بیٹا تو دو چار مہینے میں ایک بار مل ہی لیتا تھا اصل ماجرا تو یہ تھا کہ اس رات یوسف نے اپنی ماں کو شاہی رمنہ کے کنارے قیام کررہے لشکر میں بلایا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ شاہی جلوس کے قیام کے دوران شکاری درندوں کے کٹہروں سے ملحق جہاں بازاور شکروں وغیرہ کا قوش خانہ بنایا جاتا تھا اور جن کے دائیں بائیں جانوروں پر ملازم محافظین کے خیمے نصب کئے جاتے تھے وہیں اپنے ساتھ اپنی ماں کو بھی کچھ دن رکھ کر ان کی قربت حاصل کرسکے اوراس کام کے لئے داروغہ کا اجازت نامہ نائب داروغہ کو رشوت دیکر حاصل کر چکا تھا۔ اس رات کے واقعہ کے بعد آگے کے واقعات میرے لئے کیوں اس قدر غیر معمولی ہو گئے اوران کے کس قدر دیرپا اثرات مجھ پر مرتسم ہوئے اور یہ کہ جنگل میں منگل منانے والا شاہی لشکر جس کو قسمت سے دیکھنے کا مجھے موقعہ ملا وہاں قیام کی ایک ہوش رُبا رات میں کس طرح ایک گل بدن اور شعلہ نوامغنیہ نے جوانی کی دہلیز پر میرا پہلا قدم رکھتے ہی میرے دن کا چین اور راتوں کی نیند چھین لی تھی یہ داستان تو میں بعد میں بتاؤں گا۔

البتہ پہلے یہ بتا تا چلوں کہ میرے خالہ زاد بھائی یوسف کی اس تجویز کو کہ اس کی ماں لشکر میں یوسف کے پڑاؤ کے موقع پر دو چار روز کے لئے اس کے پاس چل کر رہے بڑی خانم نے قبول نہ کیا لیکن جب یوسف نے انھیں بتایا کہ اس کے شوہر بہرام خاں کے برتاؤ میں اب بہت تبدیلی آ گئی ہے اور جس طرح بہرام خاں پہلے یوسف کی ماں کا ذکر بھی برداشت نہ کر پاتا تھا اب وہ حالات نہیں رہ گئے ہیں اور بیٹے کا ماں کو جنگل کے خیمے میں بلا کر دور چار روز مہمان رکھنے کی تجویز پر بہرام خاں نے نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ کوئی احتجاج بلکہ گول مول لفظوں میں یہ کہا ہے کہ یوسف کی ماں اوّل تو آئے گی ہی نہیں اور اگر آ گئی تو دو چار گھنٹے سے زیادہ رکے گی نہیں، بہر حال اگر وہ شکارگاہ کے خیمے پر آجاتی ہے تو اچھا ہوگا کہ خالی ہاتھ نہ آئے بلکہ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی تعریفی رساول اور سنتروں کے چھلکوں میں پکایا ہوا زردہ سوغات کے طور پر نائب داروغہ کے لئے لیتی آئے جو راشی تو ہے ہی ساتھ میں اوّل نمبر کا چغل خور بھی ہے۔ بیٹے

کی زبانی یہ پیغام سن کر یوسف کی ماں کے دل میں کچھ دیر کے لئے پھلجھڑیاں سی چھوٹیں اس لئے کہ پیغام پر پڑے پردے کا اندازہ اس عورت سے زیادہ کون کر سکتا تھا جو جانتی تھی کہ تعریفی رساول اور سنتروں کے چھلکوں میں پکا ہوا زردہ اُس کے شوہر کی پرانی کمزوری تھی لیکن پھر اس خوشی کے دوسرے ہی لمحے ویرانیاں بھری تنہائیوں کے طویل ماہ اور سالوں کے اداس دن اور خاموش راتوں کے سلسلوں کی مہیب پر چھائیاں جسے اس پر ایک بار پھر مسلط ہو گئیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں، وہ بھلانا چاہتے ہوئے بھی ان غموں کو بھلا نہ پائی جو اس کی زندگی نے جھیلے تھے جیسے تیسے اس نے رات گزاری لیکن جب صبح ہوئی اور وہ نماز کے لئے مصلے پر بیٹھی اور سلام پھیر کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو ماما تا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دل کو اولاد کی طرف جھکا ہوا پایا پھر تو جب وہ اپنے خیالوں میں سفر کر کے جنگل کے خیمے میں اپنے بیٹے کے پاس تخیل کی دنیا میں پہنچی تو اسے اپنی ازدواجی زندگی میں شوہر کے ہاتھوں بخشے ہوئے داغ نہیں دکھائی دے رہے تھے بلکہ جوانی میں قدم رکھتے ہی بیٹے کا چاند سا چہرہ دکھائی دے رہا تھا جو اس کے قریب ہی سو رہا تھا اور وہ سرہانے بیٹھی اسکے ماتھے پر بکھرے بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہی تھی۔

کھڑکی پر سے یوسف کی واپسی کے بعد بڑی خانم نے رات کیسے گزاری یہ تو میں نہیں بتا سکتا، البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ اگلے دو روز تک مسلسل میں نے اس عورت کے اعضا میں نہ تو ایسی پھرتی اور تیزی دیکھی تھی اور نہ آنکھوں میں ایسی چمک، یہی نہیں اس کی آواز میں بھی ایک غیر مانوس سی شیرینی اور کھنک کا احساس کر کے میں چونک پڑا تھا۔

پھر یہ دیکھ کر تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ وہ اپنی تیاری کے ساتھ ساتھ میرے کپڑوں اور ساز و سامان کی تیاری بھی کر رہی تھی میرے معاملات میں وہ اب اس قدر خود مختار بن چکی تھی کہ شاید میری ماں اگر زندہ ہوتی تو وہ بھی نہ بن پاتی کیونکہ میرا باپ بھی میرے معاملات میں اپنی مرضی بڑی خانم پر تھوپ کر اس کا دل میلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس طرح برسوں پہلے ہی میرا باپ میرے مسائل سے سبکدوش ہو چکا تھا بلکہ اس کو تو اس بات سے بھی کوئی سروکار نہ رہ گیا تھا کہ فنِ سپہ گری میں مہارت کے لئے میرے واسطے کس کی خدمات حاصل کی جائیں اور کون

سے اسلحے کون اچھے بنا رہا ہے یہ سارے کام بھی بڑی خانم کی حسن تدبیر پر ہی چھوڑ دیئے گئے تھے۔ میں تو بڑی خانم کی بے جگری کا اس وقت اور قائل ہو گیا جب سپہ گری کی تربیت کے دوران وہ ہر ہفتے میرے زخموں کا شمار کرتی اور مجھے ایک مشاق تلوار باز اور گھڑ سوار بنانے کی اپنی دلی تمنا ظاہر کرتی جن راتوں میں اس نے خوابوں میں ایک نورانی خنگ سوار کو دیکھنا شروع کیا وہ میرے لئے ایک نیا خنگ خریدنے کے لئے بے چین ہو گئی اور جب تک مجھے اس لاجواب مچلتے بدن والے سفید گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا نہ دیا اس کو چین نہ پڑا۔

شاہی رمنہ کو دیکھنے کے لئے جو سفر میں نے باوقار اور مردانہ ہمت والی ماں کی بڑی ہمشیرہ کی سواری کے آگے آگے گھوڑے کی پیٹھ پر سپاہانہ شان کے ساتھ حضرت کے لشکر کے پڑاؤ تک کیا تھا وہ میری زندگی کا یادگار سفر بن گیا تھا۔ ہمارے قصبے سے دو کوس مشرق کی طرف چل کر ہریالی اپنا رنگ دکھانے لگتی تھی، جو راستہ بڑی جھیل کی جانب جاتا تھا ادھر مزروعہ آراضی بھی جگہ جگہ ملتی تھی اور جنگل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی انھیں کے درمیان جلدی میں تیار کیا جا رہا وہ کچا راستہ بھی تھا جو نواب کے حکم سے قرب وجوار کے دیہاتوں کے مرد عورتوں اور بچوں سے کہیں تو حقیر اجرت کے بدلے اور کہیں زور زبردستی اس وقت تیار کروایا جا رہا تھا تاکہ واپسی کے سفر میں بادشاہ امراء اور بیگمات کو آرام مل سکے۔ جب ہم پڑاؤ کی سرحدوں میں داخل ہوئے تو آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ شفق کی سرخیاں دور سے نظر آ رہی جھیل کے سطح آب پر اپنا نرم و گداز سایہ کئے تھیں اور جنگل کے سبز پتوں پر بکھری ہوئی سنہری افشاں کی چمک دمک اور رونق کا چل چلاؤ تھا، کچھ دور آگے بڑھے تو دیکھا بادشاہ کا محافظ دستہ مغرق نیلگوں وردی میں سجا قبلہ رو باجماعت نماز مغرب کے لئے صف بستہ ہو رہا تھا۔

بڑی خانم کی ان کے بیٹے سے اس لاؤ لشکر کی بھیڑ بھاڑ میں ملاقات کیسے ہو گی اس کی مجھے فکر تو تھی لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پہلی ہی چوکی پر یوسف ہم لوگوں کے استقبال کے لئے داروغہ کا پروانہ لئے موجود تھا۔ میرے لئے بہت کہا سنی کے بعد اور کچھ مٹھیاں گرم کرنے کے بعد صرف دو روز کے قیام کا موقعہ دیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر کوئی زیادہ معلومات مجھ سے کرے تو کہہ دوں کی علاج معالجے کے لئے نائب داروغہ کو جڑی بوٹیاں پہنچانے گاؤں سے آیا

ہوں ۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس پڑاؤ کے موقع پر حضرت خاص محل صاحبہ کے ایک خانہ زاد غلام کی مہربانی سے اپنے دو روزہ قیام میں اعلیٰ حضرت کے رمنہ کی تھوڑی سی سیر میں نے بھی کرلی تھی، وہاں جتنے چمچماتے ہوئے قرمزی، زعفرانی اور کاسنی رنگ کے گھوڑے میں نے دیکھے وہ زندگی میں نہ دیکھے تھے، ایسا ہی حال ایک باڑے میں بند بھیڑوں کا تھا جو قوس وقزح کے رنگ میں رنگی ہوئی تھیں، جب میں نے سنا کہ ان جانوروں کی کھالوں کو رنگنے کا فن حضرت جنت مکانی آصف الدولہ کے زمانے سے چل رہا تھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی ۔ میں نے اس شکار گاہ میں جتنے قوی ہیکل اور تندرست ہاتھی دیکھے ، جتنے خوفناک تیندوے دیکھے، چیتل پاڑھے اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے پائے وہ میرے لئے خواب وخیال ہوکر رہ گیا ہے، گینڈے، دریائی گھوڑے، گھڑیال، انواع واقسام کی خوبصورت ایرانی بلّیاں، شیر چیتے اور چینی کتے اس دولت مدار میں موجود تھے جن کی شان اور ہیبت سے دل لرز جاتا تھا۔

پہلے ہی دن میں نے خوش نصیبی سے بادشاہ کے فرنگی مہمانوں کو بادشاہ کے پالتو شکاری بارہ سنگھے کے ذریعہ شکار کھیلتے ہوئے دیکھا۔ بارہ سنگھا ایک جنگلی ہرن کو دوڑا کر زیر کر چکا تھا اور ہرن کے زخموں سے نڈھال بدن اور موت کے انتظار میں پھٹی پھٹی بے بس آنکھیں دیر تک میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی تھیں۔

بعض صاف کئے گئے قطعوں میں امراء اور شاہی مہمانوں کی دلبستگی کے لئے بھاری بھاری شمع دانوں کی روشنی میں رقص وموسیقی اور دیگر سامانِ نشاط موجود تھا، محافظ خانے کے داروغہ کے پنڈال میں جہاں مجھ جیسے معمولی فرد کا گزر ممکن تھا قدرت نے میرے ہوش وحواس اور دل ودماغ کے لٹ جانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں پندرہ سولہ برس کی ایک ڈومنی کچھ ایسی بجلیاں گرا رہی تھی کہ میرے قدم ادھر اُٹھتے ہی چلے گئے۔ خود اپنے آپے کے بارے میں مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ گھریلو تقریبات کے موقعہ پر زنان خانے میں جمع ہونے والی جوان لڑکیاں پرانی قناتوں کے سوراخوں میں انگلیاں ڈال کر جھانکتے وقت مجھے بار بار دیکھنے میں دلچسپی لینے لگی تھیں اور مجھے یہ باور کرانے کے لئے کہ ان کے ذریعے میں قنات کی اوٹ سے دیکھا جارہا ہوں وہ آپس میں زور زور سے چہل کرتیں اور شاید بے وجہ نرم نرم سی خوش صدا

کھنکھناہٹوں والی ہنسی کے فوارے چھوڑتیں، تب تک میں عمر کے اٹھارویں سال میں آچکا تھا اور سب کا کہنا تھا کہ میں نے خوب ہاتھ پیر نکالے تھے ویسے بھی مجھے اپنے بالوں کا گھونگھر سینے کی کشادگی اور قد کی لمبائی اپنے باپ سے ملی تھی اور سرخ وسپید رنگ اپنی والدہ سے۔ داروغہ کے پنڈال میں قدم رکھتے ہی میری نظریں اس ماہ پارہ سے جیسے ہی چار ہوئیں میرے قدم من من بھر کے ہو گئے، میں جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

پورے بدن میں ایک ایسی سنسنی سی دوڑ گئی کہ اس کے اثر سے چھاتی کا زیر و بم تیز ہو گیا اور میں منھ کھولے اس قامتِ رعنا کے جلال و جمال کو دیکھتا رہ گیا جو خود بھی اپنی سدھ بودھ کھوئے رقص میں ادا کئے جانے والے بھاؤ کو بھول کر مجھے یوں دیکھ رہی تھی کہ خدام کے مجمع کی گردنیں میری طرف گھوم گئیں۔ دو پل بعد سرد موسم میں بھی میرے ماتھے پر آجانے والی پسینے کی بوندوں کو ہوا کے جھونکوں نے ٹھنڈا کیا اور پاس ہی کہیں کھلی رات کی رانی نے اور بار بار اُٹھنے والی طبلے کی گمک نے اور شمع دانوں پر نثار ہوتے پتنگوں نے مجھے ہوشیار کر دیا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا، اِدھر اس ماہ لقا نے بھی خود کو سنبھالا اور ایسا ناچی اور گائی اور مجمع سے خوب خوب انعام پایا اور تماش بینوں کو ایسے دلبرانہ انداز دکھائے کہ مارے جلن کے میرے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گیا۔ جیسے جیسے جنگل کی رات بھیگتی گئی میری نوخیز جوانی کا پہلا والہانہ اور اندھا عشق اپنے بھڑکتے ہوئے بے قابو شعلوں سے میرے جسم اور جان کو جلاتا رہا۔ ادھر وہ بھی خوب جان گئی تھی کہ اس کا تیرِ نظر میرے کلیجے کے پار ہو چکا ہے۔ جب محفل برخاست ہوئی اور وہ جانِ آرزو سب سے چھپا کر میری جانب ادائے دلبری سے مسکرا کر اور سلامِ رخصت کا نذرانہ کمالِ محبوبی سے پھینک کر جانے لگی تو مجھ میں خدا جانے کہاں سے وہ حوصلہ اور ہمت پیدا ہو گئی کہ اس کے خیمے تک جانے والی نیم تاریک ڈگر پر کچھ دور چل کر میں اس کی راہ میں آ گیا۔ وہ ٹھٹکی اور میرے ارادے کو سمجھنا چاہ ہی رہی تھی کہ میں نے اپنی طلائی انگوٹھی اس کی چاندی جیسی ہتھیلی پر رکھ دی اور اس کے کان میں پھسپھسایا۔

''تمہارے خیمے کے پیچھے کھڑے رہ کر رات کاٹونگا، دو گھڑی کو آجانا بدلے میں چاہے میری جان لے لینا۔''

''چلو ہٹو بھی'' وہ جواب میں چپکے سے بولی اور شرارت سے نچلا ہونٹ دبا کر ہوا کے ایک نشیلے جھونکے کی طرح بدن چراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ لیکن میں تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا جنگل کا ڈر نہ پہریداروں کا کھٹکا نہ خالہ کا خوف، جیسے ہی آس پاس سناٹا ہوا اور جھینگروں کا شور اور سیا روں کی آوازیں ابھریں تو میں نے بیقراری میں یہ بھی نہ دیکھا کہ کون جاگتا ہے اور کون سوتا دل میں رفع حاجت کا بہانہ رکھ چپکے سے چھولداری کا پردہ ہٹایا اور باہر کے اوبڑ کھابڑ راستے پر قدم ڈال دیئے۔ اس حسینہ کے لباس کی خوشبو جو میرے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی مجھے اس کے خیمے کی جانب کشاں کشاں لئے جا رہی تھی تھوڑا چلنے کے بعد میں اس خیمے تک پہنچا جس کے باہر آگ روشن تھی اور خیمے کے دروازے کے سیاہ پردے پر ایک چھوٹا سا سفید کپڑا لٹک رہا تھا جس پر زعفران کی روشنائی سے آیۃ الکرسی لکھی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر میں ٹھٹھکا اور آہستہ سے کھنکھارا، میری کھنکھار کے جواب میں آگ کے قریب ہی زمین پر لیٹا اور گدڑی میں لپٹا ایک جسم بھی کھکھارا، آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عمر رسیدہ ملازم ہے جو چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا ہے مجھے خیال آیا کہ جس طرح بوڑھے لوگ کم کھاتے ہیں ویسے ہی وہ کم سوتے بھی ہیں جس سے بات بگڑ سکتی ہے، لیکن اس وقت میرے دل کی کیفیت ایسی تھی کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور میں ہر مزاحمت کے مقابلے کے لئے بلا سوچے سمجھے تیار ہو چکا تھا کہ جیسے بھی ہو گا اس نازک اندام کو سینہ سے لگا کر، دل میں دہکتی آگ کو ٹھنڈا کروں گا۔

میں خیمے سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی میں ٹھیک سے قدم بھی نہ جما پایا تھا کہ میرے پیروں کے اوپر سے سرسراتی ہوئی کوئی شئے گزر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سانپ تھا تب مجھے اس خطرے کا پہلی بار احساس ہوا اس وقت میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنے ساتھ مشعل بھی نہ رکھ سکتا تھا، میں بغیر جنبش کئے اس درخت کے پیچھے کتنی دیر کھڑا خود کو مچھروں سے کٹواتا رہا جن سے جنگلوں کے جانور بھی پناہ مانگتے تھے نہیں بتا سکتا۔ ایک پہر گزرنے کے بعد یکایک مجھے اندھیرے میں اس قتالہ کے خیمے کی جانب سے ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی۔ زمین پر پڑے سوکھے پتے چرمرائے تو میں نے اپنی آنکھوں کو اندھیرے میں اس آہٹ کی طرف گڑو دیا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا کہ ایک سایہ اندھیرے میں ڈولتا نظر

آیا۔ میں درخت کی آڑ سے نکلا اور سائے کی جانب لپکا قریب آتے ہی میں نے اندزہ کرلیا کہ وہ عورت ہے پھر تو پلک جھپکتے ہی اس کی کلائی میں نے پکڑی اور اپنی طرف کھینچا مگر آنے والے نے مزاحمت کی اور گھبرائی سی بولی

''حضور میں لونڈی ہوں مالکن نے مجھے بھیجا ہے''

''کون مالکن؟''

''ان کا نام نظیرن ہے، آپ کو سلام کہا ہے اور گھر آنے کی دعوت دی ہے''

''گھر؟ میں نے سوال کیا''

''جی ہاں۔لکھنؤ۔للّومل سرّاف کی ڈیوڑھی کے پیچھے امداد حسین کی سرائے کی بالائی منزل پر۔

پھر وہ جلدی سے الٹے پیروں واپس ہوتے ہوئے بولی۔

''مکان کی چھت پر کھپریل پڑی ہے'' قریب تھا کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی کہ میں نے اسے جالیا۔

''خدا کے لئے ان سے کہو کہ آدھی گھڑی کو تمہارے ساتھ ہی آجائیں۔''

''نہیں۔۔'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے ''لونڈی قربان، بہت خطرہ ہے'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندھیرے میں غروب ہوگئی۔ میں بجھے دل سے چل کر اپنے خیمے تک ناچار آگیا، ابھی اندر جانے کو میرا قدم بڑھا ہی تھا کہ خیمے کے پہلو سے کوئی نکل کر سامنے وارد ہوا، میرا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پلک جھپکتے ہی پہنچ گیا لیکن پھر میری اوپر کی سانس اوپر رہ گئی، اندھیرے میں کوئی رازداری کے ساتھ اپنا چہرہ میرے قریب لایا اور دبی آواز میں بولا۔

ان گھرانوں میں بعض مرد لٹیرے اور قاتل بھی ہوتے ہیں، جب تک لشکر یہاں سے کوچ کرے گا جنگل میں دو تین لاشیں گاڑی جا چکی ہونگی جن کا پتہ تب چلے گا جب کتے اور بھیڑیئے ان پر سے مٹی ہٹائیں گے'' اندھیرے میں وارد ہونے والا کوئی اور نہیں میرا خالہ زاد بھائی یوسف تھا جس نے غالباً مجھے خیمے سے باہر جاتے ہی نہیں بلکہ لونڈی سے باتیں کرتے بھی دیکھ لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد یوسف کچھ نہ بولا اور خیمے کے اندر جا کر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ صبح ہوئی تو اس نے کسی طور بھی یہ ظاہر نہ کیا کہ رات اس نے کچھ دیکھا تھا لیکن خجالت کے مارے

سارے دن میری نظریں جھکی رہیں اور میں خود کو کوستا رہا۔ اس کے بعد میرے جذبۂ عشق پر کیا گزری اس کا بیان کئے بغیر میں بھلا کیسے رہ سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے اس شاہی رمنہ میں اپنے خالو بہرام خاں کے کردار کو جس طرح مجھے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا اور اس کی کیفیت نے جس قدر میرے دل اور دماغ پر اثر کیا اور میری روح کو بہت دنوں تک بے چین اور بے آرام رکھا اس کا بیان تو میرے عشق کی واردات سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

دراصل قصہ یہ تھا کہ فلک کج رفتار کے ہاتھوں اس زمانے میں کمپنی کے انگریز حاکموں کا بول بالا تھا اور بادشاہ اُنھیں میں سے ایک کو لاؤ لشکر کے ساتھ اپنی شکار گاہ پر اُس کی دلجوئی کے لئے لیکر آیا تھا اور جس کی تفریح کے مشاغل میں جنگلی جانوروں کی لڑائی بھی شامل تھی جس میں شیر کو لڑانے میں میرے خالو بہرام خاں کو مہارت حاصل تھی لہٰذا اُس حیثیت سے وہاں پہلی بار بہرام خاں کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے کلّے، رعب دار مونچھیں جسم میں اتر جانے والی تیز نوکیلی آنکھیں اور آواز میں بھاری گرجدار گونج جو حلق سے نہیں غالباً سیدھی پیٹ سے نکلتی تھی اور پہلی ملاقات میں جی دار سے جی دار مرد کو سہم جانے کے لئے مجبور کر دیتی تھی قدرت نے شاید انھیں وہ بھاری آواز اس لئے عطا کی تھی کہ ان کے پیشے کے لئے بھی اس کی ضرورت تھی لیکن شکار گاہ میں قیام کے دوران میں نے بہرام خاں کی زندگی کو پوری طرح تو پڑھا نہیں لیکن ان کے کردار کے چند ازدواجی پہلو جس طرح میرے سامنے آئے وہ میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔

وہ جنگل میں میرے قیام کا آخری دن تھا جب میں نے بہرام خاں کو اُس جانور کے کٹہرے کے پاس کچھ زیادہ ہی مشغول پایا جس کی مکمل دیکھ ریکھ اُن کے ذمہ تھی۔ وہ ایک شاندار چیتا تھا جس کو صبح ہونے پر تیاری کے بعد کٹہرے سے نکال کر اور زنجیر گلے میں باندھ کر بہرام خاں کو اپنے ساتھ شکار گاہ کے جنگل میں لے جانا تھا۔ اس چیتے کے بدن کی دھاریوں میں نرالی چمک اور اس کے ہاؤ بھاؤ میں نمایاں ہیبت نا کی تھی۔ آنکھوں میں درندگی کا جلال ایسا تھا کہ عام آدمی کو اس سے نظریں ملانا دشوار تھا۔ بہرام نے چیتے کو رات سے ہی بھوکا رکھا تھا۔ جب جنگل میں درندے کے ساتھ روانگی ڈالنے کا حکم آیا تو سورج طلوع ہونے کو تھا۔ بہرام نے

جب چیتے کو باہر نکالا تو اس کے ساتھ اس کا بیٹا یوسف بھی ضروری ساز و سامان کے ساتھ باپ کے پہلو میں موجود تھا۔ افسوس کہ جنگل کے اندر کچھ دور اپنے خالو کے ساتھ جانے کے بعد مجھے اس کے خیمے پر واپس آنا پڑا کیونکہ رمنہ میں بادشاہ کی موجودگی کی صورت میں اس حد کے آگے صرف رمنہ کا شاہی عملہ، شاہی محلات اور مہمانوں کو ہی جانے کی اجازت تھی اس لئے شکار کے وقت جنگل میں اس چیتے کو لیکر بہرام خاں کے ساتھ کیا گزری اس کا احوال جب مجھے اُن کے بیٹے کی زبانی معلوم ہوا جو غریب اپنے باپ کا مددگار بن کر ان کے ساتھ گیا تھا اور جس کے ہاتھ میں چیتے کی زنجیر تھی تو میری یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس واقعے پر رنج کیا جائے یا نہیں لیکن جب مجھے یوسف نے اصل معاملے کی اہمیت سمجھائی اور اسی کے ساتھ میں نے بہرام خاں کے چہرے کا رنگ بھی اُڑا ہوا پایا اور اس کو اس طرح رنجیدہ اور تھکا ہوا دیکھا جیسے وہ اپنی کوئی قیمتی شے ہار گیا ہو تو مجھے اپنے خالو کی اس حالت پر بڑا افسوس ہوا۔ مجھے یوسف نے بتایا کہ دراصل جنگل میں شکار کے موقع پر رُستم نامی اس چیتے نے جو کچھ اور جس طرح اس کو سکھایا گیا تھا کئی بار اُن احکامات کی صاف اور ڈھٹائی کے ساتھ حکم عدولی کی تھی اور اس پر آخری غضب تو یہ ہوا کہ رُستم نے فرنگی مہمانوں کی موجودگی میں بڑی تگ و دو اور جانفشانی کے بعد دوڑا کر جس بارہ سنگھے کو شکار کر کے زیر کیا تھا اسے حسب دستور بادشاہ کی سواری پہنچنے پر بہرام کے بار بار مطالبے کے باوجود رُستم نے شکار کو اپنی گرفت سے آزاد کر کے جوں کا توں بہرام کے سپرد نہ کیا بلکہ غیظ اور غضب کا اظہار کرنے کے بعد بارہ سنگھے کی شہ رگ پھاڑ کر خون پینے بیٹھ گیا اور بہرام کی ہدایتوں کو نظر انداز ہی نہیں کرتا رہا بلکہ ردعمل میں شدید طور پر غراتا رہا۔ کسی بھی شکار کے موقع پر رُستم نے شکار کے جانور کو لیکر ایسی بدنیتی نہ دکھائی تھی جو اس وقت اس سے سرزد ہوئی تھی، وہ ہمیشہ محافظ کا حکم ملتے ہی شکار کو ویسا ہی چھوڑ کر الگ ہٹ جاتا تھا اور تماشہ دیکھنے والے ایک بھوکے درندے کی فرماں برداری دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے اور جانور کا محافظ شاہ سے انعام و اکرام پاتا تھا۔ آخر کو درندے کی حکم عدولی پر بہرام خاں کو طیش آ گیا اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑی دلیری کے ساتھ حضرت کی سواری کے گھوڑے کے سامنے ہی رُستم پر سوار ہو کر اس کے گلے میں زنجیر ڈالی اور پورے تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کھینچتا ہوا اور نوکیلے نیزے

کی انی سے کونچتا ہوا کٹہرے کے اندر لے گیا۔ اس وقت بہرام کی آنکھیں اور گلے سے نکلنے والی آواز کسی زخمی شیر کی غضب ناکی کا مظاہرہ کر رہی تھیں جس نے رستم کے ارادوں کو پسپا کر کے رکھ دیا تھا۔

شام کو جب پہیوں پر کسا رُستم کا کٹہرا جنگل سے گھسیٹ کر اپنے ٹھکانے پر رکھا گیا تو پورے ماحول میں سناٹا تھا، بہرام خاں کا چہرہ تو جیسے دھواں دھواں ہو رہا تھا گویا اس کے گھر میں کوئی موت ہو گئی ہو صاف لگ رہا تھا کہ ادھیڑ عمر کا بہرام اندر ہی اندر کسی زبردست پیچ و تاب میں مبتلا تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر نہیں اُٹھ رہی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے پالے پوسے جانور جس کے کھانے، پینے سونے جاگنے اور بیماری دکھی میں اس نے اپنی اولاد سے بھی زیادہ خدمت کی تھی، اس کے ہاتھوں بہرام کی یوں ذلّت ہونا وہ بھی شاہ کے حضور میں اس پر بہت شاق گزر رہی تھی۔ وہ رات دیر تک منہ سے کچھ بولے بغیر رُستم کے کٹہرے کے پاس کھڑا اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسکے سینے میں آگ دہک رہی تھی اور وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

جب جنگل میں قیام کی ہماری آخری رات آئی تو مجھ سے اور بڑی خانم سے وہ رات اس خیمے کے فرش پر گزارنے کو کہا گیا جس میں بہرام کا وہ ساز و سامان بھرا تھا جو جانوروں کو سدھانے اور سکھانے وغیرہ کے لئے کام میں لایا جاتا تھا۔ بانس کی چھڑوں پر لگے نیزے جن سے نافرمانی کے موقع پر جانور کے جسم کو چھیدا جایا کرتا تھا، نمک کے گول مٹول ڈلے جو چھڑوں کے آخری سرے پر بندھے ہوتے تھے اور جنگل میں پھیلی بو باس کے سبب چیتے کے بے قابو ہو جانے پر اسے رام کرنے کے لئے وہ گولے چٹائے جاتے تھے۔ جانوروں کے راتب میں ملایا جانے والا وہ سامان جو انھیں شکار کے دوران کھلائی جانے والی خوراک میں شامل کر کے دیا جاتا تھا تا کہ جانور کی بھوک اور زیادہ کھل سکے، لوہے کی زنجیریں، مشعلیں، جانوروں کے استعمال میں آنے والے برتن، دوائیں جڑی بوٹیاں، لوہے کی ٹوپیاں، جنگل میں استعمال ہونے والے جوتے کپڑے اور چھوٹے اوزار وغیرہ اس خیمے میں گودام کی طرح ادھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ اس چھوٹے سے مال گودام کے باہر ایک نیپالی کتا بھی بندھا ہوا تھا جو بہرام خاں کی موجودگی میں سارا وقت غضب کے انہماک کے ساتھ ان کی نظریں دیکھتا رہتا تھا اور

اپنے آقا کے بدن کی ہر جنبش اور آواز کے زیر و بم کے معنی اور مطلب سے خوب واقف تھا۔

پہلے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ خالو نے مجھے اور بڑی خانم کو اُس چھولداری میں سونے کو کیوں کہا لیکن بعد میں جو کچھ ہوا اس سے یہ صاف ہو گیا کہ بہرام خاں اپنی بیوی سے رازداری کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع نکالنا چاہتے تھے کیونکہ اس چھولداری میں جن باتوں کو میرے کانوں نے سنا جو میرے خالو نے مومی شمع کی روشنی کو بجھا کر اپنی بیوی سے کی تھیں تو اُن سنی ہوئی باتوں نے میرے دل میں اپنے خالو کے لئے جس احترام کے جذبے کو جگایا وہ ان کی زندگی تک کبھی میرے دل سے کم نہ ہو سکا۔ میں پچھلی رات کا جاگا ہوا تھا اس لئے گھوڑے کی زین سرہانے رکھ کر گہری نیند سو گیا تھا لیکن سوتے میں اچانک نہ جانے کس آہٹ یا آواز یا میری چھٹی حس نے یا پھر کسی موٹے تازے مچھر کے ڈنک کی جلن نے مجھے جگا دیا تو ایک جانی پہچانی رُعب دار آواز میرے کانوں میں ٹکرائی، وہ میرے خالو بہرام خاں کی آواز تھی جو کہہ رہے تھے۔

''یہ کام جو آج میں کر رہا ہوں، تمہارے باپ نے ہی میرے گلے باندھا تھا، بنے خاں اُستاد کے پاس انھوں نے ہی مجھے بھیجا تھا، کہا تھا اس کو چیتے پر لگاؤ ایسی تربیت دو کہ یہ خود چیتا بن جائے اور میں چیتا بن گیا۔ میرے بدن سے چیتے کی مہک آنے لگی، غصے میں اسی طرح غرّانے لگا، کھانے پر دانتوں سے گوشت یوں نوچ کر کھانے لگا جیسے چیتا کھاتا ہے۔ تم سے شادی تمہارے باپ کی زبردستی سے ہوئی، میری ماں سے انھوں نے کہا تھا کہ بہرام اگر میرا داماد بن گیا تو اس کو ایسی نوکری دلواؤں گا جو اسے بادشاہ کی نظر میں رکھے گی۔ اتنی بخششیں اور انعامات لایا کرے گا کہ گھر کے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ جب میں نے تم سے شادی کر لی تو تمہارے باپ نے اس کے بدلے میں چاند گنج میں جانوروں کی لڑائیوں کے بندوبست پر پہلے ہی دن مجھے لگوا دیا۔ جب یوسف تمہارے پیٹ میں آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ تم ایک نرم سی نازک سی ہرنی ہو اور تمہارے باپ سے ایک بہت بڑی بھول ہو گئی ہے کہ اس نے ایک ہرنی کو شیر کے آگے ڈال دیا ہے، بنے خاں استاد مجھے شیر تو بنا چکا تھا لیکن تم کو ہرنی سے شیر کیسے بناتا، میں جب بستر پر تمہارے بدن کو دانتوں سے نوچتا تو تم مجھے جنگلی کہتی تھیں مجھ سے خود کو چھڑانے

میں بے دم ہو کر ہانپتی ہوئی خوف کی حالت میں تم آنگن میں آجاتی تھیں، شور مچا کر سب کو جگا دینے کی دھمکی دیتی تھیں پھر میں تمہارے ہاتھ پیر چارپائی پر باندھنے کی کوشش کرتا، تم دھینگا مُشتی کرتیں، چارپائی الٹ جاتی، گھر میں زلزلہ سا آجاتا، تم رو رو کر آنکھیں سُجا لیتیں ہر بار چوڑیاں پہنانے والی تمھیں کلائی بھر بھر کر چوڑیاں پہناتی اور ہر بار وہ اس لپاڈگی میں کمرے سے آنگن تک کرچوں میں بکھر جایا کرتیں۔ پھر تم اس جگہ قدم رکھنا بند کر دیتیں جہاں میں بیٹھا ہوتا کیونکہ تمہارے نتھنوں میں جانور کی بو محسوس ہوتی اور تم ابکائیاں لینے لگتیں، تمہارا کھایا پیا سب باہر نکل جاتا پھر تم نے میرے کپڑے تک دھونے سے انکار کر دیا، بدن پر مالش کرنا تو دور نہاتے میں میری پیٹھ تم سے نہ ملی جاتی۔ میں تم سے کہتا تھا گوشت کی ہانڈی نہ تو زیادہ بھونا کرو اور نہ گوشت کو زیادہ گلایا کرو تو اس کے جواب میں تم نے گوشت کھانا ہی چھوڑ دیا، دال چٹنی پر بسر کرنے لگیں۔ کیا تم نے کبھی ایمان بھرے دل سے یہ سوچا کہ میں نے جاڑا گرمی برسات ہمیشہ تمہارے خرچ پانی کا خیال کیوں رکھا، یوسف کو پالنے پوسنے کے لئے کھیت جائیداد خرید وا کر تمھیں کیوں دی۔ بیماری دکھی میں تمہاری خبر گیری میں نے نہ کی ہو ایسا تم نہیں کہہ سکتیں اس لئے کہ مجھے خدا کے گھر جانا ہے مجھے بھی کیا پتہ تھا کہ رمنہ کے شکاری اور لڑاکو درندوں کو اشاروں پر چلانے کے لئے آدمی کا دل دماغ کلیجہ اور پھیپھڑے سب درندہ ہو جاتے ہیں، تمہیں یقین نہ ہو تو کچھ دن اپنی سوت کے ساتھ رہ کر دیکھو، اللہ کا شکر ہے کہ وہ بانجھ ہے نہیں تو اس کی غضب ناک طبیعت اور وحشی مزاج سے کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ بچہ جننے کے بعد اپنے بچے کو ہی چبا جاتی۔ جانتی ہو وہ حرام زادی کیا کہتی ہے؟ کہتی ہے تیرے مردار چیتے نے جس کی ناز برداریاں تو کیا کرتا ہے اگر کسی دن مجھے بیوہ کر دیا تو میں شیروں کے کٹہروں میں آگ لگا دونگی اور تیرے داروغہ کی کوٹھی کے پھاٹک پر بھوکے چیتوں کے کٹہرے لگا کر انکا منھ کھول کر چیتوں کو کوٹھی کے آنگن میں ہنکا دونگی اور انھیں داروغہ کے بچوں کا خون اپنی آنکھوں سے پیتے ہوئے دیکھونگی اور ان کے لوتھڑے قدسیہ محل کی سیڑھیوں پر اس وقت ڈال آؤنگی جب حضرت کی سواری وہاں سے نکل کر دربار میں جانے کو ہوگی"۔

اتنی باتیں کر کے کچھ دیر کے لئے میرا خالو بہرام خاں اداس ہو گیا تھا کیونکہ اس کی آواز

بھرا گئی تھی جیسے وہ آگے بولنے کے لئے اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کی کوشش کررہا ہو ایک بار تو خاموشی توڑ کر وہ دھیرے سے پھسپھسایا۔

''کتنے برس ہو گئے۔۔؟ بیٹا جوان ہو رہا ہے، تمہاری گود سے اس لئے چھین لایا تھا کہ اولاد کے جسم کی گرمی کو چھاتی سے لگا کر دل کو وہ ٹھنڈک پہنچاؤں گا جو انسان کو آدمی بنائے رکھتی ہے!''

یہ کہہ کر بہرام خاں جذبات سے مغلوب ہو کر یکا یک بڑی خانم کے پیروں پر گر پڑا۔ میری خالہ ہچکیوں کے ساتھ اپنے شوہر کو منع کرتی رہی کہ اپنا سر اس کے پیروں پر رکھ کر خدا کے حضور میں اسے گناہ گار نہ کرے۔ پھر بہرام نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا بیٹا باپ کے پیشے کو اپنائے اور اس کی خواہش ہے کہ یوسف کا دل اب اس کی ماں کی جانب بڑھے اس لئے وہ یوسف کو ٹھیل ٹھیل کر اس کی ماں سے ملنے بھیجتا رہتا ہے تا کہ وہ ماں کو بھول نہ پائے۔ ان باتوں کے بعد پھر رات کے اس اندھیرے میں گودام کے اس خیمے کے اندر کچھ دیر کے لئے آوازوں کا سلسلہ بند ہو گیا، تھوڑی دیر بعد بہرام خاں نے ایک مشعل جلائی ایک کونے کی زمین سے مٹی ہٹائی اس کے گڑھے سے تانبے کی ایک منہ بند گگری نکالی اور اس کو جھاڑ پونچھ کر اپنی بیوی کی گود میں رکھ دی اور کہا

''بزرگوں سے رائے لیکر یوسف کو کسی کاروبار سے لگانے کی کوشش کرنا، اس کی شادی بیاہ تمہارے ہاتھ سے ہونا ہے جو بھی جمع کیا ہے تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔''

''نہیں۔۔۔'' خالہ یہ سن کر جیسے اچھل پڑیں اور گگری سے الگ جا کھڑی ہو گئیں جیسے اس میں سانپ بچھو بھرے ہوں، بہرام خاں پہلے تو دو پل چپ رہا پھر خیمے کا پردہ اُٹھا کر اور ادھر اُدھر جھانک کر کچھ دیکھنے کے بعد واپس آیا اور رازداری کے ساتھ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''تو نہیں جانتی کہ بادشاہ کی آنکھوں کے نیچے رہنے والے ملازموں کی جان ہمیشہ سولی پر ٹنگی رہتی ہے۔ میں تو شکاری چیتے کی دیکھ بھال کرنے والا ایک غریب کارندہ ہوں بڑے بڑے امیر و وزیر دن رات اس خوف میں کانپتے رہتے ہیں کہ کب بادشاہ کی نظریں پلٹتی ہیں اور کب وہ کوڑی کے تین کر دیئے جاتے ہیں۔ جانوروں کی لڑائی کے تماشے میں آج جو بہرام خاں اپنی فتح مندی کی وجہ سے رمنہ کے داروغہ کی ناک کا بال بنا ہوا ہے اگر اپنی کسی غلطی سے

بادشاہ کی اردب میں آجائے تو وہی داروغہ اپنے بچاؤ کے لئے ایک کے بجائے دس بہراموں کو بھی اپنے اوپر سے قربان کردینے میں دریغ نہ کرے گا۔ بڑے بڑے منصب دار بادشاہ کے عتاب سے پل بھر میں مچھر کی طرح مسل دیئے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے امیرزادوں کو جو محتاجوں کو شیرمال اور باقرخانی لٹاتے تھے بادشاہ کے عتاب سے ایک رات میں، رات کی باسی روٹی کا محتاج ہوتے دیکھا ہے۔

پھر میرے خالو نے تانبے کا وہ گگرا میرے گھوڑے کے دانے کے بورے کو آدھا خالی کرنے کے بعد اس بورے میں رکھا اور اس کے اوپر سے خالی کیا ہوا دانا پھر بھر کر بورے کا منھ سی دیا اور اپنی بیوی کو سمجھایا کہ اگر اسکی گاڑھی کمائی اس کے پاس رہے گی تو کبھی بھی اس سے جلنے والے اس کے کسی ہم پیشہ کی سازش کی بناء پر حکومت کے قزاق سپاہیوں کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کا حصہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ حق وانصاف کا وہاں کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ غریب غرباء پر جو کچھ گزرتی ہے اسے خدا ہی جانتا ہے، سرائے اور یتیم خانوں کے شاہی خزانے سے تنخواہ پانے والے نچلے درجے کے چھوٹے ملازموں کو اکثر بھیک مانگنی پڑتی ہے، بات بات پر دیوانی کے اہلکار غریبوں کے گھروں پر قرقی بھیج کر تنکا تنکا بٹور لیتے ہیں جس حاکم کو اس کے گھر سے مال اسباب ضبط کرتے وقت اشرفیوں سے بھرا وہ گگرا ملے گا اس کا کتنا حصہ شاہی خزانے میں جمع ہوگا یہ تو خدا بھی نہیں جانتا۔ پھر بہرام نے بیوی کو سمجھایا کہ وہ رقم اس کی بیوی کی ہی امانت ہے پھر اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور عاجزی سے بولا۔

''خدا کی نظر میں میں تمہارا مجرم ہوں، انکار کر کے اب اور زیادہ مجھے گنہ گار نہ بناؤ'' پھر بہرام خاں نے اپنی بیوی کے درمیان کا فاصلہ ایک قدم آگے بڑھ کر کم کیا دو پل اسے بے بسی کے ساتھ دیکھا، مجھے لگا جیسے میرا خالو پورا کا پورا پگھل سا گیا ہے اس کے پورے جسم کی زبان جیسے بدل گئی تھی، کندھے اندر کی طرف دھنس گئے تھے، اکڑی ہوئی گردن ایک نیازمندی کے ساتھ جھک گئی تھی، وہ دھیرے سے زمین پر گھٹنے ٹیک کر اس چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا جس پر اس کی بیوی بیٹھی تھی اور دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ ایسے موسلا دھار آنسو خدا جانے اس نے کہاں چھپا رکھے تھے۔ خالو کے دونوں ہاتھ خالہ کے ایک گھٹنے کے بالکل پاس ہی

رکھے تھے اور وہ جیسے خالہ سے نہیں بلکہ خود سے کہہ رہے تھے۔

''میں تیرے بدن کو چھو کر تجھے ناپاک نہیں کرونگا۔ میں تجھے یہ بھی نہیں بتاؤں گا کہ اب بار بار میرا دل کیوں مجھ سے کہا کرتا ہے کہ تیرے ساتھ کی گئی برائیوں کی غیبی سزا مجھے ملنے والی ہے، میں بھی سزا سے بھاگنا نہیں چاہتا اس کا راستہ تک رہا ہوں جس طرح تو برسوں سونے سُونے سے اکیلے پن میں کڑھی ہے شاید ایک دن اس سے بھی برا کچھ میرے ساتھ ہونے والا ہے، سنا ہے اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ یہ کہہ کر بہرام خاں نے بجھتی ہوئی مشعل سے تازی مشعل جلائی خیمے کی ملگجی روشنی صاف ہوگئی۔ پھر اس نے اپنی دوسری بیوی کا ذکر چھیڑ دیا۔ میرے لئے بہرام خاں کے منھ سے اس عورت کا ذکر بالکل نیا تھا۔ میں کان کھڑے کر کے سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا'' وہ جو حلیمن ہے، تیری سوت، وہ اتنی مردمار نکلے گی میں نے جوانی کے نشے میں سوچا بھی نہ تھا تب وہ مجھے اپنی اداؤں سے ایک ٹانگ پر بھی کھڑا رکھتی تھی تو بھی مجھے اچھا لگتا تھا۔ پہلے تو وہ افیون کی چسکی کی طرح دھیرے دھیرے رک رک کر اپنے نشیلے پن کو اور اپنے جادو کو میرے اندر اتارتی رہی اور جب وہ پیار کے اندھے دروازے کے راستے سے میرے بدن میں اتنا گہرا اتر گئی کہ اس کے بغیر میرا بدن ہی ٹوٹنے لگتا سر بھاری ہونے لگتا پھر تو اس نے ایسا چولا بدلنا شروع کر دیا کہ میں حیران رہ گیا، اب اگر میں جیسا وہ چاہتی ویسا نہیں کرتا تو وہ غصے میں اتنی بے شرم ہو جاتی ہے کہ مجھ سے چار چوٹ کی لڑائی میں یہ دیکھے بغیر کہ کون کھڑا ہے اور کون نہیں پاگلوں کی طرح اپنا لہنگا اُٹھا کر سر پر رکھ لیتی ہے، وہ اُس فیل وان کی بیٹی ہے جس کے ہاتھی کو آٹھ ہزار قیمت دیکر بادشاہ نے خریدا تھا۔ اور جو اس کی سواری کے داہنی طرف چلتا ہے اور جس پر سے بادشاہ کی سلامتی کے لئے صدقے کے سکے غریبوں کو نچھاور کئے جاتے ہیں اور راہگیروں کے ہاتھوں بادشاہ کو دی گئی تحریری فریادیں سنبھال کر رکھی جاتی ہیں۔ اس ہاتھی کے لئے کئی تولہ چاندی سونے کے ورق اور پستے باداموں کے ساتھ پکایا گیا پنج سیری کا روٹ چرا چرا کر بازار کے نان بائیوں کو یہ عورت بیچتی ہے اور سونے کے ٹھوس زیور بنوا کر مجھے یوں آنکھیں دکھاتی ہے جیسے میں اس کا زرخرید غلام ہوں۔ میں روزے نماز سے دور بھاگتا تھا لیکن اب کوئی نماز نہیں چھوٹتی۔ اس عورت نے مجھے ڈرپوک بنا دیا ہے، میرا اپنے اوپر جو بھروسہ تھا وہ سب جانے کیسے چھین لیا ہے اس نے مجھ سے پہلے جس طرح میری نظریں بلم

کی طرح جانور کی کھال پر چبھتی تھیں اور میری آواز اس کے بدن پر کوڑے جیسی پڑتی تھی اب کئی بار دیکھ چکا ہوں کہ ویسا نہیں ہوتا، پہلے جانور خوف اور مروّت کے خیال سے مجھ پر غصہ دکھاتے وقت اپنے جانور پن کو تھوڑا بہت چھپانے کا جتن کیا کرتا تھا وہ اب نہیں کرتا، لکڑی کے کٹہرے کے پٹروں کو اب وہ اس طرح مجھے دکھا دکھا کر چباتا اور غراتا ہے جیسے کہ کہہ رہا ہو اس کے دل میں اب میرا پہلا سا ڈر نہیں ہے، طاقت کا پہلا کام ہی دوسروں کے دل میں اپنا ڈر پیدا کرنا ہے۔ اب وہ اس ڈر کو چاٹ جاتا ہے، پہلے ایسا نہیں تھا وہ اپنی ایک غلطی پر آدھے آدھے دن گردن ڈالے سُست پڑا رہتا تھا۔ دوسری طرف تمہاری سوت ہے وہ ہتھنی جس کی جوتیاں سیدھی کرتے کرتے میں نے اپنی لٹیا ڈبو لی۔ جیسے جیسے میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں ویسے ویسے وہ عورت بدمست ہتھنی کی طرح زور پشت ہوتی جا رہی ہے، اس کو اب نہ میری کمائی پوری پڑ رہی ہے اور نہ شاید میری مردانگی اس لئے کبھی بھی کوئی انہونی ہو سکتی ہے۔ گنڈاسے سے اس عورت کا سر کبھی بھی کاٹ کر اور سر کو خوان میں رکھ کر اور بانات کی گوٹ لگے سرخ خوان پوش سے ڈھک کر اس کے باپ کو بھیج دینا میرے لئے آسان ہے مگر اس میں کچھ دوسری مشکلیں بھی ہیں جو ابھی نہیں سمجھائی جا سکتیں لیکن آنے والا کل کس نے دیکھا ہے اس لئے آج کی رات اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے تجھ سے ہاتھ جوڑ کر اپنی اگلی پچھلی ساری غلطیوں کی معافی مانگتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے اپنا سر پلنگ کی پٹی پر رکھ دیا، میں نے دیکھا بڑی خانم نے اپنا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے شوہر کے کندھے پر جا ٹکایا، دو پل اس کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں پھر بہرام خاں اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

رمنہ کی یادوں پر دھیرے دھیرے وقت کی دُھول جمنے کو ہی تھی کہ میری زندگی نے ایک نیا موڑ لیکر مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا شکار گاہ کے قیام میں عشق کا پہلا تیر جو میں نے کھایا تھا قدرت نے اس تیر کے زخم کو ہرا رکھنے کی ایک سبیل ایسی نکالی کہ میرے شب و روز ہی بدل گئے۔ ہوا یہ کہ ایک بار ہمارے قصبے کی راہ سے اونٹ گاڑیوں سے گزرنے والے ایک طائفے کے چھوٹے سے کارواں نے رات کے لئے قیام کیا تو ایک اجنبی گھڑ سوار نے آ کر مجھے پیغام دیا کہ کوئی پردہ دار خاتون لکھنؤ سے میرے لئے خفیہ طور پر کوئی خاص پیغام لائی ہیں اور مجھ سے بدھو سرائے میں بعد نماز مغرب ملنا چاہتی ہیں۔ یہ سن کر میرے دل میں پنکھے لگ گئے، عالم

حیرت اور پس و پیش کی کیفیات میں جب ملاقات کے لئے سرائے پہنچا تو یہ راز کھلا کہ رمنہ کی اس قیامت کی رات میں میرے دل کو گھائل کر جانے والا مجھ سے زیادہ خود زخمی تھا اور شکار گاہ کے اس جنگل کو چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنے ذرائع سے چپکے چپکے میری بود و باش اور ٹھور ٹھکانے کا حال احوال معلوم کر لیا تھا اور پیغام لیکر آنے والا گھڑ سوار کوئی اور نہیں اُسی نظیرن کا ہی ملازم تھا جس نے رات کے اندھیرے میں خادمہ کو بھیج کر لکھنؤ میں مجھے اپنے گھر کے پتے سے آگاہ کیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی وہ اس وقت ٹیکہ چھپکا گلوبند سے آراستہ تھی، ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ، بڑی ادا سے اس نے مجھے پان کی گلوری اور عطر پیش کیا، میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا، اس کی دانتوں کی مِسّی آنکھوں کا کاجل چہرے کا غازہ اور زلفوں کے پیچوں میں ابھی میں کھویا ہوا تھا کہ وہ مخاطب ہوئی۔

''آپ کس خاندان کے چشم و چراغ ہیں ہم جانتے ہیں۔ آپ کی علمی حیثیت بھی ہم کو معلوم ہو چکی ہے اور ہم نے یہ بھی پتہ لگا لیا ہے کہ آپ عزت دنیا اور نجات عقبیٰ کے لئے علمِ طب حاصل کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں'' اس کی یہ باتیں سن کر میں حیرت میں پڑ گیا پوچھ ہی لیا کہ آخر میرے بارے میں اتنی باتیں اسے کیسے معلوم تو وہ مسکرائی اور دھیرے سے شرارت سے بولی ''کیوں بتائیں''

میں نے دیکھا اس کی ایک انگلی میں وہی طلائی انگوٹھی موجود تھی جو میں نے شکار گاہ کے قیام کی رات اس کی ہتھیلی پر رکھی تھی۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں کیا دیکھ رہا تھا اس لئے جلدی سے اپنے سیدھے ہاتھ کی چاندی جیسی ہتھیلی کھولی جس کی انگلی میں وہ میری دی ہوئی انگوٹھی پہنے تھی اور ہاتھ کو ادا سے میری طرف بڑھا کر بولی ''اپنا ہاتھ یہاں رکھئے'' میں نے تکلف کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بناوٹی جھنجلاہٹ دکھا کر بولی ''رکھئے نا'' آخر میں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اس نے اپنی گرفت میں میری ہتھیلی لے لی اور بڑے لگاؤ سے سیدھے میری آنکھوں میں دیکھ کر مخاطب ہوئی۔

''میں سمجھ گئی تھی کہ اگر مجھے آپ کو پانا ہے تو ساری کوشش مجھے ہی کرنی ہوگی ایک برہمن نے مجھے بتایا ہے کہ میرے نصیب میں معشوق بننا نہیں عاشق بننا لکھا ہے اگر آپ ہمت

نہ ہارے تو میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کو لکھنؤ میں آپ کی منزل مراد تک پہنچا کر دم لونگی جس کے عیوض آپ کے دیدار کے علاوہ میں اپنے مقدر سے کچھ اور کبھی نہ مانگونگی،'' پھر اُس نے بتایا کہ سپاہ شاہی کے سالار راجہ بختاور سنگھ کے محلوں میں اس کی بڑی بہن مجرے کے لئے اکثر بلائی جاتی ہے، نظیرن نے بالا ہی بالا اپنی اسی بہن کی معرفت مجھے کسی خدمت پر لگانے کے لئے ایک درخواست راجہ صاحب کو پہنچائی تھی اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ نظیرن نے اپنی کوششوں سے راجہ صاحب کے حضور میں میری طلبی کا پروانہ بھی حاصل کرلیا تھا اس دعوت نامے کی رو سے دیوالی کے دوسرے دن مجھے راجہ صاحب کے دربار میں پیش ہونا تھا۔ کسی شہر میں ایک محفل نشاط سجانے کے واسطے جاتے ہوئے نظیرن نے مجھے یہ مژدہ سنانے کے لئے میرے قصبے میں قیام کیا تھا اور مجھے اپنا قاصد بھیج کر بلایا تھا۔

نظیرن مجھ سے مل کر اور راجہ صاحب کے حضور میں مقررہ دن اور وقت پر حاضر ہونے کی قسمیں اور وعدے لیکر بدھو سرائے سے اپنی منزل کی جانب کوچ کر کے کسی خوبصورت خواب کے مانند اوجھل ہوگئی۔ بزرگوں کی وہ بات کہ انسان کو روزی پانے کے لئے حیلہ اور مرنے کے لئے بہانہ درکار ہوتا ہے مجھے سچ نظر آرہی تھی۔ دیوالی میں ابھی چند روز باقی تھے، دوسرے دن سویرے ہی میں نے اپنے باپ کو ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بتایا کہ میں حکمت کا علم حاصل کرنے کے لئے لکھنؤ جا کر اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں۔ تو میرے باپ نے تشویش کے ساتھ بہت سے سوالات کر ڈالے۔ جن کے جواب میں انھیں اتنا تو سمجھانا ہی پڑا کہ میری لیاقت چھوٹی جگہ پڑے رہ کر کوئی صلہ دینے والی نہیں ہے اور آگے کی ترقی کا دارومدار اب وطن چھوڑنے پر ہی منحصر ہے اور خوش قسمتی سے میری درخواست کے جواب میں مجھے بادشاہ کے جنزل صاحب سے ملاقات کا ایک موقع بھی مل رہا ہے تو باپ نے لکھنؤ جانے کی اجازت دے دی۔

جب میری چاہنے والی خالہ کو معلوم ہوا کہ میں نے لکھنؤ کے سفر کی ٹھانی ہے تو وہ اندر ہی اندر میری جدائی کے خیال سے ہی غمگین ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا یوسف میں ہی ہوں اور مجھ سے بچھڑنے کا غم اس عمر میں اسکو بہت ہوگا جب اس نے سفر کی تیاری کرتے ہوئے مجھے پایا تو اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے ایک ایسی بات کہی کہ میرا کلیجہ ہل گیا۔ پہلے تو اس نے پوچھا کہ

وہ میری کون ہے؟ میں نے جواب دیا، ماں، تو اس نے کہا کہ میں اپنی ماں سے ایک وعدہ کروں، میں نے پوچھا، کونسا وعدہ، تو بولی ''شہر جا کر یا تو یوسف کو میرے پاس بھیجنا ہوگا یا پھر اپنے خالو کو'' میں نے حیران ہو کر اپنی خالہ کی آنکھوں میں دیکھا جس میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔ وہ اب ضبط نہ کر سکی جس باندھ کو وہ جانے کب سے روکے ہوئے تھی وہ ٹوٹ گیا اور وہ پاگلوں کی طرح سانس توڑے بغیر وحشت بھری آواز میں بولتی ہی چلی گئی۔

''اگر تو چاہتا ہے کہ میں زندہ رہوں تو یہ وعدہ تو تجھ کو کرنا ہی ہوگا ورنہ میں تجھے ایک پل اکیلا نہ رہنے دونگی تو جہاں رہے گا میں بھی رہ لونگی کیونکہ اب کوّے بکنی بن کر میں گھر میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔''

اپنی بد نصیب خالہ کی آہ وزاری نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا، وہ باتیں یاد آئیں جو میں نے شکار گاہ کے خیمے میں بہرام خاں کو کہتے سنی تھیں۔ ان باتوں میں کئی خطرے پوشیدہ تھے، شاید میری خالہ کی آنکھوں کے سامنے وہ بھیانک انہونی اور اس کا خوف بھی رہا ہوگا جس کا امکان بہرام خاں کی باتوں نے پیدا کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ جیسا کچھ بڑی خانم چاہتی ہے ویسا کرنے کے لئے مجھے لکھنؤ جا کر اپنی سی کوشش کرنا ہی چاہئے۔ مجھے یہ تو مشکل نظر آرہا تھا کہ میں بڑی خانم کے شوہر بہرام خاں کو ان کے قدموں پر لے آؤں گا لیکن مجھے یہ امید ضرور بندھی کہ شاید میں یوسف کی زندگی اس کے باپ کی خواہش کے مطابق نئے سانچے میں ڈھال سکنے میں کوئی مدد کر سکوں۔ بہر حال مقررہ وقت پر میں اپنے دل میں مستقبل کے دھندلے خواب لئے اپنی غیر یقینی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

(۳)

جب میں اودھ کے اس شہرۂ آفاق دار السلطنت میں داخل ہوا جو شاہی محلات کی بے مثال شان و شوکت سے منور تھا تو وہ دیوالی کا دن تھا اور تین لاکھ کی آبادی کا وہ شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا اور جگہ جگہ لکشمی اور گنیش جی کی پوجا ہو رہی تھی اور عورتیں نہائی دھوئی اور خوشنما لباسوں کے ساتھ گھروں کے آنگن میں رنگ برنگے چاولوں سے خوبصورت نقش و نگار بنا رہی تھیں جس کو مقامی لوگ، ''چوک پورنا'' کہتے تھے لیکن جب میں امداد حسین کی سرائے کا پتہ پوچھتے شہر

کے گلی کوچوں سے گزرا اور طمنچے کی جوڑی کمر میں باندھے ہوئے بڑے بڑے گل مچھوں پر بل دیکر اکڑتے ہوئے کوچہ گرد سپاہیوں کے مضبوط بازوؤں سے ٹکراتا ہوا اس شاہراہ پر پہنچا جس پر بادشاہ کی خاص محل کی سواری کا جلوس دیوالی کی سیر کے لئے چلنے کو تھا تو رنگین وردیوں میں سجے سنورے قادر اندازوں کے بانکے ترچھے سینہ سپر گھوڑے نقرئی زیوروں سے لدے پھندے قوی ہیکل ہاتھی، قطار اندر رفتار فینسیں، پالکیاں ہوادار اور زرق برق ڈولیاں اور ان کی زنانی آرائش دیکھ کر لگا جیسے چہار جانب باغ کھلا ہوا ہے۔ سیٹھوں ساہوکاروں کی بڑی بڑی عمارتیں، نقرئی مشعلوں، مومی شمعوں، پنج شاخوں، قندیلوں، ہانڈیوں اور ہزاروں چراغوں کی جھل مل سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں ابھی میں اس چکا چوندھ کو منھ پھاڑے دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے بلند آواز میں ایک نعرہ سا لگا کر مجھے اچھال دیا۔

"لادے۔۔۔۔" اب جو میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی ڈھیلے ڈھالے چوغے میں ایک سبز پوش زلف دراز گلے میں کوڑیوں اور پتھروں کی مالا سر پر چوگوشیا ٹوپی لمبی داڑھی سرخ جلالی آنکھیں ہٹا کٹا فقیر ہاتھ میں کاسہ لئے میرے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے بڑھے ہوئے دست سوال کو دیکھ کر میں نے اس کے کاسہ میں ایک سکہ ڈال دیا۔ اس نے تیوریوں پر بل ڈال کر چٹکی سے وہ سکہ اُٹھایا، غور سے دیکھا مسکرایا پھر اپنا چہرہ قریب لا کر بڑی بڑی آنکھوں سے گھور کر میرے کان میں پھسپھسایا۔

"کیا تو نئے بادشاہ کا نام جانتا ہے؟" میں نے جواب دیا "ہاں۔۔۔ نصیرالدین حیدر" تو اس نے میرے دیئے ہوئے سکے کو غور سے دیکھا پھر طنز سے مسکرا کر بولا۔

"کیسا عجیب شوق ہے، بادشاہ خود کو پگھلا کر سکوں میں ڈھال دیتے ہیں" پھر اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے خود ہی کہا کہ میں کوئی اجنبی لگتا ہوں، میں نے اقرار میں گردن ہلائی اور بتایا کہ ذریعہ معاش کی تلاش میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور رات گزار کر ایک بڑے حاکم کے سامنے مجھے پیش ہونا ہے تاکہ ملازمت کی کوئی صورت نکلے، یہ سن کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے گردن ہلائی اور بڑبڑایا۔

"اگر تیری مراد دین سے متعلق ہوتی تو تجھے کسی مولوی سے ملواتا اور اگر تیری حاجت

سیاسی ہوتی تو کسی فرنگی سے ملواتا کہ سیاست فرنگی چلا رہے ہیں مگر تو ایک غریب الوطن ہے اس لئے تیری حاجت روائی تو صوفیوں کی دعاؤں سے ہوگی اس لئے حاکم سے ملنے سے پہلے جا اور ولی اللہ حضرت شاہ مینا کے مزار پر چادر چڑھا کر فاتحہ پڑھ خدا نے چاہا تو نامراد نہیں لوٹے گا۔"

فقیر اتنا کہہ کر بازار کے مجمع میں کہیں غائب ہوگیا کہ اسی وقت ایک پھرتیلے بدن کا خواجہ سرا کہیں سے نکل کر میرے سر پر سوار ہوگیا، غالباً وہ خفیہ محکمے کا کوئی جاسوس رہا ہوگا کیونکہ اس نے سختی کے ساتھ مجھ سے یہ جاننا چاہا کہ فقیر مجھ سے کیا باتیں کررہا تھا میں نے بھی جو باتیں ہوئی تھیں بتادیں اور اس سے ولی اللہ کے مزار شریف کا پتہ بھی پوچھ لیا۔ ولی اللہ کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں مریدانہ عقیدت کی چمک روشن ہوئی مگر جلد ہی بجھ گئی وہ ادھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ تو ادھر کے حالات سے شائد واقف نہیں ہے، تعلیمات اہلِ بیت کے عروج کے سبب یہاں کچھ عرصے سے ایک خاموش تبلیغی جہاد چھڑا ہوا ہے۔ جس کی رو سے تصوف، عرس، قوالی، قبر پرستی، بھنگ کے چبوترے، شیخ سدّو کا بکرا وغیرہ سب اس کی زد میں آچکے ہیں اس لئے ہوشیاری سے کام لے یہ کہکر اس نے شاہ مینا کے مزار کا پتا بتایا اور چلا گیا۔

مزار پر چادر چڑھا کر اور امداد حسین کی سرائے میں جیسے تیسے رات گزار کر جب میں نے راجہ بختاور سنگھ کے دربار میں نذر گزاری اور حاضری دی تو میرے دل و دماغ کو ایسا لگا جیسے کوئی غیبی طاقت میری مدد کررہی ہے کیونکہ راجہ نے مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر اور ایک دو باتیں معلوم کر کے ایک غلام کے ساتھ محل کی داہنی جانب جدھر ایک باؤلی سے ملحق کنگورے دار محرابوں کی چھوٹی سی عمارت تھی مجھے بھیج دیا۔ وہ حضرت غالب جنگ کا ذاتی اور قدیمی کتب خانہ تھا۔ وہاں میری ملاقات کتب خانے کے ایک بزرگ منتظم منشی شباہت علی اصفہانی سے ہوئی جنھوں نے بتایا کہ وہ حج بیت اللہ جانے کا قصد کر چکے ہیں۔ انھوں نے ہی مجھے بتایا کہ اس عمارت میں ہی ایک رہائشی گوشہ بھی ہے۔ جس میں قیام کر کے اگلے چار ماہ کے عرصہ کے اندر مجھے ان بزرگ کی نگرانی میں کتب خانے کی ترتیب اور تنظیم کے کام کو پوری طرح سمجھ لینا ہے تا کہ اسکی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھال سکوں، تربیت کے دوران مجھے مبلغ پندرہ روپئے اور بعد میں بیس روپیہ مشاہرہ دیا جائے گا۔ یہ سن کر ابھی میں شکر الٰہی میں مصروف ہی تھا کہ مجھے خدا کی وہ بندی یاد آئی جس کی توجہ

خاص نے مجھے وہ دن دکھایا تھا۔ دل نے کہا اگر اسکے حضور میں جا کر فوراً ہی اظہار تشکر نہ کیا تو یہ بڑا گناہ ہوگا اس لئے میں پہلی ہی فرصت میں سرائے کی بالائی منزل پر نظیرن کی اس ڈیوڑھی پر پہنچ گیا جس کا پتہ میرے دل پر لکھا تھا اور جس کی کنڈی کھٹکھٹانے کے لئے اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا جب میں سرائے میں قیام کے لئے داخل ہوا تھا۔

نظیرن کو جب معلوم ہوا کہ مجھے کتب خانہ کا کام مل گیا ہے اور میں لکھنؤ میں ہی رہونگا تو وہ سجدے میں گر پڑی پھر اس کی میزبانی اور التفات میں جو گرمی سلیقہ اور التزام تھا اور چاہت میں ڈوبی ہوئی دلبری اور دلنوازی کے ساتھ احتیاط کی جو وضع تھی اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہاں اپنی آؤ بھگت دیکھ کر اور اس ماہ پارہ کے حسن میں نہا کر لگاوٹ کی باتوں کے نشے میں بے خود ہو کر اس قتالہ کی صحبتوں کا لطف اُٹھانے کا چسکا پھر تو مجھ میں روز بہ روز بڑھتا ہی چلا گیا۔

پھر تو جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میرا غریب دل دن سے ہی شام ہونے کے انتظار میں بیقرار رہنے لگتا جسکے سبب میں کام سے گھبراتا، الماریوں میں رکھی کتابیں اسکے اعداد و شمار ان کے نام سب مجھے جیسے منہ چڑھانے لگتے۔ اس بے لطفی کا اثر جب میری کارکردگی پر پڑنے لگا تو ایک دن مجھے ایسی تنبیہ کی گئی کہ میں ڈر گیا اور اپنے دل کی اس کیفیت کا ذکر میں نے نظیرن سے کیا جس کے سحر میں گرفتار ہو کر میری وہ حالت ہوئی تھی۔ جب اخلاق اور محبت کی اس مورت نے میری پریشانی کا حال سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس وقت اس باوفا اور نیک سیرت نے یہ کہکر تو میری آنکھیں ہی کھول دیں کہ اگر مجھے انسان بننا ہے تو پھر عشق میں اندھے ہو جانے اور ہوش کھو دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ میرا عشق نظیرن سے ہے اور نظیرن ایک عورت سے زیادہ کچھ نہیں اور عورت دنیا کی سب سے ارزاں چیز ہے اور کسی بھی نام سے کبھی بھی حاصل کی جاسکتی ہے مثلاً شادی کی رسم کے ساتھ اسے زوجہ کے نام سے دان میں پایا جاسکتا ہے۔ لڑائی میں وہ مالِ غنیمت کے نام سے جیتی جاسکتی ہے اور کسی کام کے بدلے میں رشوت کے نام سے حاصل کی جاسکتی ہے اور عیش و طرب کے لئے رنڈی کے نام سے وہ ہمیشہ سے ہی موجود ہے لہٰذا اس ارزاں نشے کی طلب میں مجھے ان بڑے کاموں کی طرف بے توجہی نہیں کرنا ہے جن کے لئے میں نے اپنا وطن چھوڑا ہے اور جن سے مردوں کی دنیا کو وقار حاصل ہے۔

آخر کار میں نے ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اپنے کام میں دل لگانا شروع کر دیا۔ حضرت غالب جنگ کے کتب خانے سے منسلک ہونے کے سبب طبقہ اشرافیہ کے لوگوں میں بھی میری پہنچ ہو گئی تھی اتنا ہی نہیں بلکہ شاہی محلوں میں چپکے چپکے چل رہے سیاسی دنگلوں اور اقتدار کی سازشوں کی بھنک بھی مجھے کبھی کبھی مل جایا کرتی تھی، کتب خانے کی عمارت میں کبھی کبھی حکومت کے عمائد کی خفیہ ملاقاتیں ہوتیں جہاں روشن الدولہ وزیر کے خلاف جنھیں راجہ بختاور سنگھ کا در پردہ دشمن سمجھا جاتا تھا طرح طرح کے منصوبے تیار ہوتے، میرے آقا کی جانب سے مجھے سخت ہدایت تھی کہ اگر مجھے زندگی عزیز ہے تو جو کچھ بھی میں ان دیواروں کے درمیان آنکھوں سے دیکھوں اور کانوں سے سنوں اسکو دوسرے ہی لمحے بھلا دوں انھیں حالات میں میری خوش قسمتی یہ ہوئی کہ شفاء الدولہ کے حضور میں علم طب کے حصول کی اجازت مل گئی۔

لیکن ابھی میں نے حکمت کے رموز کی پہلی گرہ بھی نہ کھولی تھی کہ میرے ٹھکانے پر میرے ماں باپ کے ساتھ اچانک بڑی خانم آدھمکیں، باپ تو ایک آدھ دن ٹھہر کر واپس چلا گیا لیکن بڑی خانم نے مجھے چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا تب مجھے یاد آیا کہ گھر سے نکلتے وقت بڑی خانم نے مجھ سے کوئی قول لیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خالہ کے چہرے پر اتنے دنوں میں ہی وہ تازگی نہ رہ گئی تھی جو میں چھوڑ کر آیا تھا آنکھوں میں اداسیوں کے سائے اور گہرے ہو گئے تھے، دل پر ایک بوجھ سا بڑھ گیا، سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں اس لئے ایک رات موقع نکال کر میں نظیرن کے پاس پہنچ گیا۔ رات کا وہ ایک پہر جو اس گھڑی میں نے اس کی قربت میں گزارا اس کا نشہ کئی دنوں مجھ پر طاری رہا ایک گھڑی رات کی مہمانی میں ہی جوانی سے لبریز چاندی جیسے بدن والی اس عورت نے پہلی بار میرے دل کے ارمان یوں نکالے کہ وصل نہ ہوتے ہوئے بھی وصل کی لذت سے مجھے شرابور کر کے رکھ دیا اور جب میں نے خالہ کی روداد غم اس کو سنا کر مشورہ مانگا تو اس نے مجھے راہ دکھائی کہ راجہ صاحب کے معتمدِ خاص کی بیوی بادشاہ کی ملکہ حضرت قدسیہ سلطان کے ساتھ بچپن میں کھیلی ہوئی ہیں اور انھیں بے حد عزیز رکھتی ہیں لہٰذا اس معاملے میں انھیں کی مدد حاصل کرنا چاہئے۔ مشورہ نیک تھا اس لئے ایک دن موقع دیکھ کر میں نے معتمدِ خاص کے سامنے خالہ کی دادرسی کی درخواست گزاری تو اس فرشتہ صفت انسان نے

ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ صلاح دی کہ اگرچہ معاملہ دشوار نہیں ہے تاہم فی الحال توقف کیا جائے کیونکہ نئی روایت کے مطابق ہر سال بادشاہ کی تاجپوشی کی تجدید انگریز حکام کرتے ہیں اور ریزیڈنٹ بادشاہ کو اپنے ہاتھوں سے تاج پہناتا ہے لہٰذا تاج پوشی کی وہ رسم عنقریب ہونے کو ہے اور دلکشا کوٹھی کے پاس ہی دن رات بادشاہ کی نیلے ویلوٹ کی اس عبا کی سلائی ایک انگریز مصاحب کی نگرانی میں جس پر چار ہزار تولے وزن کا سونا استعمال ہو رہا ہے کی جا رہی ہے۔ معتمدِ خاص نے وعدہ کیا کہ تاجپوشی کی تقریب کے بعد وہ میری خالہ کو ملکہ عالیہ کا نیاز حاصل کرانے کا انتظام ضرور کرادیں گے۔ یہ سن کر میں نے اپنے تجسس کی تسکین کے لئے جاننا چاہا کہ آخر انگریز ہر سال بادشاہ کی تاجپوشی کیوں کرنے لگے ہیں تو وہ منصب اعلیٰ پر فائز فرد کی حیثیت سے جسکے سینہ پر لارڈ کلائیو کے زمانے سے شروع ہونے والی اودھ کی تاریخ نقش تھی ایک زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''ہر سال تاجپوشی اس لئے ہوتی ہے کہ بادشاہ یہ بھول نہ جائے کہ اس کے سر پر کمپنی کا ایک ریزیڈنٹ سوار ہے لیکن بادشاہ تو ہر حال میں بادشاہ ہی ہوتا ہے وہ اس رسم کے سیاسی مضمرات سے چشم پوشی کر کے ہزاروں تولے سونے سے لدی پوشاک پہن کر اور شراب کے ساغر میں اپنے خون کا گھونٹ ملا کر پی جاتا ہے اور خوش ہو لیتا ہے۔''

جب میں نے یہ دیکھا کہ خدا نے شائد میری بدنصیب خالہ کے دن پھیر دینے کا ایک وسیلہ مجھے فراہم کر دیا ہے تو میں نے بہرام خاں سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ میں حضرت غالب جنگ کی ڈیوڑھی کے خادم کی حیثیت سے لکھنؤ میں ہوں اور کتب خانے کا نگراں مقرر ہو گیا ہوں اور ان دنوں بڑی خانم بھی میرے پاس ہی ہیں تو وہ خوش ہوئے اور یوسف کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ مگر بہرام خاں کی ظاہری حالت کافی بدل چکی تھی، ماتھے پر گہری لکیریں پڑ گئی تھیں، گالوں میں گڑھے صاف نمایاں تھے، مضبوط کندھوں کے کساؤ میں بھی اب پہلی جیسی بات نظر نہ آتی تھی اور چال بھی ڈھیلے پن کی چغلی کھانے لگی تھی بہر حال میں نے انھیں آگاہ کر دیا کہ بڑی خانم کی خواہش ہے کہ ان کے شوہر کو اس کے کام اور پیشے سے سبکدوش کرانے کا جتن کیا جائے اور اس کام کے لئے اعلیٰ حضرت تک سفارش پہنچانے کی راہ بھی نکل آئی ہے اس لئے میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے خالو کی بھی رضامندی لینا چاہتا ہوں کہ ایسا نہ

ہو کہ مدعی سست ہو اور گواہ چست تو یہ سن کر بہرام خاں دیر تک کچھ نہ بولے ان کا دمکتا ہوا وہ رعب دار چہرہ جیسے دھواں دھواں ہو رہا تھا، اعضاء میں ایسی سستی تھی جیسے وہ افیون کھانے لگے ہوں جب ان کی کاہلانہ خاموشی ٹوٹی تو آنکھیں ملائے بغیر گردن جھکا لی دھیرے سے بولے'' نقلی بادشاہ کے پالے ہوئے جانور بھی نقلی ہو جاتے ہیں۔اب شیر پہلے جیسے شیر نہیں رہ گئے ہیں ''

ان کی آواز میں ایسا درد تھا کہ میں منہ کھولے انھیں دیکھتا رہ گیا ان کی آنکھیں آبدیدہ تھیں آنکھوں کی اس نمی کو چھپائے بغیر انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

'' کیا تم نے رمنہ میں درخت کے تنے سے زنجیر میں بندھے کسی گینڈے کو دیکھا ہے؟''

میں نے انھیں بتایا کہ پچھلی مرتبہ شکارگاہ پر انھیں کے ساتھ ایک بار درخت سے بندھا ایک گینڈا دیکھا تھا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے۔

'' گینڈا بیچارہ پیڑ کے گرد اتنے ہی چکر کاٹ سکتا ہے جتنی دور اسکی زنجیر اسے اجازت دیتی ہے۔ پھر انھوں نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری اور کہا'' ہمارے اعلیٰ حضرت کی حالت بھی درخت میں زنجیر سے بندھے گینڈے جیسی ہی ہے۔''

اُن باتوں کے درمیان کئی بار میرے جی میں آئی کہ خالو سے بڑی خانم کی سوت کے بارے میں پوچھوں لیکن میری ہمت نہ ہوئی مگر جب یوسف میرے ساتھ چل کر اپنی ماں سے ملنے آنے لگا تو راستے میں اس نے بتایا کہ اس کے باپ اور چھوٹی ماں کے درمیان آئے دن سخت لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے اور چھوٹی ماں کبھی کبھی چیتے کا کٹھرا کھول کر اس میں گھس جانے کی دھمکی دیتی تھیں یا پھر مائکے جا کر بیٹھ جایا کرتی تھیں اور اگر یوسف چھوٹی ماں کی خیر خبر لینے جانے کے لئے باپ سے کہتا تو بہرام خاں اسے یہ کہکر منع کر دیتے کہ اُس عورت نے اپنے سارے انتظامات کر لئے ہیں کیونکہ مخدوش عمارت کے نیچے کوئی بھی سر نہیں چھپانا چاہتا۔

انھیں دنوں ایسا ہوا کہ کتب خانے کے بزرگ نگراں منشی شباہت علی اصفہانی کے حج پر جانے کی تاریخ آ گئی اور اپنی والدہ کے اصرار پر میں نے انھیں کھانے پر بلایا اور اسی کے ساتھ اپنے خالو کی بھی اذن دیا کیونکہ ان کی بیوی کے آنے کے بعد سے وہ بھی ابھی تک میری قیام گاہ

پر صرف ایک ہی بار کچھ دیر کے لئے آئے تھے۔ منشی شباہت علی اصفہانی ایک صوفی منش، سادہ دل اور سادہ مزاج انسان تھے، دستر خوان پر بیٹھ تو گئے مگر دو لقمے کھانے کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور ان پر گریہ کا عالم طاری ہوگیا اسی حالتِ گریہ میں انھوں نے ہمیں بتایا کہ خدا سے ان کی دعا ہے کہ روضۂ اقدس کی زیارت کے بعد وطن واپس نہ آئیں اور وہیں مرجائیں کیونکہ ان کی بوڑھی آنکھوں نے یہ دن بھی دیکھ لیا کہ اودھ کی عدالتوں کو ظالم سے ظالم فرنگی حاکم پر ہمیں مقدمہ چلانے کا اختیار نہیں رہ گیا ہے اور فرنگی قزاقوں کی بدعنوانیوں کے مقدموں کی سنوائی صرف ولایت کی ہی عدالت میں ہی ہوسکتی ہے جس کا خرچ عام آدمی تو دور رہا ساہوکاروں کے بس کی بھی بات نہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کمپنی کے کسی بدکردار افسر نے کتب خانے میں کسی انگریز ریزیڈنٹ کی تصویر برائے نمائش بھیجی تھی جسے لینے سے انھوں نے انکار کردیا تھا اور جس کی پاداش میں انگریز حاکم نے ان کے آقا کی آنکھوں کے سامنے ہی ان سے بدسلوکی اور بدکلامی کی تھی جس پر مقدمہ ٹھونکنے کے بجائے آقا نے بھی اس لئے چشم پوشی کرلی کہ ولایت کے منصفوں کی بھاری تنخواہیں سرکاری خزانے سے نہیں مقدمہ کرنے والے فریقین سے وصولی جاتی تھیں۔

منشی شباہت علی کے رخصت ہونے کے بعد اپنے دل میں طے شدہ منصوبے کے مطابق میں نے کسی بہانے سے کچھ دیر کے لئے بہرام خاں کو گھر میں اکیلا چھوڑ دیا لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ تنہائی کے اس وقفے میں میاں بیوی کے درمیان کوئی بات چیت بھی ہوئی یا نہیں البتہ بہرام خاں کے رخصت ہونے کے بعد بڑی خانم پر اداسی کا دورہ سا ضرور پڑ گیا تھا جب میں نے خالہ سے ان کی اداسی کا سبب جاننا چاہا تو انھوں نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

''بیٹا جوانی میں مرد ہو یا عورت اپنا وقت جیسے تیسے کاٹ لیتا ہے لیکن بڑھاپا اکیلے نہیں کٹتا، اس عمر میں تیرا خالو اکیلا رہا تو کل کا مرتا آج مرجائے گا''۔ یہ سن کر اتنا تو بہر حال میں سمجھ ہی گیا کہ برف کا وہ پہاڑ جو میاں بیوی کے درمیان کھڑا تھا دونوں طرف سے ہی پگھلا ضرور تھا۔

خدا خدا کر کے آخر وہ دن آ گیا جب بڑی خانم کی قسمت نے یاوری کی اور انھیں راجہ صاحب کے معتمدِ خاص کی زوجہ کی عنایت سے حضرت قدسیہ سلطان کی خدمت میں نذر

گزارنے کا موقع ملا اور بڑی خانم نے ملکۂ عالیہ پر اپنے آنسوؤں کے گوہر آبدار لُٹالُٹا کر اپنی روداد بیان کر ڈالی۔ مشہور تھا کہ الھڑ پن کے زمانے میں ملکۂ عالیہ اُن محلوں میں بسم اللہ بانو کے نام سے جانی جاتی تھیں اور حضرت کی پیش خدمتوں میں آبدارنی کی خدمت پر مقرر تھیں قسمت نے عروج پایا تو بادشاہ کی منظورِ نظر بن کر قدسیہ سلطان کا خطاب ملا۔ نیک دل ایسی کہ قدسیہ محل کا لقب پا کر بھی زمانۂ عسرت کے دن انھیں یاد رہے۔ خدا نے ایسا دردمند دل دیا کہ ایک بار محل کے آنگن میں ایک لاکھ روپے کے نقرئی سکّوں کے ڈھیر کو اپنے ایک پیر کے انگوٹھے سے چھو کر سارا ڈھیر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کروا دیا۔ ملکہ نے جب بڑی خانم کی رودادِ غم سنی اور شاہی رمنہ سے انکے شوہر کی سبکدوشی کی درخواست جانی تو رمنہ کے نام پر ہی ناگواری کے کسی پوشیدہ جذبے کا ہلکا سا رنگ ملکۂ عالیہ کے میدہ اور شہاب جیسے چہرے پر دوڑ گیا، انھوں نے ہمہ تن چوکنا استاد خواجہ سرا کو جو انکے جنبش ابرو کا منتظر تھا دیکھا، دونوں کی آنکھیں ملیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کس نے کیا کہا اور کس نے کیا سنا یہ تو خالہ نہ جان سکیں لیکن ان کے بیان کے مطابق ملکہ نے اس وقت ایک گہری ٹھنڈی سانس لی تھی اور دھیرے سے بولی تھیں۔

''ہمارا بس چلے تو موئے رمنہ میں ہی آگ لگا دیں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اس لونڈی کی طرف منھ پھیر لیا جو اسی وقت چھوٹے سے ایک پنجرے میں خرگوش کا ایک خوبصورت جوڑا لئے بھاگی ہوئی آئی تھی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا، وہ خادمہ جو خالہ کو محل کے اندر لیکر آئی تھی اس نے خالہ کو ریشمی کپڑے کی گوٹ لگی ایک رنگین تھیلی تھما دی اور بتایا کہ وہ سرکار کی جانب سے انکا زادِ راہ ہے پھر ہاتھ کی جنبش سے محل سے واپس ہونے کا اشارہ بھی کیا خالہ نے حضور عالیہ کو جن کی پیٹھ اب بڑی خانم کی طرف تھی جھک کر سلام کیا اور الٹے پیروں واپس ہوئیں۔

غالباً حضور عالیہ سے بڑی خانم کی ملاقات کے دوسرے یا تیسرے دن راجہ بختاور سنگھ کتب خانے میں اپنے بعض مصاحبوں کو لیکر فارسی کے چند نایاب رسائل کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لائے تھے جہاں ان کی آپسی گفتگو سے شاہی محل میں ہونے والا ایک واقعہ معلوم ہوا کہ ایک شب بادشاہ کے حضور میں کٹھ پتلیوں کا نیا تماشہ ہو رہا تھا جسے دیکھتے دیکھتے حضرت اس قدر چراغ پا ہو گئے کہ کٹھ پتلیاں نچانے والے کے سر کے بال مٹھی میں بھر کر نوچ ڈالے غیظ و

غضب کی حالت میں اس پر یہ کہکر چیخے کہ وہ ملعون ہمیشہ جھوٹے قصے دکھاتا ہے۔ ہمیشہ بادشاہ کی اپنے حریفوں پر فتح دکھاتا ہے جبکہ خود بادشاہ ہوتے ہوئے انکی فرہنگ میں فتح کا لفظ کہیں موجود نہیں۔ پھر حضرت پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی اس دیوانگی میں انھوں نے ساری کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں کاٹ ڈالیں اور چیختے رہے۔

"یہ حرامزادہ کٹھ پتلیوں کا بادشاہ ہمیشہ ہی کیسے فتح پاتا ہے۔ پھر تو وہ ایک بار بھی نہیں ہارتا کی رٹ لگاتے جاتے تھے اور جلتے ہوئے فانوسوں کو تماشا گاہ کی چاندنی کے فرش پر لڑھکاتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فرش نے آگ پکڑ لی، تماشا گاہ سے شعلے اُٹھنے لگے اور حضرت بدمستی اور بے خبری کی حالت میں خواب گاہ کی چوکھٹ تک پہنچتے پہنچتے گر گئے۔

شاہی محل کی تماشا گاہ میں آگ زنی کی اس خبر کا بڑی خانم کے دل پر بہت اثر ہوا کیونکہ وہ قدسیہ محل کی خدمت میں اپنی فریاد درج کرانے کے بعد ان کے ٹھنڈے رویےّ سے کچھ ناامید ہوگئی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ محل میں ہوجانے والے اس حادثے نے سب کو ہی دم بہ خود کر دیا ہوگا انھیں اپنے معاملات کھٹائی میں پڑتے دکھائی دینے لگے لیکن بادشاہ کی غیر ضروری تفریحوں کو لیکر قدسیہ کے سینے میں جو کھولن مچی تھی اسکا انھیں اندازہ کیسے ہوسکتا تھا چند روز بعد ہی راجہ صاحب کے معتمدِ خاص کے زنان خانے سے ایک پالکی میرے گھر آئی جسکے کہاروں کے پیغام سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ نے بڑی خانم کو دولت خانے پر طلب کیا ہے۔ پیغام سن کر بڑی خانم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ گھبراہٹ میں آدھی اجلی آدھی میلی تیار ہوکر پالکی میں بیٹھ گئی۔ جب انھیں بیگم صاحبہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضور عالیہ نے بہرام خاں کی سبکدوشی کے احکامات اس شرط پر جاری کر دیئے ہیں کہ ان کی جگہ انکے لڑکے یوسف کو کام سنبھالنے کے لئے اگر کہا گیا تو وہ کوئی عذر نہیں پیش کرے گا۔ حالانکہ بڑی خانم نہیں چاہتی تھیں کہ انکی اولاد اپنے باپ کی طرح اس پیشے میں ملوث ہو مگر شوہر کی گلوخلاصی کی خبر سن کر انکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا وہ یہ سوچ کر سجدۂ شکر میں گر گئیں کہ خدا ان کے شوہر کو اس وقت انھیں واپس کر رہا ہے جب ان کا شوہر اس عورت کے ہاتھوں لٹ چکا ہے جس پر اس نے اپنی زندگی نچھاور کر رکھی تھی اور ایسی حالت میں واپس کر رہا ہے جب اسکے سارے کس بل نکل چکے ہیں اور گردن پشیمانی کے بوجھ سے

جھک چکی ہے۔ لیکن افسوس بڑی خانم کو یہ نہ معلوم تھا کہ انکی خوشیاں عارضی تھیں۔

جب میں بہرام خاں سے اس خبر کے آنے کے بعد انکے ٹھکانے پر جا کر ملا تو میں نے ان کو پہلے سے زیادہ ٹوٹا ہوا اور بجھا بجھا سا پایا، انکی ایسی حالت کیوں بڑھتی جا رہی تھی، کیا ان کی دوسری بیوی کی ہٹ دھرمی اور بے وفائی انھیں توڑتی جا رہی تھی یا پھر دھیرے دھیرے رمنہ کے محافظین میں ان کی جو ساکھ تھی وہ کم ہو چکی تھی کیونکہ ان کا پالا ہوا وہ خونخوار چیتا لڑائی میں جس کی فتح انھیں سرخرو کرتی تھی پچھلے ایک آدھ موقع پر ایسے مقابلے میں ہار چکا تھا جس میں بادشاہ کی عزت بھی داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ بہر حال جب میں نے اپنی کوششوں کے ذریعے انکی سبکدوشی کے احکامات کا ذکر کیا تو انھوں نے گہری فکرمندی کے ساتھ اندر ہی اندر اُٹھ رہے جس غبار کا انکشاف کیا اسکی کیفیت سن کر میرا بھی منھ لٹک گیا۔ قصہ یہ معلوم ہوا کہ شاہی حکم کے مطابق عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ ہمالہ کی ترائی کا ایک نیا چیتا جو اپنے ڈیل ڈول ہیبت اور قوت کے سبب بادشاہ کو بہت مرغوب تھا کسی دوسرے محافظ کی نگرانی سے چھین کر بہرام خاں کی تحویل میں یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ اس جانور کو اس طرح تیار کرے کہ کسی بھی غیر معمولی شیر سے مقابلے پر وہ فاتح ثابت ہو سکے۔ بہرام خاں کو خاص طور پر شاہی تاکید کی گئی تھی کہ ماہِ شوال کے دنوں میں دولت انگلشیہ سے اودھ آنے والے ایک بڑے فوجی حاکم کے سامنے شاہ کے اس چیتے کو شرط لگا کر لڑایا جائے گا۔ اور جب بہرام خاں نے مجھے یہ بتایا کہ شاہ کا وہ پیغام انھیں کسی اور نے نہیں بلکہ خود وزیرِ مملکت نے اپنے محل پر بلا کر دیا تھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پھر تو جو باتیں بہرام خاں نے مجھے بتائیں وہ حقیقت نہیں بلکہ خواب سی لگتی تھی اور جنھوں نے بہرام کی فکرمندی اور گہری اداسی پر پڑے ہوئے پردے کو بھی جیسے اُٹھا دیا تھا۔ وزیر نے پہلے بہرام کو ساری باتیں صیغۂ راز میں رکھنے کی قسم دلائی تھی اس کے بعد اس سے یوں گویا ہوا تھا۔

"تمہارے بادشاہ کے دل کے رمنہ میں زخموں سے چور ایک خونخوار درندہ ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے اس درندے کے جسم پر بادشاہ کے بزرگوں کی شکستوں کے کاری نشان ہیں جن سے کہیں آصف الدولہ تو کہیں وزیر علی کا خون بہہ رہا ہے یہ خونخوار درندہ بادشاہ کے ذریعے رمنہ میں پالے گئے درندوں کے جسم میں بار بار سرائت کر کے اپنے مقابل کو پھاڑ کھانا چاہتا ہے اس لئے درندوں

کے محافظوں اوران کی خوں ریز لڑائیوں پر دولتِ کثیر خرچ کر کے وہ اپنے دل کے زخمی درندے کی دہاڑ اورلڑائی میں حریف درندے پر فتح کی دل خراش گونج سارے لکھنؤ کو سنانا چاہتا ہے‘‘

پھر وزیر نے بہرام خاں کو آگاہ کیا کہ کسی بھی طرح ماہ شوال میں ہونے والی لڑائی میں بہرام کو اپنے چیتے کی فتح درج کرانی ہوگی اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو چپ چاپ اودھ چھوڑ کر چلا جائے بادشاہ کو خبر دے دی جائے گی کہ نمک حرام بہرام خاں محافظ خانے سے فرار ہوگیا ہے، بہرام خاں کو یہ بھی بتایا گیا کہ اگرچہ اس کو ملازمت سے سبکدوش کیئے جانے کی اجازت دی جا چکی ہے مگر اس کی تعمیل ماہ شوال میں ہونے والی لڑائی کے بعد ہی ہوگی۔

بہرام خاں کے اس انکشاف نے مجھے رات بھر کروٹیں بدلنے پر مجبور کردیا، کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی، خالہ کو تو میں نے اُن باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا البتہ ایک شام موقع نکال کر نظیرن کے پاس پہنچ گیا اور بہرام خاں کے مسائل میں اس کو اپنا ہمراز بنا کر اس کی رائے مانگی تو اس نے مجھے اور بھی مایوس کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ بعض عورتیں جب ذلیل ہوکر مائیکے بیٹھ رہتی ہیں تو شوہر کی کامیابیوں کی خواہاں نہیں رہ جاتیں پھر اب تک بہرام کی پہلی بیوی کے آجانے پر محافظ خانے میں یہ بھی مشہور ہو چکا ہوگا کہ بہرام اپنی پہلی بیوی سے میل جول بڑھا رہا ہے، اسکی سوت اپنے آگے سے اُٹھی ہوئی تھالی کو زمین میں ملتے تو دیکھ سکتی ہے مگر کسی ایسی عورت کے ہاتھوں شکست اُٹھا کر جسے وہ ازدواجی زندگی میں پہلے ہرا چکی ہو وہ تھالی اس نئی فاتح کو کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ زخمی شیرنی بنی ہوئی ایک عورت بہرام خاں کو ملیامیٹ تو کرسکتی ہے مگر یہ لڑائی اس کو کبھی جیتنے نہ دے گی۔ پھر نظیرن نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کے پیشے کے فرائض کی ادائیگی میں پہلی بات جو اسے سکھائی گئی وہ یہ تھی کہ اپنے دشمن کو پہچان میں رکھنا ضروری ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم سے کم ایک خیالی دشمن ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھے، یہی نصیحت اس نے مجھ سے بہرام کے لئے بھی کی اور تاکید کی کہ بہرام خاں کو چاہئے کہ وہ اپنی کمائی اور بیوی کو ساتھ لیکر محافظ خانے سے کلکتہ فرار ہو جائے جب میں نے ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے نظیرن کے مشورے پر خالو کو عمل کرنے کی صلاح دی تو اس نے یہ کہکر صاف انکار کردیا کہ اپنے نام پر نمک حرامی کا بدنما داغ لیکر مرنا کسی صورت بھی قبول نہ کرے گا۔

(۴)

اتنا لمبا زمانہ گزرنے کے بعد جبکہ نصیر الدین حیدر بھی پیوندِ خاک ہو چکے اور حضرت جان عالم بھی مٹیا برج سے عالمِ بالا کو سدھار چکے اس نامکمل داستانِ پارینہ کو دوبارہ پڑھنے کے عمل سے ہی جیسے دل پر اداسی چھا گئی ہے یہ بدقسمت پلندہ جتنا ضبطِ تحریر میں لے چکا ہے اس کے بعد چرخ کی گردش نے ان آنکھوں کو جو کچھ دکھایا اور کانوں کو سنایا ان کی بیان کی تاب و طاقت نہیں رہ گئی ہے اب مجھ میں پھر ان واقعات میں ملوث کردار جو اپنے حصے میں آئے جبر سے نبرد آزما تھے ان کی بے بسی کو دیکھ کر اگلے واقعات کو قلم بند کرنے سے دل بھی کھٹا ہو گیا تھا میرا۔ بہت سوچتا رہا مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں اس طرح قربان ہو گیا بہرام خاں جانوروں کے اس مقتل میں حضرت غالب جنگ نے بھی سالارِ ریاست کی حیثیت سے میری درخواست پر خالو کو بہت سمجھایا تھا کہ بادشاہ کو تاریخ کے آسیب نے بہت خوفزدہ کر دیا ہے اور ان حالات میں بہرام خاں کو چاہئے کہ وہ نیک نام بننے کے شوق میں زندگی کو یوں ضائع نہ کرے ان کا خیال تھا کہ اگر تاریخ غالب جنگ کو مار کر آگے بڑھنا چاہے تو ایسی لغو تاریخ کو آگے بڑھانے کے لئے وہ مرنا قبول نہ کریں گے، مرنا ہی ہے تو کوئی دوسرا مرے وہی کیوں مریں لیکن بہرام خاں نے ان کی ایک نہ سنی۔

انھیں دنوں کی بات ہے کہ بادشاہ کی ملکہ قدسیہ سلطان نے یہ دیکھ کر کہ بادشاہ اپنا قیمتی وقت جھیل پر پڑا چڑیوں کے شکار پر گزار رہا تھا اس سے عالمِ طیش میں صاف کہہ دیا کہ وہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ بہت بڑا قادر انداز ہے تو اس سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں، آگ بگولہ ہو کر اور سیدھے بادشاہ کی آنکھوں میں دیکھ کر غضب کی جرأت کے ساتھ قدسیہ نے کہا تھا:

''سب کی طرح تمہاری ملکہ تمہیں مغالطے میں نہیں رکھنا چاہتی، سچ یہ ہے کہ تم چڑیاں بھی نہیں مار سکتے، جس تام جھام کے ساتھ جھیل پر شکار کھیلتے ہو اس شکار میں تمہارے زرخرید غوطہ خوروں کے ہاتھوں جھیل سے نکالے گئے زخمی پرندے تمہارے نشانے اور تمہاری بندوق کے کارتوس سے زخمی نہیں ہوتے بلکہ رمنہ کے کارندوں کے ہاتھوں پہلے سے زخمی کر کے اور چھپا کر رکھ دیئے جاتے ہیں''۔ پیش خدمتوں کے بیان کے مطابق سننے میں آیا کہ اس رات

حضرت نے خوب شراب نوشی کی اور بار بار ایک انگریز مصاحب کو بتاتے رہے کہ ایک چینی کہاوت کے مطابق اگر تم کو کسی سے بدلہ لینے کی ضرورت پڑے تو پہلے دو قبریں کھود کر رکھ لو، پھر وہ طنز کے ساتھ بولے تھے "ہماری قبریں کھودنے کا کام تو انگریز کر ہی رہے ہیں پھر بادشاہ اس خرافات میں کیوں پڑے"۔ پھر وہ اسی وقت نشے کی حالت میں قدسیہ سلطان سے ملنے ان کی رہائش گاہ چلے گئے، خوابگاہ میں جگا کر انھیں یاد دلایا کہ بادشاہ نے ایک معمولی ملازمہ کی حیثیت سے اوپر اُٹھا کر ملکہ کے رتبہ کا انعام اس لئے عطا کیا تھا کہ ملکہ نے بادشاہ کے حصے میں آنے والی زندگی سے اس کو خوف زدہ ہونے سے روکا تھا اور جس شکل میں وہ زندگی تھی اسے ہنسی خوشی ساتھ لیکر چلتے رہنے کی تلقین کی تھی۔ بادشاہ نے اس لئے بسم اللہ بانو سے شادی نہیں کی تھی کہ جھوٹ سے بہلنے والے بادشاہ کے سامنے بسم اللہ اپنی حق گوئی کا مظاہرہ کرے۔ پھر انھوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں قدسیہ سے جو جملہ کہا تھا اس کے الفاظ یوں تھے "ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا بسم اللہ بانو، خون کے بہت سے گھونٹ پی کر ہم نے ملک گیری کی ایسی لڑائی سے بچنے کے گُر سیکھ لئے ہیں جسے جیتنے کی کوئی امید نہ ہو تو ہمیں ہیجڑا مشہور کر سکتی ہو"۔ سُنا ہے بادشاہ کی انہیں جلی کٹی باتوں کے سبب ایک دن قدسیہ کو خودکشی کرنی پڑی۔

آج جب یہ یاد آتا ہے کہ درندوں کی فضول سی لڑائی میں بہرام خاں کا تربیت یافتہ چیتا اپنے مدّمقابل کے سامنے لاکھ کوشش کے بعد بھی دُم دبا کر صرف دانت نکالتا رہا اور اپنے حریف پر ایک وار بھی نہ کر سکا تو اُن کہانیوں پر کچھ یقین سا ہونے لگتا ہے جن کے مطابق کہا جاتا تھا کہ وہ ایک سازش تھی جسکے پیچھے اس کی دوسری بیوی تھی کیونکہ اکثر رات کے آخری پہر اس چیتے کے کٹہرے کے آس پاس کسی عورت کا سایہ منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا جس کو دیکھ کر چیتا محبوبانہ انداز میں اپنا سر جھکا دیا کرتا تھا اور عورت کی ہتھیلی پر لگی کوئی چیز شوق سے چاٹا کرتا تھا۔ چیتے کی شکست فاش سے ہونے والی ہزیمت پر بادشاہ کو خفیہ طور پر کسی عورت کے ذریعہ یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ بہرام در پردہ حضرت خواجہ بختاور سنگھ کے آدمیوں سے مل گیا ہے اور درندے کو کوئی ایسی بوٹی چٹاتا رہتا ہے جس کے سبب اسکے اندر کی درندانہ جارحیت کی حس سلب ہوگئی تھی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حکومت کے داؤں پیچ کھیلنے والے پیٹھ پر مہلک وار

کرنے میں ایک ہی طرح کی رعونت، جوڑتوڑ اور جارحانہ حربہ استعمال کرتے ہیں اور ایسے سارے واقعات میں استعمال کی گئی حکمتِ عملی کبھی بھی بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔ کان کے کچے بادشاہ نے جس کو اپنے آس پاس منڈلاتے کسی میر وزیر کی وفاداری کا بھروسہ نہ رہ گیا تھا ایسی کہانیاں سنتے ہی پل بھر میں بہرام خاں کا مال اسباب قُرق کرواکے اُسے جیل میں ڈلوادیا تھا اور ایسی ایذائیں دلوائی تھیں کہ بہرام چند ہی روز میں تڑپ تڑپ کر مرگیا تھا اس وقت بڑی خانم کی سراسیمگی کی یہ کیفیت تھی کہ کئی ماہ اس کو یقین ہی نہ آیا کہ اس کا شوہر گرفتار ہوا اور پھر شاہی قید خانے میں مرگیا۔ وہ تو اسکی لاش دیکھ کر جس طرح گم سم تھی اس طرح مہینوں گم سم ہی رہی پہلے تو میں نے اس کو قصبے میں واپس بھیجنے کے لئے باپ سے مشورہ کیا جواب اکثر بیمار رہا کرتے تھے پھر جب بڑی خانم پر اس زمانے میں تپ دق کا حملہ ہوا تو علاج معالجے کے لئے میں نے انھیں اپنے پاس ہی رکھنا مناسب سمجھا۔ مگر افسوس خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس بڑھاپے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ نظیرن سے اپنے رشتے کو کس نظر سے دیکھوں، اس نے خود بھی کبھی لفظوں میں اسے بیان ہی نہیں کیا، وہ کہتی تھی کہ وہ ایک عورت تھی اور عورت کا کمزور ہونا سب سے بڑا گناہ تھا اور کسی بھی عورت کی خوبصورتی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ وہ کتنی طاقت ور ہے کیوں کہ طاقت ہی آدمی کو مسرّت اور سرخروئی دیتی ہے، بے فکری، مضبوطی اور آرام عطا کرتی ہے، وہ یہ بھی کہتی تھی کہ طاقت کو حاصل کرنے کے لئے اسے بے دردی کی حد تک لوگوں کے دل توڑنے پڑتے، اپنی ادؤں سے کبھی کسی کو مارنا تو کسی کو جلانا پڑتا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ طاقت کے حصول کے لئے جو کچھ وہ کرتی تھی وہ صحیح تھا یا غلط، نیک تھا یا بد، وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ وہ ایک خوبصورت اور جوان رقاصہ تھی اور اس کے چاہنے والے تھے اور وہ اپنی اقلیم کی شہزادی تھی اور اس کا شباب اس کی زیبائش اس کے عشوے اور ادائیں اس کے دربار کے سفیر تھے جن کو وہ بادشاہوں کی طرح بڑے امیروں اور سوداگروں سے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے استعمال کرتی تھی تاکہ طاقت کی جنس کا سودا کرسکے اور زندگی کے حالات کو اپنے موافق بنا سکے۔ وہ جتنی محبت مجھ سے کرتی تھی اتنی ہی بلکہ کبھی کبھی اس سے زیادہ بعض دیگر عاشقوں سے بھی کرتی تھی، اور جب وہ لکھنؤ چھوڑ کر کسی رئیس کے گھر جنوبی ہند جانے لگی تو مجھ سے لپٹ کر

اس قدر روئی کہ میرے کرتے کی آستین تر ہوگئی، جس امیر کی وہ رکھیل بنی اس کے موروثی قبرستان میں خاندان کی سخت مخالفت کے سبب اس کو جگہ نہ دی گئی ہاں اس کی دیوار سے چند گز باہر البتہ وہ غریب دفن ہے اور میں بدقسمت دفن ہونے کے انتظار میں ہوں۔

یہ بوڑھی آنکھیں کیسوں کیسوں کا عروج اور زوال دیکھ چکی ہیں جب ان کے واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین ہونے لگتا ہے کہ شائد ہم سب ہی اپنے اپنے سینوں میں ایک رمنہ آباد کر لیتے ہیں جن میں بڑے بڑے نازوں سے اپنی پسند کے درندوں کو پالتے ہیں اور انھیں فتح یاب دیکھنے کے لئے کچھ بھی قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میرا یہ یقین شائد اس وقت اور بھی پختہ ہوگیا جب میں نے بہرام کے مرنے کے کچھ برس بعد اسکے لڑکے یوسف کا واقعہ اسکے پڑوسیوں کے منھ سے سنا، یوسف اپنی ادھیڑ عمری کو پہنچتے پہنچتے حضرت جانِ عالم کے رمنۂ قیصر میں پورے استقلال کے ساتھ ایک شیر کا محافظ تھا، لوگ بتاتے تھے کہ اس کو اپنے پالے ہوئے جانور سے اس قدر محبت تھی کہ کبھی کبھی وہ شیر کو راتب دیکر اسکے کٹہرے کے اندر ہی کچھ دیر بیٹھ کر ایک جھپکی لے لیا کرتا تھا۔ غالباً! غدر سے چند مہینے پہلے کی بات ہے کیونکہ اتنا تو مجھے خوب یاد ہے کہ واجد علی شاہ سے اودھ لے لیا گیا تھا۔ شاہی عملہ اور وزارتیں بھی ختم کر دی گئی تھیں رمنۂ قیصر کی فضول خرچیاں دیکھ کر تو انگریز پہلے سے ہی خار کھائے بیٹھے تھے گورنر جنرل کی جانب سے چرند پرند اور درندوں وغیرہ کی نیلامی کے احکامات جیسے ہی جنرل اوٹرم کو دیئے گئے اس نے فوراً ہی شہر کے قصائیوں کو چپکے سے بلا لیا، سب سے پہلے پرندوں میں کبوتر جو لاکھوں کی تعداد میں تھے کوڑیوں کے مول ٹھکانے لگا دیئے گئے، وہ ہاتھی گھوڑے جو کبھی شاہی جلوس کی رونق ہوا کرتے تھے اور جنکی غذا پر ہی ہزاروں روپیہ یومیہ خرچ ہو جایا کرتا تھا، بے دام نیلام ہوئے۔ نواب مفتاح الدولہ نے دو سو پچاس روپئے فی گھوڑے در سے سیکڑوں گھوڑے خرید لئے اور چوگنے داموں کانپور میں فروخت کر کے منافع کمایا۔ برسوں سے ان جانوروں کی خدمت انجام دینے والے ملازم ایک پل میں کاروبار سے ہاتھ دھو کر تباہ حال ہو گئے۔ اُنھیں دنوں کی تو بات ہے جب یوسف سر پر خاک اُڑاتا ہوا میرے پاس آیا تھا اور میرے قدموں پر گر کر تین سو روپئے سے امداد کا سوال کیا تھا۔ میرے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شیروں کی نیلامی

ہونے والی ہے اور نیلام کرنے والا افسردہ شیر جس کا یوسف محافظ تھا چار سو روپے میں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پر راضی ہو گیا ہے میں نے یوسف کو بہت سمجھایا کہ آخر وہ اس شیر کا کیا کرے گا مگر یوسف دہاڑ دہاڑ کر روتا رہا اور کہتا رہا کہ اس نے اپنا بہت کچھ کھو کر اس شیر کو بچپن سے پالا ہے اور وہ ایک پل کو اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے آگاہ کیا کہ اتنے بڑے شیر کے لئے روزانہ راتب مہیا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوگا مگر اس نے میری ایک نہ سنی آخر کو اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے مطلوبہ رقم اسے دے دی۔

شیر تو یوسف نے حاصل کر لیا، کچھ دنوں جیسے تیسے اس کا پیٹ بھی بھرتا رہا لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب یوسف شیر کے لئے ایک مرغابی بھی میسر نہ کر سکا شیر بھوکا سو گیا۔ یوسف نے گھوڑے کے ایک بچے کو چرانے کی کوشش کی لوگ تاڑ گئے، یوسف پکڑا گیا لے دے کر خود کو چھڑایا شیر دوسرے دن بھی بھوکا رہا، یوسف سے بھی کچھ نہ کھایا گیا لیکن ایک کی بھوک دوسرے کی بھوک کب مٹا سکتی ہے۔ یوسف نے برتن بھاڑے بیچ کر ایک بکری خریدی اور شیر کے کٹہرے میں ڈال دی، دوسرے دن اپنی ڈھال اور تلوار بیچی اور شیر کی دوزخ بھرنے کی کوشش کی، پھر آس پاس کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا تھا ان کے کہنے کے مطابق یہ ہوا کہ رات میں پلنگ سے اُٹھ کر یوسف اپنے سر کے بال نوچنے لگا، کٹہرے میں بند بھوکے شیر کی دہاڑ آس پاس کی بستی والوں کا دل دہلا دیتی تھی، آخر کو فرنگی سپاہی کٹہرے کے چکر لگا کر کوتوال کو خبر دینے لگے۔ دوسری رات اس سے پہلے کہ شیر کے کٹہرے سمیت یوسف کو کھینچ کر کوتوال کے پاس لے جایا جاتا یوسف کو پہلے تو دانت کاٹی سردی سارے بدن میں لگی پھر بخار چڑھ آیا، تیز بخار میں جب اس کے بدن سے لؤ کے اُٹھنے لگے اور چہرہ لال ہو گیا تو سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ یکا یک ایک نوکیلا بلّم ہاتھ میں لیکر شیر کے کٹہرے کی کھڑکی کھول کر کٹہرے کے اندر چلا گیا اور شیر کے سامنے بلّم دکھا دکھا کر اسے للکارنے لگا، اس وقت یوسف کا بدن چیتے ہی کی طرح پھرتیلا ہو گیا تھا، آنکھوں میں بھی وہی درندگی اتر آئی تھی، بھوکا شیر پہلے تو بھونچکا سا رہ گیا پھر یوسف کی غضب ناک للکار اور بلّم کی مار سے تلملانے لگا اور اپنے بدن کو سمیٹ سمیٹ کر کٹہرے کی دیوار میں سکڑتا چلا گیا لیکن یوسف کو جیسے بخار کی تپش میں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا وہ للکارتا ہوا آگے بڑھ کر شیر کے کلّے تک جا لگا اور بلّم کی نوک

سے مسلسل اسے چھیدنے لگا۔ یوسف اس حالت میں بس ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔
"تجھے قسم ہے مجھے کھالے"۔
"تجھے قسم ہے مجھے کھالے"۔

شیر اس غیر متوقعہ صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھا، ذرا سی دیر میں اس کی کھال میں جگہ جگہ چھید ہو گئے اور ان سے تازہ تازہ خون رسنے لگا۔ اب ہر نئے زخم کی ٹیس پر شیر کا غصہ دوبالا ہو جاتا اور وہ بے قابو ہو کر اپنے خوفناک جبڑے پھیلا دیتا اور اس کے ہلاکت خیز پنجوں سے دھاردار ناخن باہر نکل کر کچھ دیر ہوا میں مدافعت کے لئے اچھلتے رہتے ابھی یوسف شیر کے پنجے پر اپنا ہاتھ ڈال کر اس کی کلائی جکڑنے کے خیال سے بے سوچے سمجھے ہمک ہی رہا تھا کہ پیچھے ہٹنے کی جانہ پاکر اُس نے سر اُٹھایا اور یوسف کے چہرے کے اس قدر قریب ہو کر شدید غصے میں دہاڑا کہ اس کی موچھیں اور تیز بدبودار سانس یوسف کے گالوں سے ٹکرائی، یوسف تو جیسے ہوش کھو بیٹھا تھا، پاگل پن میں بلّم کو کٹہرے کے فرش پر ڈال دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کو سخت کر کے شیر کی آنکھوں کو ناخنوں سے نوچنا چاہا جس کی تکلیف سے شیر بلبلا گیا اور اس نے یوسف کے ایک ہاتھ کو چبا ڈالا، یوسف نے بلّم اُٹھانا چاہا مگر شیر یوسف کی گردن کو تب تک اپنے نوکیلے دانتوں کے شکنجے میں لے چکا تھا، اس کے دانت یوسف کے حلق میں اُتر گئے تھے تھوڑی دیر میں یوسف کا بخار میں تپتا ہوا بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ لوگوں نے لاکھ کوشش کی کہ یوسف کی لاش شیر کے کٹہرے سے نکال لیں لیکن شیر کسی کو بھی یوسف کا جسم چھونے نہیں دے رہا تھا۔ جو بھی کٹہرے کے قریب جاتا شیر اس پر غیظ و غضب سے غراتا۔ کٹہرے کے چاروں طرف آس پاس سے بھاگ کر آجانے والوں کی ایک بھیڑ لگ گئی تھی بھیڑ سے ایک پہلوان جیسے مولوی نے نکل کر کٹہرے تک جانے کی اس لئے ہمت کی کہ لاش کی بے حرمتی ہو رہی تھی لیکن جیسے ہی اس نے چاہا کہ لاش کے پیروں کو تھام کر گھسیٹ لے شیر ان کے ہاتھوں پر جھپٹ پڑا۔ ابھی لوگ دم بہ خود اس صورت حال کو دیکھ کر کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ایک کم سن سی لڑکی جس کے چہرے پر صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں مجمع سے نکل کر کٹہرے پر گئی، دھیرے سے کٹہرے کے دونوں پٹ پورے کھول دیئے اور

اکیلی جان یوسف کی بھاری لاش کو اس کی کمر تک کھینچ کر باہر لٹکایا لوگوں نے دیکھا کہ شیر کچھ نہ بولا چپ چاپ اپنی گردن اگلے پنجوں پر رکھ کر ہانپتا رہا۔ اس وقت شہر کوتوال بھی آ گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگوں نے بھیڑ سے نکل کر یوسف کی باہر لٹکی لاش کو کٹہرے سے پورا باہر نکالا اور قریب ہی فرش پر ڈال دیا، کوتوال پورے واقعے کی تفصیل جاننا چاہ رہا تھا جسے بتانے کے لئے پوری بھیڑ نے اسے گھیر لیا اس سراسیمگی میں کسی کو ہوش نہ رہا کہ وہ کم سن چادر پوش لڑکی کہاں چلی گئی۔ میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہ ظاہر یوسف نے شادی کر کے گھر نہ بسایا تھا۔ کوتوال کو جب تفصیلات معلوم ہوئیں تو اس نے خدا جانے کس مصلحت سے اپنا طمنچہ نکالا اور شیر کو کئی گولیاں مار کر ڈھیر کر دیا۔ سنا ہے وہ کوتوال کچھ عرصہ بعد جھاڑیوں میں چھپی کسی کم سن لڑکی کے چلائے ہوئے زہریلے تیر سے گھائل ہو کر مرا تھا۔ میں نے بہت بار یوسف کی سوتیلی ماں کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اخدا جانے اس کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین کچھ پتہ نہ چلا۔

بڑی خانم تپ دق کے مرض میں اس دردناک واقعہ سے کچھ برس پہلے ہی مر چکی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ آدھی ادھوری اس داستان میں جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے لکھ کر مکمل کر دوں مگر اب دل یہ بھی سوال کرتا ہے کہ آخر اس گئی گزری پرانی سرگزشت کا مصرف ہی کیا ہے اور اس عالمِ تنہائی میں جہاں مرتے دم کوئی منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہ ہوگا بھلا کون ایسی تحریر کو پڑھنے کے لئے رہ جائے گا جس میں گزرے ہوئے شاہوں اور غلاموں کے سینوں کی مخفی شکارگاہوں کے پالتو درندوں کی چیخوں اور دہاڑوں کی داستان ہے۔ آسمان کی گردش سے جب وقت کا نیا قافلہ اپنے نئے بادشاہوں کو لیکر آئے گا تو کیا وہ اپنے ساتھ اپنے نئے وزیر، مصاحب، محلات اور نئے رمنہ لیکر نہ آئیں گے اور ساتھ میں ان شکارگاہوں میں اپنے پالے ہوئے درندے بھی، کیا ہر عہد کا انسان اپنی تباہی اور بربادی کے لئے بڑی نازبرداریوں سے پالے ہوئے اپنے پُرتشدّد اور سفاک درندے اپنے ساتھ لیکر نہیں آتا؟ پھر بھلا کسی کو ان بوسیدہ کاغذوں میں کیا لُطف ملے گا۔ اس لئے اچھا تو یہ ہوگا کہ ان کاغذوں کو موسم سرما کے لئے اُٹھا رکھوں تا کہ انگیٹھی جلا کر بوڑھا بدن ہی سینک سکوں۔

☆☆☆